نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱ ـ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ ـ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہوتی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا

۳ ـ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیئے جاتے ہین

۴ ـ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ ـ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین ـ

۶ ـ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ ـ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ـ

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۱ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دیئے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے ـ جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

اردوئے معلی ۱۲ر
عود ہندی عمر
دیوان حبیبی ۱۴ر
مکمل دیوان عمر

مولانا نذیر احمد

حمائل مترجم ۱۰ر
الحقوق والفرائض ۱۴ر
نبات النعش ۹ر
مراۃ العروس ۱۰ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
موعظۂ حسنہ ۱۲ر
رویائے صادقہ ۱۲ر
ایامی ۱۲ر
فسانۂ مبتلا ۱۲ر
ابن الوقت ۱۲ر
مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول ۱۲ر
" دوم ۱۲ر
" سوم ۱۲ر
الفاروق ۲ر
سیرۃ النعمان عمر
الغزالی ۱۲ر
المامون ۱۲ر
سوانح مولانا روم ۲ر
سفرنامۂ مصر و شام ۲ر
علم الکلام ۲ر
الکلام ۲ر
رسائل شبلی ۱۲ر
مقالات شبلی عمر
شعر العجم جلد اول ۱۴ر
" دوم ۱۲ر
" سوم ۱۲ر
" چہارم ۱۴ر
" پنجم ۲ر
موازنۂ انیس و دبیر ۱۴ر
مضامین عالمگیر ۸ر
آغاز اسلام ۸ر
کلیات فارسی ۲ر
کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی

امیر اللغات ۲ر
صنمخانۂ عشق ۲ر
مراۃ الغیب ۱۲ر
محامد خاتم النبیین
ضیائے سخن
مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلیٰ طرز ناول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴ - ۱۱۰ جلد ۱۴ - شمارہ ۱

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صر ہندوستان کے باہر علاوہ محصول معہ ر

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | جولائی سنہ ۱۹۲۸ء | شمارہ ۱

ملاحظات

اس مہینہ کی اشاعت سے چودہویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جس وقت اپنی بے سروسامانی و کم مایگی اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جس نے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور نگار کو اس منزل تک پہونچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قابلیت کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ سچ ہے

ہر شیشہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

میں نگار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و مواقع کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوں کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کر رہ جائے تو ایک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

یہ ہمیں یک آرزو وابستہ ام تعمیر دل

بہرحال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم رکھتے ہوئے کہہ سکوں گا کہ

شگفتن گل امید را تماشہ کن

کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں ! ۔

بر تمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہر چند گمنام کا ہے لیکن ہے کام کا۔ جناب ذوقی کا فسانہ "عید کی چاندرات" فن کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حقیقیات نگاری کہتے ہیں۔ تجربات و جذبات کا دقیق تجزیہ اور بیان کا وہ اسلوب جو پڑھنے والے کے سامنے تمام کیفیات و مناظر کو پیش کر دے آسان کام نہیں، لیکن مجھے مسرت ہے کہ لکھنے والے نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ قدرتاً ممثل پیدا ہوئے ہیں۔

مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن پر جناب احسن لکھنوی کا مضمون نہایت کارآمد ہے۔ کاش زیادہ بسیط ہوتا۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندی ادب کے مطالعہ پر جناب راج بہادر صاحب ام اے کا مقالہ خوب ہے۔ یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور ادبی لٹریچر کا مطالعہ کرے جس طرح ایک ہندو کا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے لٹریچر کو دیکھے۔

سیاحت قمر اس مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئی جسکا مجھے افسوس ہے۔ آئندہ ماہ میں اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔

جناب مجنوں گورکھپوری کا فسانہ بہت دنوں کے بعد شائع ہو رہا ہے لیکن "درست آید" کا پورا مصداق ہے۔ مجنوں نے جس لطف و حُسن کے ساتھ ٹامس ہارڈی کے فلسفۂ "بندگی و بیچارگی" کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ حد درجہ وقت احساس و نزاکت تاثر بھی ثابت ہوتی ہے۔ یہ فسانہ ستمبر میں ختم ہوگا۔

باب الاستفسار میں معاد کے متعلق میں نے اپنے خیالات کسی نہ کسی طرح سمیٹ کر اس مرتبہ ختم کر دئے ہیں۔ اگر مولوی غلام ربانی عزیز کو اب بھی کچھ شبہات ہوں تو وہ خط و کتابت کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں۔

فلسفۂ مذہب میں اس مرتبہ بعض خیالات جناب سید مقبول احمد صاحب نے ایسے ظاہر کئے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے ارادہ ہے کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس پر ایک محاکمہ کروں۔

روش صدیقی کی نظم فردوس محبت بہت پاکیزہ و رنگین ہے۔ غزلوں میں حافظ غازیپوری کے اکثر اشعار اور بعض بعض جگہ آثر، ناطق اور باسط کی بھی خوب ہیں۔

عشرت حسین صاحب نقوی صاحبزادۂ سید جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم لکھنؤ نے ایک رسالہ کیمیا کے نام سے بڑی تقطیع پر یہاں سے جاری کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مضامین کے فراہمی اور ان کی ترتیب و تنوع میں کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ اسوقت ملک کو ایسے رسالوں کی جو ہمارے اندر صنعت، حرفت و تجارت کا ذوق پیدا کریں اور صحیح مشورہ دے سکیں سخت ضرورت ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ جناب جالب ایسے تجربہ کار صحافی کی نگرانی میں یہ رسالہ بہت مفید خدمت ملک کی انجام دیگا۔ منیجر رسالہ کیمیا لکھنؤ سے نمونہ طلب کیا جا سکتا ہے۔

نیاز

اور

ہیئت اجتماعی کے اصول اساسی

تمہید جو چیز انسان کو کر[illegible] کی اور تمام مخلوقات سے جدا و ممیز کرتی ہے وہ اس کا ضرورت سے زیادہ محتاج دیکس ہونا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ جو مخلوق اپنی فطرت و خلقت کے اعتبار سے اس درجہ ضعیف، اس قدر حقیر اور اس حد تک کمزور ہے اسی کو اشرف مخلوقات اور غایت تخلیق بتایا جاتا ہے!

یقیناً یہ نہایت عجیب بات ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ ایک طرف اس کی بیکسی و بیچارگی کا منظر تو یہ ہے کہ جس وقت وہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک ایسی لایعنی شے ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک حادثۂ طبعی دم زدن میں اسکو فنا کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں اتنی بھی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ادنیٰ سی حرکت اپنے تحفظ یا بقا کے لئے کر سکے بخلاف حیوانات و نباتات کے کہ شروع ہی سے ان کو اپنے بقا کے لئے اپنے اوپر اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ اور عطایائے قدرت سے فائدہ اٹھانے کی ان میں اہلیت ہوتی ہے۔

پھر اسی انسان کی قوت و جبروت کا دوسرا منظر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف وہی حیوانات، نباتات، جمادات جو ابتدا میں اس سے زیادہ مستقل و برتر نظر آتے تھے، اسکے زیر اقتدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام فضا میں اس کی حکومت نظر آتی ہے اور نوامیس فطرت سے وہ اس طرح کام لینے لگتا ہے گویا ابد و ازل کا وجود اسی سے عبارت ہے

بہرحال یہ مناظر اس قدر عام ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی طویل بیان کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کی۔ لیکن اس سے کیا درس اخلاق پیدا ہوتا ہے؟ یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

انسان کی تخلیقی بیچارگی اور ارتقائی عظمت کا تقابل ہم کو بتاتا ہے کہ گو وہ پیدا ہوتا ہے تنہا ہی، لیکن اس کی انفرادیت ایک بالکل ہی ناقابل توجہ چیز ہے جس کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کی خلقی کمزوری ہی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ محتاج ہے نظام تمدن کا، ہیئت اجتماعی کا۔ تعاون باہمی کا اور ہر اس بات کا جو ایک کو دو، دو کو چار اور چار کو آٹھ بناتی ہے۔ پھر ظاہر ہے ایک انسان انفرادی حیثیت سے جن خصوصیات کا مالک ہوگا، وہی خصوصیات ہیئت اجتماعی کو بھی حاصل ہونگی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "بچہ انسان کا باپ ہے اور ایک" انسان مستقل قوم ہے"۔ اگر ایک بچہ کی تربیت خراب ہو رہی ہے تو اسکے معنے ہیں کہ قوم کی ترکیب میں ایک داغدار و معیوب عنصر شامل کیا جا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف ایک فرد کی خرابی سے

م کو کسی وقت کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، کیونکہ کسی ایک فرد کی خرابی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک
یسا سلسلہ خرابیوں کا پیدا ہو جاتا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوتا اگر آپ نے کبھی تالاب کے پانی میں کنارے کی طرف ایک کنکری پھینکی
وگی تو معلوم ہوگا کہ اس سے لہریں پیدا ہو کر کس طرح انکا سلسلہ دوسرے ساحل تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی صرف ایک اینٹ کی
رابی سے ساری عمارت کا گر جانا بھی آپ نے سنا ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کا نقصان محدود ہو اور صرف ایک ہی شخص کو اس سے نقصان
ہو سکتا ہو۔ اسی طرح دنیا کا کوئی اچھا فعل ایسا نہیں ہے جس سے جماعت کی جماعت فائدہ نہ اٹھاتی ہو

چنگیز خاں ایک ہی شخص تھا لیکن اس کے نقصانات کے بارے دنیا چیخ اٹھی اور مسیح و محمد کا وجود بھی ایک ہی ـــــ تھا لیکن
نیا میں امن کا تخم انھیں کی وجہ سے بار آور ہوا۔ صرف ایک نیرو نے روما کی تباہی میں جتنا حصہ لیا کسی سے مخفی نہیں اور ایک ارکونی
ور ایک اڈیسن کی ذات نے جو راہیں ترقی کی انسان کے لئے کھولدیں، وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ بہرحال فرد کی اصلاح خاندان
ی اصلاح ہے۔ اور خاندان کی اصلاح قوم کی اصلاح ہے اور قوم کی اصلاح ملک کی فلاح ہے۔

جس طرح ایک درخت عبارت ہے تنہ، شاخ، پتی، پھول اور پھل سے اسی طرح ہیئت اجتماعی مرکب ہے مختلف افراد سے جنکی
ومت شاخ، پتی وغیرہ کی طرح بالکل علٰحدہ علٰحدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے ہر ایک شخص کی علٰحدہ علٰحدہ انفرادی حیثیت
ی ظاہر ہوتی ہے، اور من حیثیت المجموع اس کا تعلق بھی ہیئت اجتماعی سے ثابت ہوتا ہے بالغرض فرد اور جماعت کے درمیان
یسا مضبوط تعلق، اتنا شدید ارتباط ہے کہ علمی طریقہ سے ایک کا بغیر دوسرے کے پایا جانا ناممکن ہے۔ آدم کے لئے حوا کا پیدا کیا
انا حقیقتاً استعارہ ہے اس رمز کی طرف اور تعلیم ہے اسی تعاون و اجتماع کی۔

تعاون سے مراد کیا ہے؟ مختلف افراد انسانی میں اعمال کی تقسیم ہر عمل کے طریق کار کی تعیّن اور کسی غایت یا غرض مشترک
وجود جس کے حصول کے لئے افراد تعاون سے کام لیں۔

یہ دونوں اساسی اصول ایسے ہیں کہ نہ صرف جماعت انسانی بلکہ عالم حیوانی میں بھی ان کا وجود پایا جاتا ہے اور خود مختلف
ضاء حیوانی کی ساخت اس امر کی شاہد ہے کہ فطرت بھی انہیں اصول کی کاربند ہے۔ اور اسپر غور کرنے سے ہر شخص بہ آسانی سمجھ
کتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا تنہا مالک نہیں ہے بلکہ ساری قوم اُس کی مالک ہے اور اس طرح نہ اپنے نتیجۂ عقل و عمل سے وہ تنہا فائدہ
ٹھا سکتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر خودکشی کا اقدام قانونی جرم قرار دیا گیا اور اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے۔

انسان جو اس وقت تمام عالم پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اُس کا سبب سوائے قوت عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور اعمال ہی
ی تفریق سے مدارج انسانی متعین کئے جاتے ہیں۔ پھر جب ہم اسباب عمل پر غور کرتے ہیں تو اس کی محرک تین چیزیں نظر آتی ہیں
سب سے پہلی چیز تو اس کی طبعی و فطری قوت ہے جس میں بچہ، جوان، دیوانہ، عاقل، عالم و جاہل سب برابر کے شریک ہیں اس کو گویا
وٹر یا انجن سمجھنا چاہیے، دوسری چیز جلب منفعت ہے اور تیسری ادائے فرض۔ یہ دونوں اگر زیادہ وسعت نظر اور بلند خیالی

، ساتھ کام میں لائے جائیں تو تعاون کی وہی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں جو مقصود آفرینش ہے اور جو ایک قوم و ملک کی ترقی کی ضامن ہیں
اگر آج ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ صرف اپنی زندگی آرام سے بسر کرلیجائیں، تو اُس کو نہ صرف
دغرضی کہیں گے بلکہ غیر فطری بھی اور ایک انسان کا بہ حیثیت انسان ہونے کے سب سے زیادہ ذلیل جذبہ یہی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر
ہوتے ہیں جو تجرد کی اور راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا وجود قوم کے لئے مادۂ فاسد کا حکم رکھتا ہے جس کو جلد سے
بد نکل جانا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے ساتھ اپنے متعلقین یا بیوی بچوں کی راحت و آسائش کا خیال
تے ہیں۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ہر چند یہ قسم اول کے انسان سے بہتر ہیں، لیکن غایت آفرینش ان سے بھی پوری نہیں ہوسکتی ایسے
ں صرف اس حد تک کہ ان کے عایلہ کا تعلق ہے بہت اچھے، وسیع النظر، ایثار پسند ہوتے ہیں لیکن گھر کی چار دیواری سے باہر وہ
اری دنیا کے لئے خود غرض سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بلند مرتبہ والے انسان ہیں جو اپنی ذات، اپنی اغراض
اپنی قوم کی فلاح کے لئے نظر انداز کردیتے ہیں، اور ان کے ہر فعل و عمل کا نصب العین قوم کی خدمت ہوتی ہے۔ لیکن ایک درجہ
ں سے بھی بلند ہے اور یہ کہ قوم و ملک کی تخصیص بھی باقی نہ رہے اور تمام ابنا جنس بلکہ اس سے بھی زیادہ سارا عالم حیات پیش نظر
ہے۔ یہ مرتبہ سوائے انبیاء و رسل کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

بہر حال انسانی تفوق و برتری کے مدارج اس کے حسن ظاہری کے لحاظ سے قائم نہیں ہوتے بلکہ حسن فطرت کے اعتبار سے اُن کی
ین ہوتی ہے اور ایک صحیح تعلیم و تربیت کا مقصود یہی ہونا چاہئے۔

نٹشے کی یہ تعلیم کہ "قوی کمزور کو جذب کرلیتا ہے، فنا کردیتا ہے" ممکن ہے بہ لحاظ واقعات صحیح ہو، لیکن بہ لحاظ اخلاق نہایت
ناک قسم کی تعلیم ہے۔ یقیناً اس نے یہ نظریہ ڈارون کے اصول "تنازع للبقا" سے اخذ کیا ہے لیکن سخت غلط فہمی کے ساتھ۔
ر چیز اپنی بقا و قیام کے لئے کوشش کرتی ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، قوی و ضعیف کے تصادم میں اکثر و بیشتر ضعیف ہلاک ہوجاتا ہے
ہی درست ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قوی کو ضعیف کے ہلاک کردینے کا فطری حق حاصل ہو کیا وجہ ہے کہ قوی اپنے
عیف ابنا قوم کو سنبھالنے اور ہلاکت سے بچانے کی تدبیر نہ کرے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصول تعلیم و تربیت نہایت مستحکم و صحیح
ہوں، ہمارے ہاں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک مقصود تو تکمیل فنون ہوتا
ہے اور دوسرا صحت اخلاق اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان دونوں میں کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ان دونوں کا اجتماع
ہ اس میں مغرب بھی ہنوز کامیاب نہیں ہوا۔

بچہ کی تعلیم و تربیت کی اولین جگہ ماں کی گود ہے، یہ تمام اقوام عالم کا مسلمہ مسئلہ ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دنیا بچوں
کی تعلیم کا تو درس دیتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں جو بچہ کی اولین درسگاہ ہے۔

اس وقت تعلیمی مسئلہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے اور اسی کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔ بحالت
موجودہ جو مدارس یا کالج ان کے پائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط اصول پر قائم ہیں اور ان کی تعلیم بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو اچھی

ماں بننے کا اہل بنائے، سرے سے ماں ہی نہیں بنانا چاہتی، اس میں شک نہیں کہ ان مدارس میں لڑکیوں کو خوبصورت معاشرت کا درس ضرور دیا جاتا ہے اُن کو یقیناً وہ ادائیں بتا دی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے شباب میں ایک ساحرانہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی کے ساتھ اُن کو ظاہری نمود و آرائش کے بھی تمام طریقے سکھا دئے جاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کو ماں بننے سے کیا واسطہ ہے اور اخلاق کا تعلق اُن سے کس حد تک ہے۔

موجودہ تعلیم لڑکیوں کو خوشنما ضرور بناتی ہے، لیکن نہ خوشنما ہونا اچھا ہونا ہے اور نہ حسین بننا مفید بننا۔ پھر جب ہر حسین چیز مفید نہیں تو کلیہ قائم کرنے کی غرض سے اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ حسین وہی ہے جو اچھا اور مفید ہو۔

انگریزی تعلیم، لڑکیوں کے لئے ہر چند بُری نہ ہو، لیکن غیر ضروری یقیناً ہے کیونکہ جہاں تک درستی اخلاق کا تعلق ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ انگریزی تعلیم بڑی حد تک اخلاق سے بیگانہ بنا دیتی ہے

درستی اخلاق کا تعلق نہ قانون سے ہے اور نہ تخویف و ترہیب سے، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق صرف مذہبی روحانیت سے ہے اور انگریزی تعلیم سے مذہبیت کو جس قدر نقصان پہونچ رہا ہے ظاہر ہے۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کن اصول پر ہونی چاہئے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ مذہب نام کسی کتاب کا نہیں، بلکہ صرف افعال و اعمال کا ہے تو سب سے پہلے ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی استانیوں کا فراہم کرنا ہے جو اپنے اوقات و مشاغل کے لحاظ سے مذہب کی پابند ہوں اور کوئی حرج نہیں اگر وہ ایک حد تک آزاد خیال ہوں ہم کو ایسی استانیوں کی ضرورت نہیں جو ریشمی ملبوس میں ملفوف ہوں، زینت و آرائش کی تصویر ہوں، لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ نہایت درشت دکھائی دیں۔ ستھراپن، درصفائی نام نہ خوش ادائی کا ہے، نہ لباس کی اچھی تراش خراش کا اور نہ ٹیڑھی مانگ اور بانکے جوڑے کا، بلکہ اس سے مراد ہے وہ پاکیزگی نفس جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو پسندیدہ بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک نہایت معمولی سی بات کو لے لیجئے کہ وہ عورتیں جو نماز کی پابند ہیں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں اور یہ عادت ان میں چونکہ مذہبی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اس قدر مستحکم و پائدار ہوتی ہے کہ معمولی اصول معاشرت کے ذریعہ سے استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسی کے ساتھ جب ان کی رفتار و گفتار پر نظر جاتی ہے تو وہاں بھی روحانی خلوص نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کئے لیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ایک بچہ کے دل میں نقش کرنی چاہئے وہ خدا کا خوف اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و راحت کا جذبہ ہے اور یہی دو چیزیں اخلاقیات کی جان ہیں، لیکن کیا موجودہ انگریزی مدارس میں اس تعلیم کی توقع کی جاتی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں وہاں ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنے میں خدا کی طرف توجہ کیجاتی ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں اور مدارس کی تعلیم اس درجہ ناقص ہے تو سوائے اسکے کہ کوئی چارہ نہیں کہ لڑکیوں کو مدارس بھیجنے سے باز رکھا جائے اور خود گھر پر انکی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کے لئے جو نصاب میں نے تجویز کیا ہے وہ عام ارتقاء ذہنی کے لحاظ سے باوجود غیر انگریزی ہونے کے اسی حد تک مکمل ہے اور بہ لحاظ اخلاقی تعلیم کے تو خیر اس کو بلند ہونا ہی چاہئے کیونکہ اس کی بنیاد بالکل مذہب پر قائم کی گئی ہے۔

بنا بریں اسپر آئندہ تفصیل کیساتھ بحث کروں گا اور پھر اسکے بعد بتاؤنگا کہ لڑکیوں کی موجودہ تعلیم میں کیا کیا نقائص ہیں اور اُن کے مضر اثرات کے دور کرنیکی کیا تدبیر ہمکو اختیار کرنا چاہیے ”گمنام“

عید کی چاندرات

(افسانہ)

تانگہ نہایت تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور چمڑے کا چھوٹا بکس جسے اسٹیشن پر جلدی کی وجہ سے میں نے تانگہ کے اندر بے ڈھنگے پن سے الٹا سیدھا رکھوا دیا تھا، پاؤں کے قریب تانگہ کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں اور مکانات سرعت کے ساتھ پیچھے سرکتے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں بازار کی کسی چیز کو اچھی طرح نگاہیں جما کر دیکھوں۔ صرف ایک خیال، ایک نشہ میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی اور بھیڑ کے ساتھ سودے والوں کی پکار، دوکانداروں کی آوازیں، راہ گیروں کی صدائیں سبھی کچھ شامل تھا لیکن جس طرح ایک شرابی کو اپنی ترنگ میں گرد و پیش کی تمام چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح بازار کا تمام منظر میری نظروں میں ایک بے رنگ دھندلا سا خاکہ تھا جو جلد ہی جلدی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجمع کی چیخ پکار بھی میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور ہو جاتی تھی جیسے کچی نیند میں کوئی شخص بہت دور کی آوازیں سن رہا ہو۔ بازار کے اس بے معنی ملے جلے شور میں صرف تانگے والے کی "ہٹو بچو" البتہ صاف سنائی دیتی تھی ورنہ اس کے علاوہ مجمع کا تمام شور و غل میرے کانوں کے لئے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اسٹیشن سے مکان تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی اتنا البتہ یاد ہے کہ جب تانگہ ایک مقام پر جھٹکے کے ساتھ رک گیا تو میرے سامنے وہ گلی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ ایک جست کے ساتھ تانگہ سے کود پڑا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا لیا کمبل کو کاندھے پر ڈالا اور تانگے والے کو جلدی سے کرایہ دیتے ہوئے میں نے گلی کا رخ کیا۔

گلی کے موڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین چاروں طرف اپنی زرد مدھم روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں بے صبری کے لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ میری رفتار کے ساتھ گلی کی دیوار پر میرے قدم کا سایہ بڑا ہوتا جاتا تھا اور میں اپنے قدموں میں ایسی پستی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم کی رگوں میں پارہ بھر دیا ہو۔ گلی کے مکانوں میں بات چیت اور قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض کے دروازے بند تھے اور بعض کے ادھ کھلے دروازوں میں سے اندر کی روشنی نکل نکل کر گلی کی روشنی میں تحلیل ہو جاتی تھی آج اس محلے میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ دو منزلہ مکانوں کی کھڑکیاں عموماً کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے حقے کی گڑگڑاہٹ اور برتنوں کی کھڑ بڑ کی آوازوں میں شوخ و شریر بچوں کی چیخ پکار کی صدائیں آ رہی تھیں۔ آج رمضان کی آخری تاریخ تھی اور یہ تمام رونق و چہل پہل اس پُرمسرت مبارک دن کا پیش خیمہ تھی جو سال بھر کی طول طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتا ہے

محلے والوں کی یہ پُر انبساط مصروفیت اور بچوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں میرے لئے اس وقت خاص طور پر بہت پُرمعنی تھیں

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس گلی کی در و دیوار تک کو خبر ہے کہ میں آج کیوں اس قدر خوش ہوں۔ مجھے گرد و پیش کی تمام فضا اپنے مسرور خیالات میں غرق نظر آتی تھی۔ میرے دلی جذبات اس وقت کیا تھے؟ تفصیل بالکل فضول ہے، اور ممکن ہے تفصیل سے اُن کی لطافت بھی ضائع ہو جائے۔ بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ میری رگ رگ میں مسرت و شادمانی کا وہ نقشہ چھایا ہوا تھا جو ایک ہندوستانی نوجوان کو نئی نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں عید کرنے کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا امتحان قریب تھا اس لئے اپنی پڑھائی کا ہرج کرکے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر کرکے اس کے پاس پہنچنا کافی خطرناک جراءت تھی۔ لیکن وہم ہی کیا جس کے سرانجام میں خطرے سے مقابلہ نہ کرنا پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ محض نقصان ہی کے خیال نے اس ملاقات کی مسرتوں کو وہ لذت آفریں بنا رکھا تھا

خدا خدا کرکے یہ مسافت بھی طے ہوئی اور میرے خسر کا مکان آگیا۔ میں دبے پاؤں مردانہ مکان میں داخل ہوا اور سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے شیروانی کی جیب میں سے رومال نکالا۔ توقع کے خلاف آج دیوان خانہ میں بالکل سناٹا تھا میرا خیال تھا کہ جس وقت میں یہاں پہنچوں گا، حسب معمول میرے خسر صاحب گلو بند لپیٹے سیاہ کمانی کی عینک لگائے کمرے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہوں گے۔ وہ ایک بڑے گاؤ تکیہ سے سہارا دئے ہوئے ہوں گے، داہنی طرف ایک اونچا سا مرادآبادی اگال دان، بائیں طرف تازہ ہرے پانوں سے بھرا ہوا ایک منقش خاصدان رکھا ہوگا۔ قالین پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اُن کے ادھیڑ عمر کے دوست بیٹھے ہوں گے ایک کونے پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی چند پرانی مذہبی کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔ ہوا میں حقہ کی نفیس تمباکو کی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی ہوگی اور کھانس کھانس کر اپنے دوستوں سے کسی غیر دلچسپ موضوع پر باتیں کر رہے ہوں گے۔

لیکن یہاں کچھ بھی نہ تھا صدر کمرہ بند تھا۔ برآمدے کے درمیانی در میں لوہے کی سلاخ سے ڈبیز کی ایک لالٹین ٹنگی ہوئی تھی جس کی بتی نیچی تھی اور اس کی ہلکی کمزور روشنی نصف صحن تک پہنچ کر غائب ہو جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خیراتی کی کوٹھری میں بھی سناٹا تھا۔ اندر کے مکان سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی دیواروں پر ایک ناقابل بیان چپ مسلط تھی۔ البتہ باہر گلی میں کتوں کی مسلسل بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے سوچنا شروع کیا " یہ معاملہ کیا ہے؟ آج چاند رات ہے اور کل عید ہونے والی ہے۔ قاعدہ سے یہاں آج خوب چہل پہل ہونا چاہئے تھی۔ زنان خانہ سے بچوں کے لڑنے بھڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آنا چاہئے تھیں۔ ہر طرف نقل و حرکت، مشغولیت و مصروفیت کی علامات ہونا چاہئے تھے۔ مگر یہاں تو قیامت کا سناٹا ہے .... میں زنانہ مکان کی طرف بڑھا اور آواز دینے کیلئے کھنکھار کر گلا صاف کرنے لگا۔ اندر سے میرے خسر کے چھوٹے بچے کی رونے کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی انا کی لوری اور جھنجھنے کی جھنکار ایک لحمہ میں بچہ خاموش ہو گیا اور فضا میں پھر وہی اگلی سی ڈراؤنی خاموشی پھیل گئی میرا دل بیٹھنے لگا۔

میں نے بہت ہمت کرکے کمزور آواز میں خادمہ کو پکارا جسے سن کر اس کا نو سال کا لڑکا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہے سنے پھر مکان میں گھس گیا اب میری گھبراہٹ اور زیادہ بڑھنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری سانس سینے میں اڑ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر میں شاید اندر میرے آنے کی اطلاع کر کے وہ اچھلتا کودتا باہر آیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر اور کمبل کاندھے پر سے گھسیٹ کر خوش خوش اندر بھاگنے لگا۔ میں نے اس کے سوکھے ہوئے زرد رنگ کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید اس غیر معمولی سناٹے کی کوئی تاویل مجھے اس کے بشرے سے حاصل ہوسکے بظاہر میرے آنے کی اُسے خوشی تھی اس لئے کہ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب تک میں اس سے کوئی سوال کروں وہ "میاں اندر آئے" کہتا ہوا چھلاوے کی طرح دروازے میں غائب ہوگیا۔

میرے قدم بھاری ہورہے تھے اور دل میں ان تکلیف دہ خیالات کی بھیڑ تھی جو عموماً امید و بیم کی باہمی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں آرزوؤں کا ایک طوفان لے کر اس مکان میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں کی پراسرار خاموشی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کردیا۔ لڑکے کے مسکراتے ہوئے چہرے سے البتہ کچھ ڈھارس بندھی تھی لیکن اس کا اعتبار ہی کیا آخر بچہ ہی تو ہے۔ میں نے چپکے چپکے دل میں دعا مانگنا شروع کی کہ خدا کرے اس سناٹے کی وجہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو اور مجھے نا اُمیدی کا سامنا کرنا پڑے مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے اور ایک لمحہ میں جس میں میں نے بدقت مردانہ مکان کے صحن سے لے کر زنانخانہ کے چوکھٹ تک کا فاصلہ طے کیا میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تخیلی مناظر یکے بعد دیگرے گزر گئے ——— ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے زنانہ مکان کے سامنے والے دالان میں تخت کی صاف ستھری چاندنی پر دھانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے میری بیوی اپنی نازک لانبی انگلیوں سے پان بنا رہی ہے۔ دوسرے لمحہ مجھے نظر آیا کہ تمام زنانخانہ خالی پڑا ہوا ہے۔ ہر طرف سناٹے اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور مکان کے کونے کونے سے بے رونقی اور تنہائی کے آثار برس رہے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ نہیں یہ سب میری نگاہوں کا دھوکہ تھا۔ وہ کیا سامنے چبوترے پر میری خوشدامن کھڑی ہوئی کل کے انتظامات کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہیں داہنے طرف والے کمرہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کا چھریرا جسم خوبصورت لچکدار کمان کی طرح ایک بڑے سے ٹرنک پر جھکا ہوا ہے ——— اور وہ اس میں سے ایک ایک کر کے عید میں پہننے کے لئے کپڑے چھانٹ رہی ہے۔ زنانخانہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ ہیولا بھی خواب کی طرح دھندھلا ہوتے ہوتے آخر غائب ہوگیا اور میں گھبرائے ہوئے قدموں سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

صدر دالان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ انا بچے کو گود میں لئے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھی گھٹنا ہلا ہلا کر اُسے سلا رہی تھی۔ بازو والے دونوں کمروں میں اندھیرا پڑا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے صرف ایک بیچ والا کسیقدر کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں کھانا پکانے والی خادمہ چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں ابھی نصف صحن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کوٹھے پر سے میری خالہ کی آواز آئی۔ "میاں ادھر زینے پر چلے آؤ۔ اس طرف تمہارا سامان بھی یہیں منگوالیا ہے۔"

میں اپنا رُخ بدل کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ محنت کچھ زیادہ سخت نہ تھی لیکن اس وقت بدحواسی کی وجہ سے میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصہ ہانپ رہا تھا اور سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔ "دس بجے والی گاڑی سے آئے ہو؟" میری خالہ نے سر سے پیر تک مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں آج گاڑی کسیقدر

دیر کر کے آئی"...... میری بے صبری ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مکان کی خاموشی دیکھ دیکھ کر میرا دم الٹا جاتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سوال کیا "آج یہاں اس قدر سناٹا کیوں ہے۔ جیسے سارا گھر خالی پڑا ہوا ہو"۔

میری خالہ بولیں۔

"تمہارے خسر حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوشدامن کا جی نہیں اچھا ہے۔ تمام بدن میں درد ہے کچھ حرارت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیچاری اوڑھے لپیٹے نیچے کمرے میں پڑی ہیں۔ بچوں نے عید کی خوشی میں اس قدر ادھم مچا رکھا تھا۔ اس قدر آفت برپا کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ! تمام صحن میں کودتے پھرتے تھے چیخ پکار سے سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا۔ وہ تو جب میں خوب بکی جھکی اور ایک ایک کو پکڑ کر زبردستی لٹایا ہے تب کہیں کوئی دس منٹ ہوئے سب کے سب سوئے ہیں۔ تمہاری ساس کی ماندگی کا خیال تھا۔ نہیں تو اللہ رکھے بچوں ہی کی ذات سے تو چاند رات میں چہل پہل رہتی ہے۔ نفیس بوا مغرب کی نماز ہی کے وقت سے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ اسے عید کے لئے پان پتے کا خرچ دے آؤں"...... اور میری بیوی؟ میری بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گھر کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کا حال بتا گئیں، لیکن نہ ذکر کیا تو اسی کا جس کے لئے میں نے ان سے یہ بات پوچھی تھی۔۔۔۔ خسر دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ خوشدامن کی طبیعت خراب ہے۔ بچے سو گئے نصیباً اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میری بیوی کہاں ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ میں نے تو گھر میں سناٹے کا سبب اسی لئے دریافت کیا تھا کہ خالہ میری بیوی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کریں گی لیکن انھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ان کا نام نہ لیا۔ تو پھر کیا وہ ابھی تک فیض آباد سے واپس نہیں آئیں؟ لیکن انھوں نے تو لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے بنارس ضرور پہنچ جائیں گی پھر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

میری شادی ہوئے ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اپنی نئی شریک زندگی کے ساتھ شادمانی اور سرشاری کے دو مختصر ہفتہ گزارنے کے بعد کالج کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اپنی بیوی کو کچھ عرصے کے لئے الوداع کہنا پڑا تھا۔ میری بیوی کو میری والدہ اپنے ساتھ فیض آباد لیتی گئیں اور میں طالبعلمانہ زندگی کی بے تکی جکڑ بندیوں کو سنیکڑوں کوسنے دیتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچکر تنہائی اور جدائی کی کوفت کو دور کرنے کا تنہا ذریعہ میری بیوی کے وہ محبت بھرے خطوط ہوتے تھے جن کے ایک ایک حرف سے شریفانہ نسوانی جذبات کی مہک آتی تھی۔ میں ان کے خطوط کے لئے دیوانوں کی طرح بے چین رہا کرتا تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ڈاکئے کی وقعت میرے دل میں جج سے کم نہ تھی جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز فیض آباد سے بنارس چلی جائے گی اور دبے دبے بند بند لفظوں میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں بھی عید کی تعطیل میں بنارس آجاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر میرے سینہ میں ہچکولے کھا رہا تھا اور میں یہ معلوم کرنے کے تڑپ رہا تھا کہ میری بیوی وہاں موجود ہے یا نہیں۔ خالہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اب آخر کس طرح پوچھوں۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا ابھی موجود نہیں جس سے کچھ پتہ چلے اور اپنی تمام آزادمزاجی اور روشن خیالی کے باوجود مجھ میں ہرگز اتنی ہمت نہ تھی کہ میں جی کڑا کر کے خالہ سے اپنی بیوی کے متعلق کوئی سوال کروں۔ ہندوستانی معاشرت کی بے ڈھنگی پابندیوں نے میرے لبوں پر ایسے

مہر لگادی تھی ــــــ جسے میری بیباک جراءت بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

"کھانا کھاؤ گے۔ یا پہلے چائے منگاؤں؟" میری خالہ نے پوچھا۔

بھاڑ میں جائے چائے، اور جہنم میں کھانا! جب وہی یہاں موجود نہیں جس کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلیں پڑھائی کا ہرج کیا تو پھر دنیا کی ساری راحتیں بیکار ہیں۔ میں یقیناً سفر کی وجہ سے بہت خستہ ہو رہا تھا اور اس تکان کو دور کرنے کے لئے گرم چائے کی ایک پیالی سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ مجھے خالہ کا یہ سوال زہر معلوم ہوا۔ میری طبیعت بے اختیار چاہتی تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے چلانے لگوں کہ

"سنئے خالہ جان! نہ میں چائے پیوں گا نہ کھانے کی مجھے مطلق خواہش ہے آپ لوگوں کو دوسرے کے احساسات کا بالکل خیال نہیں ہوتا .... دنیا جہان کی باتیں آپ نے کر ڈالیں۔ محلے بھر کا حال بتا گئیں پھر چائے اور کھانے کی صلاح بھی کرنے لگیں لیکن یہ نہ ہوا کہ میری بیوی کا کچھ حال بتائیں۔ آخر اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ سنتی ہیں آپ؟ ......"

لیکن میں یہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مجھ میں اس وقت جراءت پیدا ہو جائے لیکن جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو مری ہوئی آواز میں بے دلی کے ساتھ میں بولا۔ "چائے! ــــــ جی ہاں منگوا دیجئے۔ پی لوں گا"

"ہاں تھوڑی سی گرم گرم چائے پی لو تو ذرا جان میں جان آ جائے۔ تم تھک گئے ہوگے۔ اور دیکھو وہ سامنے کونے میں تمہارا بکس رکھوا دیا ہے شیروانی اتار کر ٹانگ دو منہ ہاتھ دھو ڈالو" اور یہ کہتی ہوئی وہ زینہ پر سے اتر گئیں

اس وقت میری طبیعت اس قدر الجھ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اپنی بوٹیاں نوچ ڈالوں میری الجھن کی حالت کسی طرح اس مجرم سے کم نہیں تھی جو امید اور مایوسی کی درمیانی حالت میں سر نگائے حاکم کے سامنے اپنے فیصلہ کے سنائے جانے کا انتظار کر رہا ہو اور حاکم انتہائی لاپرواہی اور بے خیالی کے ساتھ دوسرے کاموں میں اس طرح مشغول ہو جیسے اسے آج کسی مقدمہ کا فیصلہ سنانا ہی نہیں ہے۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ کی وحشیانہ نوچ کھسوٹ میں شیروانی اتاری۔ جوتا اور موزہ بھی کھینچ تان کر پیروں سے علیحدہ کیا۔ شیروانی کو کھونٹی پر ٹانگنے کے بجائے اسے ٹوپی کے ساتھ پلنگ پر دے مارا، اور ایک بدمزاج ہارے ہوئے جواری کی طرح حواس درست کرنے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا ــــــ اتنے میں بڑی خالہ اوپر آ گئیں۔ آگے آگے وہ اور ان کے پیچھے ہاتھ میں چائے کی کشتی لئے ہوئے لڑکا ــــــ

میری خالہ ہمیشہ سے بہت باتونی ہیں۔ اس قدر باتیں کرتی ہیں، اس قدر باتیں کرتی ہیں کہ جان عاجز آ جاتی ہے وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات انکی محبت آرام پہنچانے کے بجائے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اخلاق و تواضع کی انکے مذہب میں اس قدر اہمیت ہے کہ چاہے آپ علالت کا عذر کیجئے چاہے شکم سیری کا ان کے آگے ایک بھی نہ چلے گی اور وہ ہمیشہ آپ کے عذر کو تکلف و شرم پر محمول کر کے جہاں تک ان کا بس چلے گا آپ کو ٹھنسا ٹھنسا کر کھلائیں گی۔ پھر چاہے آپ کو بدہضمی ہو جائے چاہے معدہ خراب ہو اس سے انھیں کوئی غرض نہیں، وہ اپنی مادرانہ شفقت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو گئیں۔ بس، یہ احساس ان کے ضمیر کو مطمئن کرنے

کے لئے کافی ہے۔

میں نے چائے دانی میں سے گہرے سنہرے رنگ کی خوشبودار چائے پیالی میں انڈیلنا شروع کی اور خالہ نے حسب عادت اپنے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کے قصے قضیئے چھیڑ دئے۔

"حکیم صاحب کو لڑکی کے جہیز کی بڑی فکر ہے کہتے تھے کہ میرے نہ کوئی لڑکا نہ بالا ——— بس لے دے کے یہی ایک لڑکی سارے گھر کا اجالا ہے مجھے اپنا روپیہ کوئی قبر میں تو لے جانا نہیں ہے کہ میں بیاہ میں ہاتھ روک روک کر پیسہ اٹھاؤں۔ اب اس موقع پر بھی ارمان نہ نکالوں گا تو یہ ساری جمع جتھا کس روز کام آئے گی۔ بس میاں اب تم یہ سمجھو کہ سارے کپڑے لتے، گہنا پاتا تیار ہے فقط ایک چاندی کی مسہری تو البتہ کاریگر نے ابھی تک بنا کر نہیں دی باقی سب بیاہ کا سامان ——— اے میاں شکر اور ڈالو بھلا دو چمچوں میں کیا ہوتا ہے؟ پھیکی چائے پینے سے کیا فائدہ۔ آج کل کے لڑکوں نے عجب رواج نکالا ہے کہ ہر چیز میں موئے فرنگیوں کی طرح مٹھاس کم ہو ——— تو بھیا بس نکاح کی تاریخ ٹھیرنے کی کسر ہے۔ باقی تو دونوں طرف سے سب ٹھیک ٹھاک ہے"

مجھے خالہ کی باتوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی میرا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور جب گرم چائے کی بھاپ میرے ماتھے سے ٹکراتی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ماتھا برف کی ایک قاش کی طرح سرد ہے۔ میں جھنجھلا رہا تھا کہ عورتیں فضول باتیں کرنے کی کس قدر عادی ہوتی ہیں خصوصاً گھر کی بڑی بوڑھیاں جن کے پاس خانگی جھگڑے رشتہ داروں کی آپس میں شکر رنجیاں، بال بچوں کی علالت شادی بیاہ کے قصے، مہمانوں کے کپڑوں اور زیور کی نکتہ چینیوں کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں ہوتا ———

مجھے رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ میری خالہ تمام بے کار تذکرے جن سے مجھے کوئی سروکار نہیں اڑاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مجھ سے کوئی ایسا ذکر کریں جس میں میری بیوی کا نام آئے۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا نیچے صحن سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی نہ قدموں کی آہٹ کی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میری بیوی مکان میں موجود ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی گوشے سے اُسکی ہلکی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ یقیناً وہ فیض آباد سے نہیں آئی۔ اُفوہ مجھے اس وقت کس قدر صدمہ تھا!

میری خالہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"نواب صاحب کے نئے مکان میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے کرایہ دار اترے ہیں۔ ویسے ہیں تو حیثیت دار مگر ایسی دولت بھی کس کام کی جو مزاج بگاڑ دے۔ گھر کی عورتیں تو اس قدر بد دماغ ہیں کہ اللہ پناہ میں رکھے میں نے تو انہیں باتوں سے جل کر برسوں کھڑکی اینٹوں سے چنوا دی۔ اے ہاں۔ کون ایسے سرپھروں سے میل جول رکھے۔ میاں واہ! تم تو خالی پیٹ میں چائے پئے چلے جا رہے ہو میں کہتی ہوں کہیں گرم گرم چائے خالی پیٹ میں نقصان نہ کر جائے پہلے کچھ کھا لو پھر چائے پینا" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نمکین سموسوں کی طشتری میری طرف سرکا دی۔ مجھے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے چائے تک کڑوی معلوم ہو رہی تھی کسی اور چیز کا کیا ذکر! ویسے تو میں نے پوری پیالی کو چائے سے بھر لیا تھا لیکن ہر گھونٹ بے دلی کی وجہ سے آخری گھونٹ معلوم ہوتا تھا اور میری طبیعت چاہتی تھی کہ پوری چائے ختم کئے بغیر یوں ہی اُٹھ کھڑا ہوں لیکن ساتھ ہی میں خالہ کی استبداد سے بھی واقف تھا اس لئے میں عجب

کشمکش میں مبتلا تھا: مجھ سے چائے پی جاتی تھی، نہ باتیں کی جاتی تھیں نہ توجہ سے خالہ کی گفتگو سنی جاتی تھی۔ مجھے اس ایک لمحے میں ہی خالہ سے انتہائی کوفت ہونے لگی دل چاہتا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں ایک تو میں یوں ہی ان کی بیکار باتوں سے اکتا رہا تھا اس پر انکا اصرار اور بھی جلتے توے پر پانی کا کام دیتا تھا۔" اے یہ مٹھائی تو تم نے کھائی ہی نہیں۔ لو یہ سنترے چکھ کر دیکھو تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے۔" اجی تم تو بیٹھے چائے سے کھیل رہے ہو۔ آخر کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں" یا اللہ آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جب میں نے صاف صاف کہدیا کہ میری طبیعت نہیں چاہتی تو پھر آخر کیوں وہ کھلا کھلا کر مجھے مار ڈالنا چاہتی ہیں۔ میرے دل میں بچوں کی سی ایک مضحکہ خیز خواہش پیدا ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ جس طرح انھوں نے مجھے یہ بتایا کہ سنترے تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے اسی طرح وہ زعفرانی رنگ کے خوشنما حلوے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگیں "اور یہ حلوا تمہاری بیوی نے بنایا تھا" مگر میری بیوی سے تو انھیں جیسے چڑھ سی ہوگئی ہو کہ کسی سلسلے میں کسی طرح اس کا نام تک انکی زبان پر نہیں آتا ...... مجھے ہر چیز سے اس وقت الجھن ہو رہی تھی چائے کا گھونٹ حلق میں اٹک اٹک کر جا رہا تھا۔ کشتی میں کھانے کی چیزیں دیکھ دیکھ کر میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

کسی طرح جلدی جلدی چائے کی پیالی الٹی سیدھی ختم کر کے میں نے کشتی اپنے سامنے سے سرکا دی اور اس خیال سے کہ کہیں اسی وقفہ میں خالہ جان لڑکے کو کھانا لانے کا نادری حکم نہ صادر فرما دیں میں نے جلدی سے پیش بندی کے طور پر کہہ دیا۔

" راستہ میں ریل پر بھی کچھ ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر یہاں آکر بھی اسوقت چائے پی لی۔ اب بھوک نہیں۔ اس وقت کھانا نہیں کھاؤنگا۔" اے واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ لو بھلا تم نے کھایا ہی کیا۔ ساری چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹا تم نے تو کچھ چھوا تک نہیں۔ رات کو بے کھائے سونا اچھا نہیں۔ کچھ نہیں تو دو چار نوالے ہی کھالو"

جھنجھلاہٹ کی وجہ سے میرے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن میں نے فوراً اپنے چہرے پر بناوٹی شگفتگی پیدا کر کے کہا "نہیں خالہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ سچ اس وقت مجھے بالکل بھوک نہیں ہے"

اس کے بعد میری خالہ نے بڑا سا پاندان اپنے آگے گھسیٹ لیا اور پان کی گلوریاں بنانے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر جلدی مجھے کوئی ترکیب نہ سوجھی تو خالہ جان بغیر دس بارہ پانوں کی گلوریاں بنائے پاندان بند نہیں کریں گی اور اسمیں انھیں کسی طرح پندرہ منٹ سے کم نہیں لگیں گے۔ اس لئے کہ انھیں پان بناتے میں ادہر ادھر کی باتیں کرنیکا مرض ہے۔ میں نے پہلے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے منہ کھولا۔ پھر ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور آنکھوں کو بند کر کے ہلکے جھکولے کے ساتھ آگے کی طرف اس جھوم گیا جیسے مجھے بُری طرح نیند آ رہی ہو۔

"لو۔ تم تو اونگھ رہے ہو۔ آج گیارہ ہی بجے سے نیند آگئی کیا؟"

"میں نے فوراً بات بنائی رات کو ریل پر سونے کو تھوڑی ملا۔ راستہ میں مسافروں کی وہ بھیڑ تھی کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ ایک منٹ کو بھی پلک سے نہیں جھپکی"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں عید کی نماز کے لئے تڑکے اٹھنا بھی ہے۔ پھر ماشاء اللہ بال بچوں کا گھر۔ وہ اندھیرے منہ ہی غل مچانا شروع کر دیں گے۔ پھر بھلا کوئی سو تھوڑی سکتا ہے۔ اور ہاں بچوں کے ذکر پر خیال آیا جمیلہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی آپ کی دولھا بھائی آئیں گے تو میں اُن سے کتابوں کے لئے ننھی سی الماری منگواؤں گی۔ اس پر شاہد بولا میں کتابیں نکال کر پھینک دونگا اور اس میں اپنے کبوتر پالونگا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے تو زبانی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر دھینگا مشتی ہونے ہی کو تھی کہ میں نے اُٹھکر بیچ بچاؤ کر دیا تب کہیں جا کر دونوں الگ ہوئے ہیں۔ جب تک تمہارے خسر گھر میں رہتے ہیں تب تک تو ذرا امن رہتا ہے۔ ادھر انھوں نے گھر سے قدم نکالا اور ادھر بچوں نے ادھم سے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ بعض وقت تو ایسا ناک میں دم آتا ہے کہ طبیعت چاہتی ہے سب کو پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دوں اور باہر سے کنڈی لگا دوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اللہ رکھے انہیں کے دم قدم سے گھر کی رونق ہے۔ یہ ادھم شور تو جی کے ساتھ......" میرا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا تھا، گستاخی کا خیال کئے بغیر میں جلدی سے ان کی بات کاٹ کر چلا اٹھا۔

"بس خالہ۔ اب آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور مجھے بھی نیند کی وجہ سے جھونکے پر جھونکے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت مجھے سو رہنے دیجئے۔ اب انشاء اللہ کل اطمینان سے باتیں ہونگی"۔

خدا خدا کر کے میری خالہ لیمپ کی روشنی اور کمرے کے بند کرنے کے متعلق کوئی نصف درجن متفرق ہدایتیں کر کے نیچے چلی گئیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اسوقت میرا مزاج درجہ بدرجہ چڑچڑا ہو رہا تھا اور مجھے اپنے گردوپیش کی ہر چیز پر خواہ مخواہ غصہ آرہا تھا میں اپنی نظروں کے سامنے تمام خوشنما ہوائی محل ایک ایک کر کے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا میرے تمام ولولوں، تمام پر لُطف توقعات کی عمارت ایک کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب میں بیشمار دولت ملنے کے بعد یکایک بیدار ہونے پر مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو کہ کسی عظیم الشان محل کی آراستہ خوابگاہ میں ریشمی پردوں کی شاہانہ مسہری پر سونے کے بجائے میں اپنے بستر ہی پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا ہوں — کمرے کی دیوار پر ایک پُرانی وضع کی بھدی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ سامنے والی صحنچی میں ایک سیاہ بلی کے خرخر کی آواز آرہی تھی۔ میں اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ مجھے بالکل یہ معلوم ہوا گویا گھڑی اور بلی دونوں میرے منصوبوں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔

میں جھنجھلا کر بستر پر دراز ہو گیا اور مجھے باری باری اپنے اوپر، اپنی بیوی پر اور اپنی خالہ پر غصہ آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر اپنے کو لعن طعن کرنے لگا کہ ایسی بھی بے تابی کس کام کی کہ ساری پڑھائی چھوڑ چھاڑ بیوی کی محبت میں دیوانوں کی طرح اتنی دور سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ پھر مجھے اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا کہ عجیب لڑکی ہے بے سوچے سمجھے خط میں لکھ مارا کہ میں عید سے دو روز پہلے پہنچ جاؤں گی۔

لیکن سب سے زیادہ برہمی تو مجھے اپنی خالہ سے تھی کہ اتنا سن آگیا۔ زمانہ کے سیکڑوں تجربے حاصل کئے، اتنی اکل کھری

کہ صریحاً جانتی ہیں کہ میں اپنی بیوی کا حال سننے کے لئے بے چینی سے منتظر ہوں لیکن وہ ہیں کہ ساری خدائی کے تذکرے کرکے مجھے ٹال دیا مگر مجال
جملہ ایک لفظ بھی میری بیوی کے متعلق نہیں کہا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ یہ سارا نقص اس وجہ سے ہے کہ عورتیں تعلیم کی کمی کے سبب بالکل
ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ذرا سی عام سمجھ کی بات بھی اُن کے دماغ میں نہیں آتی۔ اسی کے بعد میں ایک پُرغور فلسفی کی طرح عورتوں کی نقص
تعلیم کے اسباب و علل پر نظر ڈالنے لگا۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس میں بے چاری عورتوں کا کیا قصور ہے؟ یہ ساری خطا تو
ان تاریک خیال متعصب مردوں کی ہے جو اپنی عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت دلانے کے بجائے انھیں پا بہ زنجیر جانوروں کی طرح گھر کے پنجرے میں
بند کرکے رکھتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے کہ جہالت کے ہاتھوں سیکڑوں بے تکے رواج روز بروز پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن کوئی کروٹ تک نہ لے
اور ہمارے یہاں یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ گھر کی بڑی بوڑھی کے سامنے آپس میں باتیں کرنا تو درکنار شوہر و بیوی کسی تیسرے شخص سے ایک دوسرے
کے متعلق کوئی بات بھی نہیں پوچھ سکتے ——— تف ہے ایسی معاشرت پر، اور لعنت ہے اس ملک پر جہاں ایسی رسمیں برتی جائیں ....
میں یہی سوچتے سوچتے چھت کی طرف تاکنے لگا اور دیکھنے لگا جہاں کونے میں ایک چھوٹی سی مکڑی نے اپنا جالا بنایا تھا۔ ابھی میں اس مکڑی
کے جالے کی حیرت انگیز صنعت کی داد بھی نہیں دے چکا تھا کہ مجھے زینہ پر پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً کھٹکا کہ خالہ کوئی چیز
بھول گئی ہیں اُسے لینے کیلئے واپس آرہی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر انھوں نے مجھے جاگتا پایا تو تعظیماً مجھے اٹھ کر بیٹھ جانا پڑے گا اور وہ مجھ
کو کوئی نہ کوئی بے کار تذکرہ چھیڑ دیں گی۔ اور چاہے وہ ایک سوئی ہی لینے کیوں نہ آئی ہوں لیکن پھر باتوں میں لگ گئیں تو دس پندرہ منٹ
سے پہلے ہلنے کا نام تک نہ لیں گی۔ میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ پائنتی سے چادر گھسیٹ کر اپنے اوپر تان لی اور زور زور خراٹے لینے لگا
زینہ پر قدموں کی آہٹ بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ میرے خراٹوں کی آواز بھی بلند ہوتی جاتی تھی۔ میں سمٹا سمٹایا پلنگ پر پڑا ہوا
پڑا تھا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہیں خالہ کو مجھ ہی سے کوئی کام نہ نکل آئے کہ پھر غضب ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر
انھیں مجھ سے کوئی بات کہنا ہوگی تو پھر وہ بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ میں سو رہا ہوں مجھے شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگیں گی لیکن اسوقت
مجھے اس قدر غصہ تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنا تو ایک طرف چاہے وہ میری ٹانگ گھسیٹ
کر پلنگ کے نیچے ہی کیوں نہ پھینک دیں مگر میں ہرگز ہرگز نہ اٹھوں گا۔ اسی ناراضگی اور جھنجھلاہٹ میں میں نے یہ بھی عہد کر لیا کہ صبح
عید کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میں آٹھ بجے کی گاڑی سے دہلی واپس چلا جاؤں گا .... میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رنگین کپڑوں کی
ایک ہلکی پھلکی رنگین گٹھری دھم سے میری ٹانگوں پر آ گری میں چارپائی سے اچھل پڑا اور گھبرا کر منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ میری بیوی بانکی
بیٹھی ہوئی گھونگھٹ کی آڑ میں سے مسکرا رہی تھی اور کمرہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا!

ذوقی - بی اے (علیگ)

مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن

اور

نظامی پریس بدایوں کا ایک اور عجیب کارنامہ

۱۹۰۵ء میں واقعات انیس (سوانح عمری میر انیس) لکھنے کے بعد برسوں یہ خیال دماغ میں گردش کرتا رہا کہ ایک بہترین اڈیشن تصنیفات انیس کا شائع کیا جائے جو کیفیت ظاہر دیدہ فریب اور باعتبار صحت قابل اعتماد و اعتبار ہو کیونکہ مطبوعہ جلدوں میں کلام انیس پایۂ اعتبار سے ساقط ہے جس قدر جلدیں مراثی انیس کی چھپی ہیں ان میں صحت کلام کی جانب توجہ مبذول نہیں ہوئی یعنی نہ تو صحیح مرثیے حاصل کرنے کا کوئی معقول ذریعہ تلاش کیا گیا اور نہ ہنگام طبع کسی اہل شخص سے پروف صحیح کرنے کی استدعا کی گئی اس خود غرضی سے ایک نامور شاعر کی تصنیف کا خون کیا گیا اور ہزاروں اعتراض اس کم توجہی کی بدولت کلام انیس پر ایسے وارد ہو گئے جن کا جواب دینا آج مشکل ہے اس نقصان عظیم پر نظر کرتے ہوئے میرا قصد ہوا کہ میں اس خدمت کو انجام دوں جو باعتبار حقوق دیرینہ میرا فرض ہے اور میرے پاس کلام صحیح شائع کرنے کے بہترین ذرائع بھی موجود تھے - میرے والد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اور استاد معظم جناب نفیس اعلی اللہ مقامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اب تک خاندان انیس میں اور خود میرے گھر میں محفوظ تھے لیکن باینہمہ انسان اپنے ارادوں پر قادر نہیں واقعات عالم نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی فرائض ملازمت سے اتنا وقت ممکن نہ ہوا کہ اس مقدس فرض کو ادا کرتا -

۱۹۲۰ء میں زندگی نے ایک دوسرا پہلو بدلا اور آنریبل سر راجہ صاحب بہادر والی ریاست عالیہ محمود آباد نے عزت افزائی فرماکر خدمت رکاب سعادت سے سرفراز فرمایا - راجہ صاحب کا دربار چونکہ اپنے علمی چرچوں کی بنا پر خصوصیت خاصہ رکھتا ہے اس سلسلہ میں بارہا جناب انیس اللہ مقامہ کا بھی ذکر آیا اس لئے میرے لئے کافی موقع تھا کہ اس خیال کو قوت سے فعل میں لاتا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا اور وقت گزرتا گیا -

ایک زمانہ کے بعد ریاست حیدرآباد کا جدید اڈیشن مراثی انیس کا سرکار والا کی نظر سے گزرا تو ان کے اضطراب کی حد نہ رہی، ان کا رنج بیجا نہ تھا کیونکہ میر انیس مرحوم کا بہت زیادہ کلام ان کے حافظہ میں محفوظ ہے ہجوم اغلاط سے وہ پریشان ہوگئے - میں نے بھی اس مجموعہ کو دیکھا اس مجلد پر جناب نظامی بدایونی نے ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا ہے مقدمہ نویس صاحب نے انیس مرحوم کے حالات زندگی پر اپنی معلومات کی روشنی ڈالی ہے اس کی نسبت میں کچھ نہیں چاہتا کیونکہ اس کے متعلق پہلے اک مستقل کتاب پیش کر چکا ہوں - حضرت نظامی بدایونی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس جلد کی تصحیح و ترتیب میں سید علی حیدر صاحب طباطبائی اور مسٹر ماس مسعود صاحب کو بہت دخل ہے اس صورت میں طبع جدید کی تمام تر ذمہ داریاں ان بزرگواروں سے منسوب کی جاسکتی ہیں

لیکن یہ امر مشکل سے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ذی علم مشاہیر سے ایسی ناگوار فروگذاشت ہوئی ہو اس میں شک نہیں کہ بعض بعض مقام پر ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی اپنی نیک نیتی سے کاتب کی غلطی سمجھے گا لیکن کاتب کی غلطی منتظم کی غلطی کا نتیجہ سمجھی جائیگی ہم کاتب کا گناہ کاتب کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھیں گے اور اس الزام کا رُخ اپنے مرکز اصلی کی جانب پھر جائیگا اور کلام انیس کی مجروحیت کا دعویٰ ارباب حل وعقد سے متعلق کیا جائیگا۔ سلطان دکن کے عطیۂ شاہانہ کا مصرف بمحل ثابت ہو اور اشاعت جدید کا صحیح مقصد کالعدم ہوگیا۔ حضرت بدایونی نے کلام انیس پر تنقید بھی کی ہے مگر لطف یہ ہے کہ جو کلام موقف تنقید ہے وہ بھی غلطی بلکہ تحریف وتدلیس سے پاک نہیں۔ ملاحظہ ہو (آمد حر کی تصویر)

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے

تنقید میں جو کچھ مدح سرائی کی گئی ہے وہ پایۂ اعتبار سے اس لئے ساقط ہے کہ انیس مرحوم کا مصرعہ ثانی حالت تحریف میں ہے وہ یوں ہے "برچھیوں اوڑجاتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے"

یہی تو سید محترم کی شاعری کا معجزہ ہے کہ ذرا تغیر و تبدل ہوا اور حسن بیان کے ساتھ حسن معنی بھی رخصت ہوگیا۔ برچھیوں اور برچھوں کا فرق محسوس کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ (پسران جناب زینب کی تصویر) پیش کی گئی ہے:۔

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

نازوں کا پالا یا نازوں کے پالے میر انیس کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ بجائے نذروں کے نازوں چاہیئے اگر جدید طبع مراثی انیس سے آرائش صوری مقصود تھی تو یہ تمنا پوری ہوگئی اور اگر خدمت زبان اردو مطلوب تھی تو مدعا مفقود ہے۔ دنیا شہرت اپنا ظاہر پرست ہے اس لئے بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام مشاہیر کے ہاتھ میں دے دئے جاتے ہیں قناعت پیشہ اہل کمال کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جن کو بدقسمتی نے گھر کی ٹوٹی چاردیواری میں زاویہ نشین کردیا وہ اپنی آنکھوں سے اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں کمال اہل کمال کے جسم فانی کے ساتھ قبروں میں دفن ہو رہا ہے۔ اس اجڑے ہوئے لکھنؤ میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر یہ کام ان کے ہاتھ میں دیدیا جاتا تو میر انیس کے پیکر مردہ میں روح عود کر آتی۔

جناب سید علی حیدر صاحب طباطبائی ہمارے عہد کے مشاہیر اہل کمال سے ہیں اور ایک زمانہ دراز سے وہ ریاست حیدرآباد میں مناصب جلیلہ پر سرفراز ہیں میر انیس کے جاننے والے بلکہ پہچاننے والے ہیں تلاش کرنے سے بھی اب ایسے لوگ کم نکلیں گے جنہوں نے میر صاحب مرحوم کو بچشم خود دیکھا ہو یا ان کی صحبت میں شریک ہوئے ہوں۔ سید صاحب موصوف انھیں باقیات الصالحات میں ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے انیس و کلام انیس سے عقیدت خاص رکھتے ہیں مگر باوجود ان خصوصیات کے سید صاحب کی کم توجہی وتغافل مقام افسوس ہے۔ سید صاحب یہ کہکر نہیں چھوٹ سکتے کہ مجھے اس اڈیشن سے کوئی تعلق نہیں۔

بڑا اہم سوال پیدا ہوگا کہ کیوں تعلق نہیں دہ انحالیکہ آپ اس کام کے اہل تھے تو آپ نے اپنی ذات کو کیوں بے تعلق رکھا میر انیس کی روح اور ان کے کلام کو سید صاحب سے شکوہ یہ ہے ریاست کی نیکنامی اور میر انیس کی محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اس کام میں مجسی نیتے ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے کمی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ جدید جلد مراثی انیس ظاہری چمک دمک دکھاتی ہوئی ارباب ذوق کے ہاتھوں میں پہونچ گئی تو مشتاقان کلام انیس کو بجائے مسرت کے ایک قسم کا انقباض ہوا اور جو امیدیں وابستہ انتظار تھیں ان کا خون ہوگیا ہندوستان کے اہل قلم نے اردو اخباروں اور ادبی رسالوں میں صدائے استغاثہ بلند کی جناب میر خورشید حسن صاحب عروج عرف دولہا صاحب نے بھی افسوس ناک اثر لیا یہاں تک کہ ایک روز مجھ سے ارشاد فرمایا کہ حضرت آپ کے دادا اوستاد کے کلام سے یہ بیرحمانہ سلوک کیا گیا تعجب ہے کہ آپ خاموش ہیں میں نے عرض کیا کہ میں کیا کروں اور کیا کر سکتا ہوں فرمایا کم از کم اس کے متعلق کوئی مضمون تو لکھیے تاکہ دنیا اس انقلاب عظیم سے واقف تو ہو جائے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس فرو گزاشت کو کارنمایاں سمجھکر دوسری جلد شایع کرنے کی جسارت کر بیٹھیں۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ میں زندہ موجود ہوں اور میرے مشورہ کی بغیر اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیونکر کیگئی بہر کیف ہیچمدان نے ایک مختصر مضمون لکھکر برادر معظم جناب دولہا صاحب کی خدمت میں حاضر کر دیا اتفاقاً اسی زمانہ میں کوئی صاحب حیدرآباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے جناب دولہا صاحب نے ان سے بھی اس مضمون کا تذکرہ کیا حیدرآبادی صاحب نے فرمایا کہ آپ اس کی اشاعت کو روکیں میں حیدرآباد جارہا ہوں وہاں پہونچکر کسی مناسب صورت میں ان غلطیوں کی اصلاح ہوجائیگی چنانچہ وہ بزرگوار حیدرآباد تشریف لیگئے اور پھر کوئی جواب نہ ملا۔

اس کے بعد واقعات ـــ دحالات نے مجھے بھی اس طرف سے خالی الذہن کر دیا اور بات آئی گئی ہوئی۔ اب نگار کے کسی گزشتہ رسالہ میں کلام ... کے نسخہ پر تنقید کے سلسلہ میں نظامی پریس کا نام دیکھکر پھر مجھے اس کا خیال آگیا اور پرانے کاغذات میں چند وہ اوراق مل گئے جنمیں ان اغلاط کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی ہر چند یہ صرف چند مرثیوں کے استقصار کا نتیجہ ہے لیکن کم از کم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوسکتا ہے کہ غلطیاں کس قدر عجیب و غریب ہیں اور نیز یہ کہ اگر سب جمع کی جائیں تو نہایت معقول دفتر اغلاط کا مرتب ہوسکتا ہے۔

ذیل کی فہرست سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ان غلطیوں کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے۔

غلط	صحیح
واقف ہیں کبھی حیدر جعفر کے شرف سے	واقف ہیں کبھی حیدر و جعفر کے شرف سے
ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی	ہر وار پہ بھائی کے ثنا کرتا تھا بھائی
چپکے رہو اماں در خیمے پہ کھڑی ہیں	چپکے رہو اماں در خیمہ پہ کھڑی ہیں

غلط	صحیح
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے	وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
جھک جھک کے جست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ	جھک جھک کے جست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
خادم جو زر لئے ہیں مگس ران ادھر ادھر	خادم جنور لئے ہیں مگس ران ادھر ادھر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے	بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھٹر رہا	پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ ٹھہر رہا
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوئے	گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے
دونوں طرف مآل تمھارا اخیر ہے	دونوں طرح مآل تمھارا بخیر ہے
دو چار تیر آ کے گرے جب قریب در	دو چار تیر آ کے گرے جب قریب در
ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حر	ایک دو لاکھ جوانوں میں بہادر تھا حر
حاکم شاہ ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور	حاکم شام ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور
خافر ور احم و تواب ہے رب عادل	غافر و راحم و تواب ہے رب عادل
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہے رات نے دن پہ	گیسو ہیں کہ سایہ ہے کیا رات نے دن پر
وہ شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے	وہ شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے
دکھلائے انداز وغا سے اب وجد سے کے	دکھلائے انداز وغا نے اب وجد کے
حیرت میں تھے زمیں پہ پسر چرخ پر ملک	حیرت میں تھے زمین پہ بشر چرخ پر ملک
زور دو کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل تو	رد و کد کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل
ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے	ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے
دیتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار	دیتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار
اس نے تو دیکھا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا	اٹھی تو دیکھا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا
خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہ ہندوں کے نام کا	خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہ دیں کے نام کا
نوجوں کا دست جیب کے بھی ممکن تھا شمار	نوچیں کا دست جیب سے بھی ممکن تھا شمار
نذروں کے نقتوں کے مرادوں کے پالے ہیں	نازوں کے نعتوں کے مرادوں کے پالے ہیں
وہ خاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال	وہ چاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال

غلط	صحیح
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے	غل پڑ گیا جہاد پہ دو مہ جبیں چڑھے
یکسر قدم سپاہ سے دریا کے اوکھڑ گئے	یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اوکھڑ گئے
گیسو جو بنت فاطمہ نے ہاتھ سے بٹے	گیسو وہ بنت فاطمہ کے ہاتھ سے بٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جن سے نظر ہٹے	آنکھیں وہ نرگسی کہ نہ جن سے نظر ہٹے
لکھے خدا نماز گزاروں میں اُس کا نام	لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
فاقہ سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر	فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نینیں بھی سیر
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے	پستے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے	پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
کوکو کا شور نعرۂ حق سر ہو کی دہوم	کوکو کا شور نعرۂ حق سرہ کی دہوم
بچو بہ سپہر بنے جس کا سائباں	بچو بہ سپہر بریں جس کا سائباں
وہ خوش بیاں کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے	وہ لوذعی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے
فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کردگار	فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کارزار
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں	سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں
دیکھیں کسے علی کے لہو کی ردا ملے	دیکھیں کسے علی کی بہو کی ردا ملے
یا قبر پہ یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا	یا قبر میں یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا
اوڑ کر زمین تلک کبھی گرد قدم گئی	اوڑ کر نہ زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
فخر حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف	فخر حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف
گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اون کے ہیں	گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اونکا ہے
تھا خوف کے عالم میں ہر اک بندہ کا آزاد	تھا خوف کے عالم میں ہر اک بندۂ آزاد
سب گھاٹ سے دنیا یے تلک خوں سے تر تھی	سب گھاٹ سے دنبالہ تلک خون سے تر تھی
گہہ ماں کو دیکھتے تھے گہہ جانب علم	گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے	کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے
ان ننھے ہاتوں ہاتوں سے اُٹھے گا یہ علم	ان ننھے ننھے ہاتوں سے اوٹھے گا یہ علم

غلط	صحیح
ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے	ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے
فرمایا آپ نے کہ نہیں ذکر کا مقام	فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
مارا جو تین بھال کا اس بجیا نے تیر	مارا جو تین بھال کا اس بجیا نے تیر
جلوہ دیا جری نے عروس مضاف کو	جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
بے زین تھا نہ فرس تھا نہ اسواز زین پر	بے زین تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
جیتے رہیں فرزند کہ سب سخت جگر ہیں	جیتے رہیں فرزند کہ سب لخت جگر ہیں
لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی	لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کو جانی
یکساں نہیں ہوتا کبھی اغاز کا انجام	یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
قرآں نہ اترا آتا تو قرات بھی نہ ہوتی	قرآن نہ اترتا تو یہ قرأت بھی نہ ہوتی
مرجائے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے	مرجائے بعزت یہ بہادر کی ظفر ہے
کر دیتی ہے دن دشمن ایماں کے دلوں کو	کر دیتی ہے شب دشمن ایمان کے دنوں کو
قرآں کوئی پڑھتا ہے کہ یہ بیکس تھا یہ بے پر	قرآن کو پڑھتا ہے کہ بیکس تھا یہ بے پر
نہ دستے میں اک جزو کتاب شہ مرداں	نہ ورقہ ہے اک جزو کتاب شہ مرداں
جس فرق کے چہرہ پہ نظر کی وہ جدا تھا	جس فرد کے چہرہ پہ نظر کی وہ کٹا تھا
دریا بھی دم تیغ کے دھارے سے نہ نکلا	دریائے دم تیغ کے دھارے سے نہ نکلا
بیٹوں سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے	بیٹوں سے پدر باپ سے فرزند جدا تھے
تھیں کند سنانیں بھی جو نیزہ میں گڑی تھیں	تھیں کند سنانیں بھی جو تیزی میں کڑی تھیں
تلواروں کے پنجے سے نکل جاتا تھا آکر	تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آکر
فوجوں کو پلٹ کر ادھر آیا اودھر آیا	فوجوں کو ڈپٹ کر ادھر آیا ادھر آیا
لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قبر سے کالا	لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قیر سا کالا
اب انکی جگہ آپ ہی یا شاہ زمن ہیں	اب انکی جگہ آپ ہیں یا شاہ زمن ہیں
ہے لپٹنے کی جا یہ زمیں فلک مقام	ہے لوٹنے کی جا یہ زمین فلک مقام
نکلا ہر اک دلی کی زباں سے یہی سخن	نکلا ہر اک جری کی زباں سے یہی سخن
الفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم وراہ	الفت نہ دلدہی نہ تواضع نہ رسم وراہ

غلط	صحیح
دوچار تیر آگے گرے جب قریب در	دوچار تیر آکے گرے جب قریب در
ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کمان نہ تھی	ثابت ہو جس پہ زہ کوئی ایسی کماں نہ تھی
دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک سریر	دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک مسیر
نقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو	نقروں کا ذوالفقار کے مطلب عیاں نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو اُسکی ثنا نہ ہو	کٹ جائے ساری عمر تو شمہ بیاں نہ ہو
تنہا نہ کوئی بھائی ہے جس کا نہ اب حبیب	تنہا نہ کوئی بھائی نہ ہمدرد نہ حبیب
بازو شکستہ جہید جگر میں کمر میں خم	بازو شکستہ درد جگر میں کمر میں خم
تو ہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے	تو بھی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے
ڈھالوں کو ردیوں کی طرح چیر چیر کر	ڈھالوں کو ردیوں کی طرح چیر چیر کرے
یہ سر عزیز ہے نہ سرک جا قدم نہ ٹیک	یہ سر عزیز ہے تو سرک جا قدم نہ ٹیک
فاقہ تھا پر کمی تگ ورو میں ذرا نہ تھی	فاقہ تھا پر کمی تگ ودو میں ذرا نہ تھی
چھٹنے کی شرم ہے نہ اسے بھاگنے کی قید	چھپنے کی شرم ہے نہ اُسے بھاگنے کی قید
کس سمت ابن سعد ہے اور شمر روسیاہ	کس سمت ابن سعد ہے او شمر روسیاہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ	رستے کی صعوبت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
رہ جاتی جو بہنیں بھی تو دم اُس کا بہلتا	رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا	اے نور نظر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
افلاک امامت کا کبھی بدر نہ سمجھے	افلاک امامت کا سب تجھے بدر نہ سمجھے
باتیں تھیں ہی یاس کی اور درد کی تقریر	باتیں تھیں یہی یاس کی اور درد کی تقریر
پھر پہ جوف نیزہ حیدر کو دیکھے سے	پھر میں جوف نیزہ حیدر کو دیکھے سے
راہیں بھی سب تنیں قطع سناں بھی دوبارہ تھی	گرہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوبارہ تھی
ٹوٹی وہ تیغ ادھر یہ چمک کر ادھر گئی	آئی وہ تیغ ادھر یہ چمک کر ادھر گئی
بہر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ	بحر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ
آنچ اُس کی تیوروں کی شفق کو جلاتی تھی	آنچ اس کے جوہروں کی شفق کو جلاتی تھی
ہم اس کی امانت لٹے پونہچا کے چلے ہیں	ہم اسکی امانت اوسے پونہچا کے پھرے ہیں

غلط	صحیح
خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے	خالص رہے نیت کوئی تشویش نہ گھیرے
بجھ بجھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے	بجھ بجھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مکر و وہم کے	دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مرغ وہم کے
آہو شکار و تیر دکماندار و شیر گیر	آہو شکار و مست و کماندار و شیر گیر
خوں ریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر	خوں ریز و جاں ستان و دل آویز و بے نظیر
ذرہ نواز و رند نما صاحب اتنیاز	آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز
بیدار و داغ زادہ و خونبار و غم طراز	بیدار و داغ دیدہ و خونبار و غم طراز
لیتے ہوں بوسے جن کے رسول فلک حشم	لیتے ہوں بوسے جس کے رسول فلک حشم
وہ ہاتھ جن کے خیر و عطا کا ہوا رواج	وہ ہاتھ جن سے خیر و عطا کا ہوا رواج

ان میں بعض غلطیاں تو وہ ہیں جن کے اعتراف پر ناشر و طابع سب مجبور ہیں۔ لیکن بعض غلطیوں کے تسلیم کرنے میں اُن کو عذر ہو، کیونکہ اُن کا تعلق ذوق سلیم سے ہے اور وہ اس کے عطا کرنے میں فطرت سے زیادہ فیاض نہیں ہے۔

بہرحال سخت ضرورت ہے کہ مراثی انیس کا صحیح اڈیشن شائع کیا جائے اور جلد سے جلد اس کا انتظام کیا جائے ورنہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اس کی صحت کا امکان بھی نہ رہیگا۔ کیونکہ جو چند صورتیں اس بار عظیم کے اٹھانے کی لکھنؤ میں اہل نظر آ رہی ہیں وہ بھی اب چراغ سحری ہیں۔ سنا ہے کہ لاہور میں بھی دفتر مرکز اردو سے کوئی اڈیشن شائع ہوا ہے یا ہونیوالا ہے لیکن جب حیدرآبادی سعی کا یہ نتیجہ ہوا تو لاہوری کوشش پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔

احسن لکھنوی

ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم و ادب کا مطالعہ

(۱)

زمانہ کی عجیب روش ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، اور وہ بھی مذہب کے نام پر۔ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا اُنیسویں صدی کی مغربی تہذیب کا یہ مقولہ سچ ہے کہ مذہب ہی جنگ و جدل کی بنیاد ہے اور دنیا میں جتنی خونریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے اتنی کسی دوسری چیز کے لئے نہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو مذہب نے ہمیشہ فطرتی وحشیانہ جذبات کو دبانے کی کوشش کی ہے البتہ یہ اور بات ہے کہ وہ جذبات موقع پاکر اُبھر پڑیں اور مذہب کے آڑ میں ایک ہنگامہ برپا کردیں کچھ عرصہ ہوا مسٹر حبیب صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا۔ انھوں نے اس میں نہایت خوبی سے یہ دکھلایا تھا کہ جو اسلام کے نام پر تلوار لیکر ہندوستان میں آئے دراصل وہی ہندوستان کے دشمن تھے اور اس لئے اُنھوں نے یہ بتلایا کہ ہندوستان میں اسلام کے سچے دوست اور اپنے پیغمبر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہوئے ہیں۔ جنھوں نے اسلام کا روحانی پہلو ہندوستان کے سامنے رکھا۔ موصوف نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک اور مسئلہ پر روشنی ڈالی تھی اور وہ یہ کہ آخر اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہندوستان میں کیوں نہ ہوئی۔ جس قدر تیزی سے عرب، عراق، عجم اور فارس میں۔ موصوف نے البیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ وہ مورخ بھی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ گو ہندوستان میں تمدنی مساوات نہیں ہے مگر ہر شخص اپنی مقررہ جگہ پر قانع ہے اور کثرت میں وحدت موجود ہے، معدوم نہیں دیگر ممالک میں عدم مساوات کے ساتھ قناعت نہ تھی اور وحدت معدوم سی ہوگئی تھی۔

میرا خود ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جنگ و جدل کے وجہ ناواقفیت ہوتی ہے۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ ڈھال کے دو رُخ ہوتے ہیں اور محض اس رُخ کو جو ہمیں دکھائی دیتا ہے، درست مانکر دوسرے سے اسبات پر لڑنا کہ جو رُخ تجھے دکھائی دیتا ہے وہ محض غلط ہے، عین خطا اور کم فہمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے بھی ایک جگہ یہی فرمایا ہے کہ آخر محض اس بات پر کیوں جنگ و جدل ہو کہ کوئی تربوز کو "ہندونا" کہتا ہے اور کوئی "مُسک ملن" مگر واقعی بات تو یہ ہے کہ ہندونا کہنے والا یہ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ تربوز اور مسک ملن بھی اُسی ایک سے کے مختلف نام ہیں۔ آج ۲۸ برس ہوئے کہ میرے بزرگ استاد مولوی نیاز محمد صاحب نے اول اول اس خیال کو ایک بیج کے دانہ کی شکل میں میرے دل میں بکایک رکھا تھا جو برابر نشو و نما پاتا رہا وہ یہ کہ ہندو وں مسلمانوں میں نااتفاقی کی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے علمی، ادبی اور مذہبی کتب کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ نہیں کرتے۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ ایک صبح کو ضرورت سے زیادہ جلد منڈیاہوں ضلع جونپور کے تحصیلی اسکول میں پہونچ گیا مولوی صاحب موصوف نماز پڑھکر مسجد سے باہر نکلے اور اپنی بورڈنگ کے کوٹھڑی میں پہونچے۔ وہاں جاکر انھوں نے پہلے قرآن شریف پڑھا اس کے بعد سعدی کی گلستاں کا کچھ مطالعہ کیا اور پھر تیسری کتاب جو انھوں نے نکالی وہ تلسی داس کی رامائن تھی ایک ہندو بچہ

قدرتاً متحیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مولوی صاحب آخر اِس کتاب کو اپنی پرستش کیوقت کیوں پڑھتے ہیں۔ ایک خاص وجہ اور بھی سوال کے پیدا ہونے کی تھی، اور وہ یہ کہ مجھے میرے والد روزانہ شام کو رامائن پڑھنے کی تاکید کرتے اکثر جبراً پڑھاتے تھے میری بیدلی کا ٹھکانا نہ تھا اور اکثر زد و کوب تک برداشت کر لیتا تھا۔ بلاشبہ میری حالت اسوقت بجنسہٖ ملٹن کی لڑکی کی سی ہوتی تھی۔ جب میں نے وہی کتاب مولوی صاحب کو پڑھتے دیکھی تو مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے دبتے دبتے سوال کیا کہ مولوی صاحب مجھے تو اسی رامائن کے لئے روز مار کھانا پڑتی ہے اور آپ کافروں کی وہی کتاب کیوں پڑھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے ہنسکر جواب دیا کہ کافر کے معنی ہیں خدا کی ہستی سے انکار کرنے والا اور رامائن یا ہندو مذہب اس ہستی سے منکر نہیں ہے۔ اس وجہسے میں رامائن کو ہرگز کفر کی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ تو ہندو ہو کر اس پیاری بھاشا سے کیوں بے بہرہ ہے جسمیں لطافت کی انتہا نہیں؟ بھائی عربی فارسی پر بھی میرے لئے غیر ملکی زبانیں ہیں اور جو مزہ ہندی میں ہے وہ مجھے اُن میں نہیں آ سکتا۔ انھوں نے ہندی کی لطافت کی مثال بتلاتے ہوئے تان سین کے گائے ہوئے پد کی تفسیر کی تھی۔ جسودا بار بار یہ بھاکھے، ہے کوئی برج میں ہتو ہمارا چلت گوپال نہیں روکے انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب یہ پد اکبر کے دربار میں گایا گیا تو تان سین، بیربل، توڈرمل، فیضی اور نواب رحیم خان خانان نے اِس پد کے کس طرح جُدا جُدا معنے بیان کئے جسمیں ادبی شغف و مذاق، دونوں کی شمولیت تھی۔ کسی وقت ناظرین نگار کے سامنے اُسی تفسیر کو پیش کرونگا۔ یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اُس دن سے میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ میں اب بھی اپنی پوجا کے وقت تقریباً کل مشہور مذاہب کی کسی نہ کسی کتاب کا کچھ نہ کچھ ضروری مطالعہ کرتا ہوں۔ مثلاً آج کل اپنی پیاری تلسی کرت رامائن کے ساتھ مثنوی مولانا روم، بدھ کا دھم پد، بائبل، وتلک کا گیتا رہسیہ۔ سوامی وِویکانند کے اپنشدوں کی تفسیر، ٹیگور کا ترجمۂ کبیر، ٹیگور کی گیتانجلی، اِن سب کو تھوڑا بہت پڑھتا ہوں۔ میرے اکثر دوست اسے "کھچڑی" کہتے ہیں۔ مگر مجھے تو اس کھچڑی میں وہ مزہ ملتا ہے جو علٰحدہ طریقہ پر دال میں ہے، نہ چاول میں اور نہ مسالوں میں۔ اگر ایک طرف تلسی داس جی لکھتے ہیں۔ جان سکھ سو جیا ہو نرگن سگن سروپ۔ مم ہردے پنکج بھرنگ اِو بسہو رام نر روپ۔ "(جو شخص ایشور کے حقیقی یا صفاتی حیثیت کو سمجھ سکتا ہو سمجھے۔ میرے دل کے کنول کے اندر تو ہے رام! تم انسانی شکل میں بھونرے کی طرح قیام کرو) تو دوسری طرف علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اگر ایک طرف سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں " ید علیا بہ ید سفلیٰ کے مانند" تو دوسری طرف تلسی داس جی کہتے ہیں:-

تلسی کر (ہاتھ) پر کر کرے، کر تر کتر نہ کرے۔ جا دن کر تر کر کرے تا دن مرن کرے۔ اگر کہیں یہ پڑھا کہ [illegible]

تو فوراً نسیم کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ؎

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے ۔۔۔ مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

اس نقطۂ خیال سے ابھی حال میں صوبہ کی کونسل کے ایک سوال کے جواب سے یہ معلوم ہو کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا کہ ایک امتحان میں جہاں ہندوؤں کے سدہا لڑکے اردو لیکر شریک ہوئے تھے وہاں صرف ایک مسلمان لڑکے نے ہندی لی تھی۔ آہ! رحیم

ملک محمد جائسی، رسکھان، مبارک کے قائمقام کیا اب نہ ہوں گے جنھوں نے ہندی میں ایک لطافت کا دریا بہا دیا؟ کیا وہ محققانہ جوش سرد ہوگیا جس نے ہندوستان سے علم ہندسہ کو اودھار لینا بیجا نہ سمجھا تھا اور جس نے بغداد میں چرک و سشرت نامی ویدک کتب کے ترجمے کرائے؟ فیضی کی رامائن و گیتا کے فارسی تراجم اب بھی یادگار ہیں۔ یعنی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ دوسرے کی علمی کتاب پڑھی اور بس مذہب تبدیل ہوا۔ مذہب کیا ٹھہرا کوئی کچا گھڑا ہو۔ میں اب بھی ویسا ہی ہندو ہوں جیسا ۲۰ سال قبل تھا بلکہ شاید بہتر۔ میں نے مولوی صاحب موصوف کے سے سچے خداترس اور پاک انسان کم دیکھے ہیں۔ آہ! مجھے موصوف کا ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے ہدیۂ ناظرین کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے ہم سبق بیجناتھ حلوائی کے مکان پر ایک قدیم قلمی رامائن معہ تفسیر کے موجود ہے۔ تحقیقات پسند دل بیتاب ہوگیا اور گو اس کے باپ نے بمشکل اس شرط پر رامائن کو دینا قبول کیا کہ روزانہ خود اس کا لڑکا رامائن لیجایا کرے گا اور مولوی صاحب کے سامنے دور (کیونکہ مولوی صاحب ملکش تھے نہ، کافر کا کیا مدمقابل انسانی نفرت نے گڑھا ہے!) اسٹول پر رکھدیگا اور وہی صفحات بھی پلٹتا جائیگا (آہ مولوی صاحب کے چھونے سے کہیں کتاب کی روحانیت نہ اڑ جائے) مگر پھر بھی مولوی صاحب مسکرا کہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں اس پاک کتاب کی کتنی عظمت ہے چنانچہ موصوف نے باوجود ان شرائط کے کل کتاب پڑھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں ہندی کے پاک خیالات اور خصوصاً تلسی داس جی کی رامائن کے جذبات اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ حال کی ملاقات میں حضرت نیاز فتحپوری نے براہ شفقت برادرانہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے سلسلہ مضامین کو اپنے رسالہ نگار میں شائع کرنا منظور فرمایا۔ مگر ناظرین نگار سے کچھ معذرت خواہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا لحاظ رکھتے ہوئے میری تفسیر میں جہاں موازنہ کی غلطی ہو اُسے کوتاہ نظری سے منسوب نہ کرتے ہوئے مجھے ایک خاص پہلو کا شیدائی یا سودائی سمجھیں۔ دوئم یہ کہ بوستان کی ذیل کی روایتیں ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اسے فراخدلی سے کام میں جو خدا میں ہے یا اُن کے پیغمبر علیہ السلام میں تھی۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہفتاد سالہ گرسنہ آتش پرست پر رحم کرکے اسے ایک اسلامی قافلہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر جب شام کو سب لوگ معہ اُس آتش پرست کے دسترخوان پر بیٹھے اور اُس نے خدا کی پرستش میں حصہ نہ لیا تو اس بیچارے کو بھوکا ہی اُٹھا دیا گیا۔ فوراً غیب سے آواز آئی کہ اے مسلمو! تم نے یہ خیال نہ کیا کہ میں نے اس کی پرورش ستر برس تک کی باوجودیکہ وہ آتش پرست تھا۔ اور تم کو ایک وقت کا کھانا دینا بھی دشوار ہوگیا۔ دوسری روایت بھی عجیب سبق آموز ہے اور وہ یہ کہ حاتم طائی کے قبیلہ نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ حاتم کی وفات کے بعد محمد صاحب نے اُسکے ملک کو فتح کرکے اس کے قبیلے کے برگزیدہ اشخاص کو معہ حاتم کے لڑکے گرفتار کیا۔ اور قتل عام کا حکم صادر فرمایا، صرف لڑکی کو اُسکے باپ کے خیال سے چھوڑ دیا۔ مگر لڑکی آخر تھی حاتم کی اُس نے کہا کہ اگر آپ میری قوم کو تہ تیغ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاتم کی لڑکی ہوکر اُسکے نام کو کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے آپ پہلے قتل کیجئے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی قوم کو اپنے سامنے اور جیتے جی تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھوں۔ محمد صاحب نے فوراً سب کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ اصل وجوہر" سے خطا نہیں ہوتی جس کا صاف مقصد

یہ تھا کہ اصل "جوہر" کسی تنگ مذہبی دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بحر سخن کی طرح بحر حقیقت بھی ایک غیر محدود چیز ہے اور اس کو ایک جگہ بند نہیں کر سکتے۔

اب دوسرے حصۂ مضمون میں رامائن کے ایک نہایت برگزیدہ حصہ کی تفسیر پیش کرتا ہوں جسمیں تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار زیر بحث ہے۔

(۲)

تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار

مارچ ۱۹۲۵ء کے رسالہ زمانہ میں "تلسی داس کا شاعرانہ کمال" والے مضمون کے عنوان میں مہاتما گاندھی کا وہ قول میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں جسمیں مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ میرے دلی جذبات کا ابھار جس قدر تلسی داس جی کی رامائن اور گیتا سے ہوتا ہے اوتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ کے تھوڑے ہی دنوں بعد لالہ ہردیال جی کا ایک مضمون پرتھا (کانپور) میں میری نظر سے گزرا جسمیں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ تلسی داس جی کی رامائن ہماری ایک خاص قومی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور جس طرح ڈیوک آف ولنگٹن (مشہور و معروف انگریز سپہ سالار جس نے نپولین اعظم کو واٹرلو کے میدان جنگ میں شکست دی تھی) کہتا تھا کہ اُس کا تاریخی مطالعہ سیکسپیر کے ڈراموں ہی سے ہوا ہے اسی طرح ہم پُرانی تہذیب کے اصولوں کا مطالعہ اس مقدس کتاب سے کر سکتے ہیں جو تاریخ کا اصل مقصد ہے۔ تلسی داس جی کے سہ صد سالہ یادگاری جشن کے موقع پر پنڈت مدن موہن مالوی نے فرمایا تھا کہ حصول آزادی کی پہلی منزل رہی ہے، جو تلسی داس کے خیال کی آزادی سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیروں کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے بھی گویا رام راج میں ہیں ان خیالات کے ذریعہ رام راج کے اصولوں کو شاعرانہ دلکشی کے ساتھ تمام قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوامی شردھا نند جی مرحوم نے بھی اپنی شردھا (دلی عقیدت) اس پاکیزہ خیال شاعر کے قدموں پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اچھوت قوموں کے ساتھ وہی برتاؤ لازم ہے جو رام نے نشاد، سیوری، کول، کرات وغیرہ کے ساتھ کیا تھا اور جسے تلسی داس نے اپنی رامائن میں عجیب بھگتی اور پریم کے رنگ میں دکھلایا ہے۔ دلچسپی پنڈت دیندیال شرما نے وحدانیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلسی داس جی کے اس استعارہ سے بڑھکر ایشور اور مادی دنیا کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے کوئی استعارہ ملنا محال ہے کہ ایشور دنیا میں اس طرح بس رہا ہے جیسے حنا میں سرخی کہ نظر نہیں آتی مگر موجود ہے۔ پروفیسر گریرسن تو تلسی کے مقابلہ میں کسی اور مشرقی شاعر کو شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ المختصر تمام مختلف الخیال لوگوں کی نگاہیں اس وقت عجیب امید کے ساتھ تلسی داس کی رامائن پر پڑ رہی ہیں اور تلسی داس جی کا خود دعویٰ بھی یہی ہے کہ کلجگ کے لئے رام بھجن اور رامائن کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ نجات نہیں ہے۔ رحیم خانخاناں بھی تلسی داس جی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک برہمن کی لڑکی کی شادی میں امداد کی سفارش کرتے ہوئے جب تلسی جی نے سفارشی خط میں یہ لکھا کہ "سُر دیوتا) تیا (عورت) نر (آدمی) تھا ناگ تیا سب چاہیں اس ہوئے" تو رحیم خاں نے اسپر گرہ لگا دی کہ "ہلسی (تلسی داس کی [illegible] کا نام) ہوں ہلسی (خوش) بھیجیں تلسی سوں سُت (لڑکا) ہوئے"۔ میں بھی اس خزانہ سے ایک انمول موتیوں کا ہار ناظرین نگار کی

...کرتا ہوں۔ کہ نہ یہ موقع ہے اور نہ میں ایسا جوہری ہوں کہ اس ہار کے ہر موتی کی آب
سو پورے ... انہی تمام مادی ... یں، ہار کے کچھ عام اوصاف بیان کرتے ہوئے نہایت ادب سے اپنی ناچیز نذر کو پیش کرتا ہوں
انیسویں صدی اپنی ... ایجادوں کے ساتھ اگر خدا کو بھول نہ گئی تھی تو اس کی ہستی پر شک ضرور کرنے لگی تھی اور مغربی د
میں نباتات وحیوانات ... کے طبقات میں محض طاقتور کی فتح کے اصول کو اپنی یکرخی نظر سے دیکھکر اسی کو اپنا معیار مان بیٹھی تھ
کمزور فرد یا قوم ... کے موت یا زوال کی دعوت کے سوا اور کوئی تحفہ اس کے پاس نہ تھا۔ مساوات کا مسئلہ بھی انقلاب فرانس
کے وقت خونی آزادی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مزدور مالک کے دشمن، رعایا حکمرانوں کے خون کی پیاسی، قوم قوم کے گ
...ی ڈالنے کو تیار، اور پھر لطف یہ کہ ہر شخص کی زبان زد یہی مساوات و آزادی کا راگ یہی نظارہ کم وبیش اس بیس
صدی میں بھی نظر آتا ہے، ملک الشعرا ٹیگور اپنی کتاب نیشنلزم (nationalism) میں مغرب کے خیال قوم
کا ایک عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل الفاظ میں ہے:۔

”اس قومی خیال والے بھوت کے خوف سے ساری زمین تھرا رہی ہے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں بدگمانی اور خفیہ نقصان
رسانی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے .... اس قومی خیال کی حرکت کہیں گرد ونواح میں ذرا بھی ہوئی کہ فوراً لوگوں کے کان
کھڑے ہوئے اور ایک خوف کا احساس چاروں طرف پھیل گیا۔ خوف ہی انسانی طبائع کے جملہ برائیوں کی بنیاد ہے ...... لوگ
کذب وعیاری پر اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں، قرار ہائے صالح پر محض انکی صلاحیت کی وجہ سے مضحکہ زنی ہوتی ہے
اس قومی (خیال) کا خلاصہ منشا صرف یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی کمزوری سے مستفید ہوسکے لئے استعارہ صرف ان کیڑوں سے لیا جا
ہے جو مفلوج گوشت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ انکا مقتول صرف اس قدر زندگ
قائم رکھے کہ ان کی زبان کے ذائقہ اور انکی شکم سیری کا سامان ملتا رہے۔“

اس لئے موصوف گزشتہ جنگ یورپ کو اسی گناہ کی سزا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جبتک شرقی اصولوں پر عملدرآمد نہ
کیا جاویگا، اسوقت تک لیگ آف نیشنس (League of nations) محض طائفہ قزاقاں بنی رہیگی۔ شاعر موصوف
فرماتے ہیں کہ ہمیں امید ہے کہ یہ مادی طاقت اپنے خون آلود قدموں کے دہونے کی خواہش ضرور کریگی اور وہ ہندوستان سے
استدعا کرتے ہیں کہ اپنی پاک تہذیب کے گنگاجل کا برتن تم بھی صاف کرکے تیار رکھو کیونکہ تمہاری ہی طرف دنیا کی نگاہ ہوگی۔

ایک طبقہ (اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے) ہندوستان میں بھی ایسا ہے جو اسی مغربی خونیں ناٹک کے تماشہ کو ہندوستان کے اسٹیج پر بھی
دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب کا گنگاجل مغرب کے گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کرے خود اسی گناہ
مغرب کا پیرو ہونا چاہتا ہے۔ ایک اور طبقہ مغربی تہذیب سے اس قدر سیر ہے کہ اس کے معیار زندگی کے علاوہ اس کی علمی تحقیقا
تنظیمی اصول پر بھی اسی قومی خود غرضی کا خونیں رنگ دیکھتا ہے اور فرط نفرت سے اوسے چھونا بھی پسند نہیں کرتا۔ ایک گروہ اس
(مشرق تو مشرق ...) کے اصول کا ایسا گرویدہ ہے ... بدی پر مہاتما گاندھی کو بھی شرم آتی ہے اور دوسرا گروہ اپنے کھلونے کے

نیام میں انجان بچوں کی طرح اپنے کھلونے کی تلوار ہی کو کھڑکھڑاتا ہے اور یہ بھی مغربی اسلحۂ جنگ کے دیو کے سامنے ایک فرقہ تمدن اور سیاست کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں ہے۔ دوسری طرف مذہب کی آڑ میں وہ جوتی پیزار کی نوبت ہو رہی ہے کہ بایدوشاید۔ ان سے نرالا ایک تیسرا طبقہ ہے جو ان دونوں پر نظر تضحیک ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ تمدن اور سیاست کے مسائل میں مذہب اور روحانیت کا گزر نہیں ہے۔ انہیں تو خدا کا دیا ہے مرت حوالہ کر دینا چاہئے۔ اور جائے غور ہے کہ ہر طبقہ میں ہندوستان کے برگزیدہ اور قابل اصحاب شامل ہیں جن کی حب الوطنی اور نیک نیتی پر شبہ کرنا بھی بیجا ہے

مادی طاقت اور روحانی طاقت کے تضاد کا نظارہ ایک مرتبہ راون اور رام کی شکل میں آپ کے ملک میں بیشتر بھی دیکھا جا چکا ہے راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھکر بھبیکھن جیسے راسخ الخیال اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے مادہ نیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر جس مہاراج رام کے جواب کی طرف کان ہم اور بالخصوص مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہی نہ صرف ہمارا بلکہ کل دنیا کا معیار ہونا چاہئے وہی گنگا جل ہے۔ جسے آپ مغرب کے خونین گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں یا دوسرے استعارہ میں یہی وہ "نولکھا ہار" ہے جو مادہ گیتی کی پرستش کرتے وقت اس کے گلے میں پہنا سکتے ہیں۔ مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اس کے اجزا تفصیل اے بھبیکھن سنو:۔

सौरज धीर जाहि रथ चाका । सत्य शील दृढ़ ध्वजा पताका

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جس کے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔

बल विवेक दम परहित घोरे । क्षमा दया समता रज जोरे

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پر اپکار، یہ چار گھوڑے ہیں، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں

ईश भजन सारथी सुजाना । विरत चर्म सन्तोष कृपाना

ایشور کا بھجن اوس رتھ کا چلانے والا ہے اور جو ہتھیار ہیں سو اوس کی ڈھال بیراگ اور اس کی تلوار قناعت ہے

दान परसु बुधि शक्ति प्रचण्डा बर विज्ञान कठिन कोदण्डा

فیاضی اس کا پھرسا اور عقل سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اس کی مضبوط کمان ہے۔

अमल अचल मन त्रोन समाना सम यम नियम शिली मुख नाना

پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصول اخلاق ذاتی) اور نیم (اصول اخلاق تمدنی) سیر ہیں۔

कवच अभेद बिप्रपद पूजा पहि सम विजय उपाय न दूजा

زرہ بکتر سچے برہمن کی خلوص دل سے پرستش ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

सखा धर्म मय अस रथ जाके   जीतन कहँन कतहुँ रिपु ताके

محب من، جسکے پاس اب دھرم کا رتھ ہے اس کی فتح کے لئے کہیں دشمن ہی نہیں ہے۔

یہ سات چوپائیاں ساری مشرقی تہذیب کا لب لباب ہیں۔ میری دلی منشا تو یہ تھی کہ بس انھیں کو پیش کر کے بلا کسی تفسیر کے ہماں ہم [illegible] مگر چند وجوہ سے کچھ تفسیر لازمی ہے جس کو خاص اصول کے لحاظ سے نمبر وار درج ذیل کرتا ہوں:۔

سچائی اور محبت بہادری اور طاقت

پہلی چوپائی کا پہلا ہی لفظ بہادری ہے اور دوسری چوپائی کا بھی۔ پہلا ہی لفظ طاقت کا مترا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اہنسا کے اوس خیال کی جو بزدل بناتا ہے، گنجائش کسی قومی یا دنیاوی معیار میں نہیں ہے۔

مگر بہادری کے ساتھ سچائی اور محبت پہلی ہی چوپائی میں موجود ہیں اور طاقت کے ساتھ تمیز اور نفس کشی توام ہیں کہ کبھی بہادری محبت اور سچائی کا خون کرتے ہوئے کمزور کے گردن میں طوقِ غلامی نہ پہنا دے، اور دیو کی طاقت رکھتے ہوئے وہ کہیں واقعی دیونہ بنجا دے۔ مہاراج رام کی زندگی میں برابر یہی اصول کام کرتا رہا کہ کبھی کسی سے لڑائی نہ مول لینا۔ مگر جسوقت کسی نے (مثلاً پرسوام جی نے) چیلنج دیا تو "موت سے بھی رگھو نبسی نہیں ڈرتے" اسی ایک صدا کا بلند ہونا۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی سے مہاراج رام کا صلح کے لئے انگد کو راون کے پاس بھیجنا وغیرہ کتنے ہی ایسے نمونے موجود ہیں۔

تثلیث نفس۔ آہ مغربی دنیا کس فخر سے کہتی ہے کہ فرانس کی انقلابی تحریک کے یہی تین الفاظ نئی دنیا کے ترقی اور آزادی کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ آزادی، مساوات اور اخوت۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جاوے تو مغربی آزادی کے ساتھ بیچارہ مساوات کی بھی مٹی پلید ہوئی ہے۔ مغربی آزادی کے اس خیال کے توام ہوتے ہوئے بھی کہ ہم ہر حالت میں کسی نہ کسی قید میں ہیں قید کے توڑنے کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ مزدوروں کو مالداروں کے قید سے رہائی کا خیال، رعایا کو حکومت سے آزاد ہونیکا خیال، مذہب کو کتابی پابندیوں سے نجات پانے کا خیال، ایک قوم کو دوسری قوم کے تعلقات کے قید سے نکلنے کا خیال اس قدر دامنگیر رہتا ہے کہ ہر طرف توڑ پھوڑ اور کشت و خون برابر جاری ہے۔ غرضکہ اپنی زنجیر کو توڑ کر دوسرے کے پیروں میں جکڑنا یہی عملی اثر اس آزادی کے خیال نے مغرب میں ہر جگہ آشکارا کر رکھا ہے۔ مغربی اقوام کے خون آلودہ ہونے کی باعث یہی ہے۔

مساوات کا خیال نہایت اچھا تھا مگر وہ بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا کہ اپنے سے بہتر حیثیت میں کسی کو نہ دیکھ سکے۔ آہ، کب مغرب نے اس خیال سے کمزوروں کو اپنے برابر بنانے میں کام لیا؟ اور اخوت بیچاری تو تیسرے درجہ پر رہ گئی ہے اور بقول ٹیگور کے قومی خیال میں اُسے وہ جگہ ملی جو محالفۂ قزاقاں میں برادرانہ اصول کو اپنا شیرازۂ تنظیم محض اس لئے مستحکم کرنے میں ملتی ہے کہ دوسروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ ہو سکے۔ کیا کبھی سفید مغرب نے کسی رنگدار قوم کو اپنا بھائی سمجھا؟ کیا مغرب کی مختلف اقوام میں ایک دوسرے سے یگانگت قائم رکھنے کا خیال مستحکم ہے؟ کیا مزدور مالدار کو اور محکوم حاکم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تلسی داس جی کے وقت

بالا میں بھی مساوات ہے مگر اس کے ساتھ عفو اور رحم بھی شامل ہیں۔ عفو خود بتلاتا ہے کہ جس نے ہم پر ظلم کر کے مساوات سے باز رکھا اسے بھی مساوات کے حاصل ہو جانے پر معاف کیا جاوے تاکہ سینہ میں کینہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ مہاراج رام نے بالی کے مارنے کے بعد بھی عفو کا خیال رکھا اور ایسا ہی ہر وقت کرتے رہے۔ اس میں مساوات بھی مل جاتی ہے اور دوسرے کی مساوات بھی زائل نہیں ہوتی۔ مگر آج فرانس اپنے انقلاب کے خونیں نقشہ کو جس میں انسانی سر مولی اور گاجر کی طرح بے رحمی سے بلا کسی عفو و امتیاز کے خیال کے کاٹے گئے، پھر بطور معیار پیش کرنا باعث شرم نہیں خیال کرتا ہے۔ اسی طرح عفو کے ساتھ سزا دینے والا بھی ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ :-

Human power then looks like God's when mercy seasons justice

(انسانی طاقت اس وقت خدائی طاقت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جب انصاف کے ساتھ رحم ہو) دوسرا خیال جو تلسی داس جی مساوات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ "رحم بر حال دیگران" یعنی جو اپنے سے نیچے ہیں انھیں اٹھانے یعنی سیوری دنشاد کوئی دکرات پر رحم (दया) کرنا کہ وہ بھی اگر تمھارے برابر نہیں تو کم از کم اپنی موجودہ حالت سے تمھاری امداد اور محبت کے سہارے اوپر اٹھ سکیں۔

البتہ تلسی داس کے خیال میں "سب دہاں بائیس پنسیری" والی مساوات کبھی نہیں تھی۔ ہندوستانی نظام تمدن میں روحانیت کو پہلا، جسمانی قوت کو دوسرا، مال و تجارت کو تیسرا اور دیگر خدمات کو چوتھا درجہ دیا گیا تھا مگر یورپ میں بجز مال و دولت کے اور کسی چیز کی پرستش ہی نہیں ہے۔ روحانیت کو تو کوئی کوڑی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ انتخاب میں بھی صرف مالی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مالوی جی نے بڑے لاٹ کی کونسل میں کہا تھا کہ آپ کے قاعدۂ انتخاب نے تو ہندوستانی تہذیب کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ لالہ بھگوان داس نے بھی کچھ کوشش کی تھی کہ بیچاری روحانیت کو بھی کوئی جگہ مل جاوے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب تک مختلف طبائع موجود ہیں یہ اندھا دھند کی مساوات چل نہیں سکتی یہ بات اور ہے کہ آپ حیوانی طاقت یا زبانی شور و غل (Eloquence) یا سرمایہ (Capital) یا غوغا کرنے والی جماعتوں کے اتحاد کو مقدم سمجھیں اور بیچاری روحانیت کو مؤخر سمجھ کر ٹھکرا دیں میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کل دنیا کو بجائے آزادی و مساوات و اخوت کی تثلیث لفظی کے تلسی جی کی تثلیث لفظی (क्षमा، दया، समता) عفو و رحم و مساوات کو قبول کر کے اپنے خون آلود ہاتھوں کو پاک و صاف کر ڈالنا چاہئے۔

قومی جھنڈا

قومی جھنڈے کی پکار (کچھ عرصہ ہوا) ہر طرف بڑے زور سے تھی اور اس کے متعلق نئے نئے خیالات کا اظہار ہوا تھا مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس میں قومی تنظیم کا شائبہ دکھلانے کی غرض سے مختلف فرقوں کے لئے مختلف رنگ دکھلائے جاویں اور قومی مساوات و ملی آزادی کا خیال دلانے کے لئے اسمیں چرخہ کا نقش ہو۔ مگر صاحبان، قومی جھنڈے کے الفاظ اور نشانات محض مغرب کی نقل ہیں جس کے لحاظ سے کسی بیرونی مادی شے کے تصویر ہونا ضروری ہے۔ کاش

کسی وقت ایک ہی مذہب رہگیا یا سب کے سب ہم مذہب ہوگئے یا چرخہ سے قوم آگے بڑھ گئی تو یہ جھنڈا پھر بدلنا پڑے گا - دیکھئے تلسی جی قومی جھنڈے کے لئے کیا بتلاتے ہیں :-

جھنڈے پر ([illegible]) सत्य، शील، [illegible] لکھا ہو - اگر کوئی تنظیم رنگوں کی رکھی جاوے تو ستیہ (सत्य) کا رنگ سفید اور شیل (शील) کا سُرخ ہو اور کا لفظ ہر دو پر بسیط رہے - اس طرح قومی دماغ کے لئے سچائی کا اصول اور قومی دل کے لئے محبت کا جذبہ معیار بنکر قومی روح کو پاک بنا دیں گے اور دنیا کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہی جان برائٹ (John Bright.) کا قول پیش کریں گے کہ جو عظمت اخلاق پر قائم نہیں ہے وہ کبھی مستحکم نہیں ہوسکتی -

مساوات و آزادی و اخوت یہ تین کیا، دنیا کے کل اخلاق کے افرادی صفات انھیں دو الفاظ सत्य اور शील میں شامل ہوسکتی ہیں اور ہیں - مگر ہر دو کا مستحکم اور توام ہونا ضروری ہے کیونکہ راستی "فتنہ انگیز" ہوسکتی ہے اور ایسا انسان کو ناراستی کے مقابلہ میں بزدل بنا سکتی ہے - اسلئے معیار صرف ستیاگرہ نہ ہوکر सत्य शील [illegible] ہونا چاہئے ورنہ خونیں ہنگامے اور چوری چورا کے واقعے ہونا ہر وقت ممکن ہے - آہ، دنیا ابھی تضحیک کی نظر ستیاگرہ پر ہی ڈال رہی ہے اور نہ معلوم کہ اس اصول کے مروج ہونے کے لئے ابھی کتنا زمانہ چاہئے - تلسی کا معیار ستیہ شیل آگرہ (सत्य शील [illegible]) تو بیشتر لوگوں کو اجتماع ضدین ہی معلوم ہوگا - مگر معیار ہمیشہ بلند ہی ہونا چاہئے - اگر کسی قومی جھنڈے پر یہ الفاظ ہوں وہ قوم ایمانداری کے ساتھ اس جھنڈے کے نیچے ہوکر آگے بڑھے تو بجائے اس خوف کے جو مغربی اقوام کیجانب سے مشرقی اقوام میں پھیلتا ہے ایسی قوموں کا استقبال ہی ہر جگہ ہو اور یہ مسئلہ کہ پہلے مذہب (پادری) پھر تجارت اور اس کے بعد قومی سلطنت کا جھنڈا چلتا ہے، دنیا سے مٹ جاوے اسی معیار کی وجہ سے رام کا استقبال بیجا پور میں ہوتا ہے اور (Annexation Policy) کا پتہ نہیں - بال کا راج سگریو کے اور فتح لنکا کے بعد لنکا کا راج بھبھیکھن کے سپرد ہوتا ہے، نہ کہ دوسری قوم کے مال و متاع سے اپنی شکم سیری اور مزے اڑانے کے خیالات کا پیدا ہونا - کیا اچھا ہوتا اگر بغیر امتیاز کے مساوات کے بجائے سچائی کا برتاؤ ہوتا - مورخ البیرونی ہندوستان کے قومی شیرازہ کی تنظیم کو عدم مساوات مگر راستی کے اصول پر دیکھکر کہتا ہے کہ گو مساوات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت دوسری جگہ بہت جلدی ہوئی مگر یہاں ہندوستان میں باوجود عدم مساوات کے ہر شخص اپنی جگہ پر خوش ہے اور کوئی خاص بےچینی نہیں پائی جاتی -

ایشور ایشور کا خیال تہذیب کا خاص جزو ہوتا ہے - دراصل وہی تہذیب کے رتھ کا چلانے والا رتھ بان ہے - ابھی چند ہی روز ہوے کہ سر اولیور لاج (Sir Oliver Lodge) جیسے زبردست سائنس داں نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ جس روحانیت کی چوٹی پر ایمان اپنے پروں کے اڑان سے پہونچتا اسی جگہ سائنس بھی اب پہونچ رہی ہے اور روحانیت و سائنس کا تضاد اب مٹتا جاتا ہے - اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے

جیسے مفلس ملک کے لئے سائنس کے ذریعہ بہت سی فلاحی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے کیونکہ بقول تلسی "بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا" کوری روحانیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ مگر کتنا ہی بڑا سائنسدان یا مدبر کیوں نہ ہو، دنیا اب سمجھتی جاتی ہے کہ بلا خدا کے تنہا اپنے برتے پر ناخدائی کا دعویٰ محض باطل ہے۔

کسی کی پرستش ہو؟ تلسی داس نے [illegible] भेद विप्र पद पूजा پر بہت زور دیا ہے اور بعض لوگ اس وجہ سے اُن کو بُرا کہتے ہیں۔ مگر विप्र کون ہیں؟ وہ لوگ جنھوں نے روحانیت کے لئے سب کچھ ترک کر دیا ہے اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج بھی کیا وجہ ہے کہ سوامی وویکانند، سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی کو دیکھکر یورپ و امریکہ متحیر ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ملک ایسا ہے جہاں پیغمبر پیدا ہوتے ہیں تو وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایسے افراد ہی تو دراصل विप्र ہیں اور روحانیت و ایثار کی پرستش ہی دنیا کی نجات کا وسیلہ ہوسکتی ہے۔ افلاطون بھی ایسے ہی لوگوں کی تیاری کا اپنے مکالمہ میں سبق دیتا ہے اور انھیں کو [illegible] کہتے ہوئے انکی سلطنت کو سب سے بڑھکر مانتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں واضعان قانون ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے اور سلطنت کا کام جسمانی اور دماغی قوت رکھنے والے چھتریوں کے سپرد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی چیز کی پرستش ضروری ہوتی ہے یا رپمینٹ کی حکومت میں زبان (لسانیت) اور مال و دولت کی پرستش ہوتی ہے یا اور طرح کی غیر مہذب حکومت میں مادی قوت کی علانیہ پرستش۔ سر فریڈرک ہریسن صاحب مرتے مرتے اس افسوس میں رہے کہ آٹھ سو برس کی ترتیب کے بعد بھی انگلستان میں کاروبار سلطنت کے لئے قابل افراد کا چناؤ ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی اپنے انگریزی اخبار پیوپل میں لکھا تھا کہ ولایت میں بھی بے دوش اور بنی نوع انسان کو یکساں سمجھنے والے شخص کے لئے پارلیمنٹ کے چناؤ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی کی نقل مطابق اس سے بھی نہیں بلکہ اس سے بھی خراب تر حالت ہندوستان میں ہے۔ بزرگان قوم کو نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے اور بے نفس، بے لوث مگر بے تروت اصحاب کو اپنے نظام سلطنت میں خاص جگہوں پر مامور کرنے کا انتظام ابتدا ہی سے کرنا چاہئے۔

مغربی دنیا میں سوشلزم کی وہ لہر ہے کہ "کل مال کل قوم کا ہے" یہ مسئلہ کتنوں کو متوالا بنائے ہوئے ہے۔ مگر دیکھئے روس میں لینن جیسا شہرہ آفاق مدبر بھی اس مسئلہ کو سال بھر تک بھی نہ چلا سکا، کیونکہ پھر بقول ایک دہقانی مقولہ کے کہ "سانجھے کی کھیتی کو گدہا بھی نہ کھاوے" کوئی ترقی کی پرواہی نہیں کرتا۔ اور کاہلی کے سوا جدوجہد کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہندوستانی یا مشرقی سوشلزم کیا تھا۔ دان یعنی سخاوت پر زور دینا۔ گو اس اصول کا استعمال فی زمانتا خراب کیا، نہایت ہی خراب طریقہ پر ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر یتیم، ہر بوڑھے اور ہر لولے لنگڑے اندھے کا سہارا ہمیشہ دان ہی رہا ہے۔ کسی غیر ملکی پادری نے اس کرشمہ کو کہ یہ کل کام بلا مدد گورنمنٹ کے ہوتا ہے، نہایت استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو طبقے زیادہ کماتے ہیں ادنہیں پر سخاوت ایک مذہبی فرض ہے، اور اسی لئے غریب کے منہ سے بجائے بددعا کے ایسے نظام کے حق میں دعا ہی نکلتی ہے۔ ہاں سخاوت کا جائز انتظام کرنا اور اسکو قومی فرض بنانا، ایک ضروری ذریعہ اس کی درستی کا ہے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کہیں مغرب کی نقل میں کشمکش شروع ہو جاوے اور سخاوت کے بجائے

توجہ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ میں تو ہندو نظام کو Voluntary Socialism (طبعی سخاوت) کا نام دیتا ہوں جس میں جہاں دولت ضرورت سے زیادہ ہوئی کہ دان میں تقسیم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ راجہ ہرش جیسے سخی بادشاہ ہر تیسرے برس اپنا کل خزانہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس نظام کے ہوتے شخصی کوشش بھی نہیں مٹتی اور سوشلزم کا مفاد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

سر فریڈرک ہریسن صاحب نے جو نوے برس سے زائد عمر کے ہو کر ابھی حال میں راہی ملک عدم ہوئے ہیں، اپنی آخری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیسویں صدی کا غلط خیال کہ قدرت میں صرف "طاقت کی فتح" کا اصول کام کرتا ہے اب ٹلتا جاتا ہے اور یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ قدرت میں بھی ایثار کا اصول بچوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ لا محدود طریقوں پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہذا دنیا کا رجحان اب بجائے دوسری قوموں کو زیر کر کے ان سے اپنی شکم پوری کرنے کے، باہمی امداد و اتحاد کی طرف ہونا چاہئے۔ امریکہ کے اخباروں میں یہ پکار برابر سنائی دیتی ہے کہ مادی ترقی کی دیوانہ وار دوڑ میں اسکو دلی اطمینان اور سکون نہیں ملا۔ ایک شخص نے ابھی حال میں امریکہ سے لکھا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے تیار کردہ مال کے خریدار کم ہو جاویں اور سادگی کی ترقی ہو تو ہمارے سب مادی ترقی کے سامان، خوشنما باغ، عالیشان مکان اور بڑے بڑے دعوتی جلسے کہاں ہوں گے؟

کچھ عرصہ ہوا کہ جرمنی اور امریکہ سے مہاتما گاندھی کو دعوت دی گئی تھی کہ مغرب لڑائیوں اور مشینوں کی حیوانی زیادتیوں سے تنگ آ گیا ہے۔ بس آپ تشریف لاویں اور اپنی پاک ہدایت سے ہماری مدد کریں۔ آہ کیا حسرتناک جواب مہاتما جی کو دینا پڑا کہ میرے ساتھ میرے ملک ہی کی تعلیمیافتہ جماعت نہیں ہے اور جب تک یہ جماعت میرے ساتھ ہو کر میرے ملک کی آزادی حاصل کر کے میرے اصولوں کو مضبوط نہ ثابت کر سکے، میں اپنی موجودہ کمزوری کی حالت میں باہر نہیں جانا چاہتا۔

میری یہ منشا نہیں ہے کہ جائز اختلافات بھی باقی نہ رہیں اور نہ اندھے کی سی تقلید ہو مگر کم از کم قومی معیار کیا ہو، اس پر ضرور اتفاق ہونا چاہئے۔ اور اس معیار کے قائم کرنے میں ملک اور قوم کو تلسی داس جی کی رامائن سے ضرور سبق لینا چاہئے۔

راج بہادر ملگوڑا - ایم اے
ال ال بی

بلادِ مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے

”آنسہ عنبرہ سلام“ ایک مشرقی ناکتخدا خاتون نے حال ہی میں بلاد انگلستان کی سیاحت کرکے اپنے جو جذبات بیروت کے عربی مجلہ کشاف میں شائع کئے ہیں وہ ناظرین نگار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ ان میں بلادِ یورپ کی کوئی نئی داستان صنعت و ارتقا پنہاں ہے، بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب مشرقی خواتین کے زاویۂ نگاہ میں بھی کتنا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ حالات بہت دلچسپ ہیں اور متاثر ہونے والے کے جذبات اس سے زیادہ دلکش ہم کہاں ہیں اور دنیا کہاں جارہی ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں اور دنیا کیا کررہی ہے؟ یہ ہے اصل روح اس تاثر کی جس کے ماتحت ”آنسہ عنبرہ“ نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔

نیاز

جس وقت میں نے بلاد انگلستان میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کو صرف ”ہیبت و حیرت“ کے الفاظ سے تعبیر کرسکتی ہوں۔ چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے مکانات، وسیع تجارتگاہیں، خاموش ہجوم، نظم و اہتمام، صفائی و پاکیزگی، اور اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیات جو بیک وقت انسان کو متاثر کرتی ہیں، ان کا نام ہے بلاد انگلستان۔ اوّل اوّل تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن جب چند روز تک قیام کرنے کے بعد میں نے یہاں کی اسلوب زندگی اور اجتماعی روح کا مطالعہ کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ایک اجنبی اوّل اوّل یہاں کی فضا اور یہاں کے آسمان و زمین میں ہیبت ہی ہیبت محسوس کرتا ہے۔

حریتِ شخصی

انگلستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت وہاں کی حریتِ شخصی ہے جو وہاں کے ذرہ ذرہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس سے ہر شخص اس کے نہایت وسیع معنے میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اس سے وہاں کے نظام، وہاں کے آداب عامہ اور امن عام میں خلل نہ پیدا ہو۔ وہاں ہر شخص اپنی رائے اور اپنے قول و عمل میں آزاد ہے اور اس کا بیباکی سے اعلان کرسکتا ہے۔ جو چاہو کرو، جو جی میں آئے کہو کیونکہ حریت وہاں کی دیوی ہے اور اس نے اپنے ہر بندہ کو بالکل آزاد و مطلق العنان چھوڑ رکھا ہے۔ ہائڈ پارک میں جاؤ تو تم دیکھو گے کہ اتوار کے دن ہمیشہ اور باقی ایام میں بھی کبھی کبھی خطیبوں کا ہجوم ہوتا ہے، کوئی یہاں کھڑا ہوا سیاسیات انگلستان پر نکتہ چینی کررہا ہے، کوئی وہاں اشتراکیت پر لکچر دے رہا ہے، کوئی نوضعیت کی تعریفیں کررہا ہے، کوئی ملوکیت کے خلاف زہر اگل رہا ہے، کوئی گلے میں صلیب ڈالے ہوئے تعلیم دینی کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مذاہب دنیا کے لئے مصیبت ہیں اس لئے صرف عقل کے کہنے پر عمل کرو۔ پھر کوئی خطیب ایسا نہیں جس کے گرد سننے والوں کا ہجوم نہ ہو اور اس کے لکچر پر رائے زنی نہ ہورہی ہو۔ پھر پولیس دیکھ رہی ہے، آجا رہی ہے، کھڑے ہوکر ان تمام مواعظ و خطبات کو سنتی ہے، لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ پیدا ہو تو پھر ادنیٰ سا اشارہ اُسکے

ہاتھ کا سارے خطرات کو دور کردیتا ہے اور مجمع اس کی ایک سیٹی سے منتشر ہوجاتا ہے

تنظیم عمل

اس سے زیادہ محبوب چیز اہل انگلستان کے لئے اور کوئی نہیں۔ گھر کی معیشت میں، گھر سے باہر کی زندگی میں مشاغل معاش میں اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں الغرض ہر جگہ اور ہر وقت تم ان کے اندر ایک تنظیم عمل پاؤگے، ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت پر کام کی پابندی یہ اُن کے نظام عمل کی روح ہے جس سے کبھی کوئی انگریز بیگانہ نظر نہیں آسکتا۔

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کے قریب جہاں دو تین سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم ہوا اور انھوں نے صف بنالی، پھر ہر نیا آنیوالا اسی صف کے آخر میں شامل ہوتا جائیگا اور کبھی وہ اس کی کوشش نہ کریگا کہ جھک کر یا گھس پل کر پہلے ٹکٹ حاصل کرے، اُن کی ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خلاف اصول کیونکر کوئی چل سکتا ہے۔

چوراہوں پر پولیس والے نے ہاتھ اٹھایا اور مسافروں، گاڑیوں اور موٹروں کا سیلاب دفعۃً رک گیا، اُس نے ہاتھ نیچے کیا اور پھر اسی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ سب چل پڑے ایسا عجیب وغریب منظر ہوتا ہے کہ بے اختیار واہ منہ سے نکل جاتی ہے۔ باوجود شدید ازدحام اور کثرت آمدورفت کے وہاں نہ کوئی ہنگامہ نظر آتا ہے نہ کوئی شور وغل، ہر کام سکون کے ساتھ ہورہا ہے، ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور یہ سب نتیجہ ہے انتظام معیشت کا اور فرض شناسی کا، ایک مشرقی انسان کی طرح نہ اُن کے ہاں کاہلی کی دیر ہے نہ گھبراہٹ کی جلدی۔ تم اگر کسی ضرورت سے ڈاکخانہ میں جاؤگے تو وہاں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہجاؤگے اور تم کو یقین ہو کہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، لیکن اگر تم صبر کے ساتھ صف میں شامل ہوگئے تو پھر دیکھوگے کہ چند منٹ کے اندر تم سے آگے کا ہجوم چھنٹ گیا ہے اور تمہارے بعد اس سے زیادہ لمبی قطار آدمیوں کی بن گئی ہے۔ وہاں یہ رات دن کا مشغلہ ہے۔ اور ہر شخص اس ملک کی زندگی کا عادی ہے۔

تم کسی بڑے مخزن (اسٹور ہاؤس) یا تجارتی ذخیرہ کی دوکان میں پہونچ جاؤ اور وہاں کے انہماک کو دیکھو۔ تم یہ معلوم کرکے حیران رہجاؤگے کہ ایک دن میں وہاں ۴ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہاں دروازہ سے داخل ہوتے ہی تم کو مختلف تختیاں لگی ہوئی نظر آئنگی جو مختلف سمتوں کا حال بتاتی ہیں اور ہر سمت میں مختلف قسم کے مال کے ذخیروں کا پتہ بتاتی ہیں پھر تم ذرا آگے بڑھے کہ وہاں کے خوش سلیقہ ملازم (مرد و عورت) شگفتہ روئی کے ساتھ آئے اور تمہاری ضروریات کے متعلق تمام آسانیاں بہم پہونچائیں۔

ٹیلیفون سڑک پر ہر ہر جگہ تم کو ملینگے اور فوراً تم کو اس مکان کے نمبر سے ملا دینگے جہاں سے تم گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ زمین کے اوپر نیچے یہاں ریل کا ایسا ہی جال ہے جیسے جسم انسان میں شرائین و ورید لیکن ہر گاڑی میں تمام تفصیلی نقشے متعدد اشارات لیے ہوئے موجود رہتی ہیں جس سے ایک شخص بہ آسانی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے، پھر یوں بھی اُن نقشوں کے دیکھنے کی ضرورت کم ہوتی ہے۔ ریل کے ملازم خود تمہاری مدد کرنے کے لئے ہر وقت ہر جگہ غلاموں کی طرح موجود رہتے ہیں۔

انگلستان کا باشندہ اپنے قوا کو کبھی بیکار و معطل نہیں رہنے دیتا اور پوری ہمت کے ساتھ وہ ان سے کام لیتا ہے۔ ا
یہی نظام عمل ہے کہ وہ حفظ نشاط کے لئے کافی آرام بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ تم دیکھوگے کہ ابتدائی مدارس سے لیکر

کالجوں تک یہ دستور ہے کہ ۹ بجے صبح سے قبل وہاں تعلیم شروع نہیں ہوتی - اور کارخانے والے مجبور ہیں کہ اتوار اور نصف دن سنیچر کا تعطیل کے لئے وقف کر دیں - اسی طرح ہر طبقہ کے لوگ سالانہ تعطیل چند دن کی نہایت لطف سے مناتے ہیں جس میں مالک و مخدوم سب برابر ہیں ایک خاتون میری دوست ہیں جن کے ایک چھوٹا بچہ ہے اور خود ہی ان کو گھر کا سارا انتظام اور بچہ کی نگرانی کرنی پڑتی ہے، لیکن اتوار کے دن وہ خود بھی تعطیل مناتی ہیں اور ایک دن کے لئے کسی عورت کی خدمات حاصل کر لیتی ہیں اس راحت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعطیل کے بعد لوگ نہایت نشاط اور تازہ قوت کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اور ان کو کوئی تکان نہیں ہوتی -

ریاضت یہاں کی زندگی کا سب سے نمایاں منظر اُن کا شوق ریاضت ہے - انگلستان کا ہر باشندہ مرد ہو یا عورت دیگر ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ریاضت کو بھی ضروری جانتا ہے اور کسی نہ کسی ریاضت کے کلب کا ممبر ہے - میں نے سانٹ پول کالج میں لڑکیوں کو ایسی ایسی ریاضت کرتے دیکھا کہ کبھی میں خیال بھی نہیں کر سکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لڑکیاں صحیح و توانا، خوبصورت، اور مستعد ہوتی ہیں - لندن اور اس کے قرب و جوار میں اس قدر کثرت سے اور اتنے بڑے بڑے میدان ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اُن میں آ سکتے ہیں - اور روزانہ یہاں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی میدان ایسا نہ ہوگا جہاں تمہیں لوگوں کا ہجوم نظر نہ آئے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ اس کا لطف نہ اُٹھائیں - چنانچہ جب کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان کوئی مقابلۂ ریاضت ہوتا ہے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے سینہ یا موٹر پر کیمبرج یا آکسفورڈ میں سے کسی کا نشان نہ لگائے ہوئے ہو - پھر یہ نہیں کہ اس مقابلۂ ریاضت کا نتیجہ بد دلی یا رنج و ملال میں ظاہر ہوتا ہو، بلکہ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کوئی تنغص پیدا نہیں ہونے دیتے - پھر اسی کے ساتھ ایک بڑی جماعت بازی لگانے والوں کی ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس قدر کثرت ہے کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے تو بھی آدمی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے - گھوڑ دوڑ یا دوسرے کھیل تماشوں کا کیا ذکر ہے -

تفریح چونکہ یہ قوم اس قدر نشاط طلب ہے اس لئے فطرت نے ان کے ملک کو بھی ویسا ہی خوشنما اور دلچسپ بنایا ہے یہاں باغوں اور تفریح گاہوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ہر شخص نہایت آسانی سے ہر جگہ کارخانہ کی منہمک زندگی سے نکل کر ان میں پہونچ سکتا ہے - یہاں کا بڑا پارک ۴۰۰ ۲ ایکڑ زمین کو محیط ہے جس میں گھاس سے سرسبز تختے، شاداب درخت، فوارے، خوبصورت پھول اور ہر وہ چیز جو روح کو راحت پہونچا سکتی ہے یہاں اور تمام پارکوں میں پائی جاتی ہے، تالابوں کی بھی اتنی ہی کثرت ہے جس میں طیور آبی اور کشتیوں کی تعداد غالباً برابر رہتی ہے - یہاں کی چڑیاں اس قدر مانوس ہو گئی ہیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ سے اپنی غذا اخذ کر لیتی ہیں -

پھر اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھو گے کہ اگر ایک طرف باغ یا پارک، سبزہ، تالاب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے، تو دوسری طرف ریاضت گاہیں کھیل کود کے میدان اور سنیما و تھیٹر وغیرہ بھی ویسے ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں چنانچہ تم یہ سنکر غالباً حیرت کرو گے کہ یہاں ہر ہفتہ ۱۵ ملین (ڈیڑھ کرور) آدمی سنیما میں جاتے ہیں اور یہی حال تھیٹروں کا ہے - بعض بعض تھیٹر ایسے ہیں جن کو شت

تم کو آج درخواست کرتے پر ایک ہفتہ کے بعد ملیگا، گویا ایک ایک ہفتہ پہلے سے لوگ اپنی جگہ مخصوص کرا لیتے ہیں یہی حال رقص و نغمہ کے شوق کا ہے کہ وہاں کی تمام رقص گاہیں آدمیوں سے بھرجاتی ہیں اور روزانہ نئے نئے طریقے رقص کے ایجاد ہوتے رہتے ہیں، پھر یہاں ہر جگہ لاسلکی کا بھی انتظام ہے جس سے ہر شخص اپنے گھر بیٹھے گانا سن سکتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر کثیر مصرف کے وہ اتنا روپیہ بھی بچا لیتے ہیں کہ جا کر دوسرے ملکوں کی سیر کریں۔

انگریز جس طرح اپنی خانگی زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسی طرح وہ باہر کی زندگی کا بھی شیدا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی روشن دن گزر جائے اور اس سے لطف نہ حاصل کیا جائے چنانچہ گزشتہ عید فصح کے دن مضافات لندن میں جانے والوں کی تعداد ۴ ملین تھی اور یہ بھی اُن کی جو گھوڑے گاڑیوں کے ذریعہ سے گئے، ریل، ٹراموے اور موٹر سے جانیوالے ان کے علاوہ تھے صرف واٹرلو اسٹیشن پر جہاں ۲۴ پلیٹ فارم ہیں، ہجوم کی یہ حالت تھی کہ دو میل کے طول میں انسانی صف قائم تھی، جتنا حصہ آگے کا ختم ہوجاتا تھا اخیر میں پھر اتنے ہی آدمی بڑھ جاتے تھے یہاں تک کہ کامل ۲۴ گھنٹے یہ دو میل کی صف قائم رہی

خاموش وطنیت انگلستان کے وطنی مظاہر اس قدر خاموش ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے۔ جس دن یہاں عام ہڑتال ہوتی ہے اور ہر کام کرنے والے نے اپنا کام ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ ذرائع آمد و رفت بھی تمام بند ہوگئے تھے، وہ دن عجیب و غریب تھا کہ باوجود اتنی زبردست تحریک عمل کے شور و ہنگامہ کا کہیں نام تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے لندن پر سوگ طاری ہے اور ہر جگہ خاموش ماتم بپا ہے۔

خانگی زندگی انگلستان کا عائلہ یا خاندان ہمارے یہاں کے عائلہ سے مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ خاندان کے افراد یہاں باہم رابطہ تو رکھتے ہیں لیکن ایک نہیں ہوجاتے۔ میاں بیوی رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں، خانگی زندگی کو دونوں ایک دوسرے کی مدد سے بسر کر رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا پابند نہیں ہے۔ جس طرح مرد کام کرنے کے بعد باہر کلب وغیرہ میں تفریح کا مجاز ہے، اسیطرح عورت بھی آزاد ہے اور مرد کو اس سے بازپرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے گھر کی سیادت مشرق کی طرح یہاں بھی ماں ہی کے سپرد ہے۔

جب تک بچہ چھوٹا رہتا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ماں رہتی ہے اور جوان ہونے کے بعد اس کو اپنا گھر علیحدہ بنانا پڑتا ہے اور والدین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بچوں کی محبت انگلستان میں عید میلاد انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔ اور سارا لندن بالکل نئی چیز ہوجاتا ہے، زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس دن ہر چہرہ متبسم نظر آتا ہے۔ یہ عید بچوں سے متعلق ہے۔ اس لئے ماں باپ کی ساری مسرتیں اس دن سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔ بچوں کو تحفے دئے جاتے ہیں اور تمام دوکانیں لاکھوں قسم کے کھلونوں اور خوبصورت کتابوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تھیٹر اور سنیما میں بھی مخصوص طور پر وہی کھیل ہوتے ہیں جن کا تعلق اس عید سے ہو۔ چونکہ یہاں بچوں کی حفاظت، تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہے اس لئے غریبوں کے بچے بھی

ان نعمتوں سے محروم نہیں رہتے اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ کسی باپ نے اپنے بچہ کو سخت جسمانی سزادی تو اس کو چھ مہینے کی قید بامشقت اٹھانا پڑی۔

یہاں بچہ کی صحت وتربیت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔گاڑیوں میں بٹھا کر باغوں میں لیجانا، کھیل کود کی جگہوں میں پہونچانا، روز کا مشغلہ ہے۔بچوں کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبار بھی خاص طور سے شائع ہوتے ہیں اور نہایت کثرت سے۔بڑے بڑے اخباروں میں بھی بچوں کے صفحات جن میں عمدہ عمدہ تصویریں ہوتی ہیں بچوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔روزانہ جولا سلکی پروگرام موسیقی کا شائع ہوتا ہے اس میں ایک حصہ گانے یا قصہ کہانی وغیرہ کا بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے۔

پہلے سال کے بعد سے بچوں کے سامنے تصویر دار کتابیں ڈالدی جاتی ہیں، لڑکوں کے لئے علحدہ اور لڑکیوں کے لئے علحدہ اور ہر سال ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بچوں کی صفائی وستھرائی کا ان کے ہاں بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔غریب سے غریب شخص کے ہاں بھی روزانہ بچہ کو غسل دینا ان کی معاشرت میں داخل ہے تربیت کے لحاظ سے دو چیزوں کا درس سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔استقلال شخصی اور احترام غیر اور اسی اصول پر اس کی تعلیم وتربیت میں تدریجی ترقی پیدا کی جاتی ہے۔پہلے بچہ کو چلنا سکھایا جاتا ہے، پھر کھیل کود، پھر اپنے لئے ضروری چیزوں کی خریداری، اور پھر مدرسہ اور وہاں کی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر عملی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔یہاں کثرت سے ایسی انجمنیں ہیں جو ماؤں کو بچوں کے طریق تعلیم وتربیت کا درس مفت دیتی ہیں۔بچوں کے ساتھ اُن کو نہایت شدید محبت ہوتی ہے، راستہ میں، ریل میں، دوکان میں، باغ میں، الغرض کہیں کسی کا بچہ نظر آجائے وہ اس سے التفات کئے بغیر نہیں رہتے۔ایک بار میں بکاڈلی کے قریب تھی۔اور میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ تھی، جہاں ہجوم وازدحام کا وہ عالم کہ ایک انسان اس کو دیکھ کر آسانی سے حشر کا مفہوم جان سکتا ہے۔لیکن باوجود اس ہنگامہ کے جو شخص میرے پاس سے گزرتا تھا، بچی (میری چھوٹی بہن) کو ضرور پیار کرلیتا تھا۔

عہد شباب

سب سے پہلی وہ خصوصیت جو ایک انگلستان کی نوجوان لڑکی کو مرکز توجہ بنا دیتی ہے اس کا شاندار متناسب قد وقامت ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ملبوس جو پنڈلیوں کو عریاں رکھ کر جمال قامت میں رعنائی کو مکمل کردیتا ہے۔ممکن ہے کہ ایک انگریز لڑکی کا حسن وجمال کسی کی توجہ کو مائل نہ کرسکے، لیکن اس کے چہرہ کی زندہ تازگی ممکن نہیں کہ نگاہ کو اپنی طرف نہ کھینچ لے یہ تو اس کا خارجی پہلو ہے معنوی یا عملی پہلو کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ عجیب چیز ہے۔صبح ہوئی اور اپنے کام میں تیزی سے لگ گئی۔تم اسے کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس قدر جلد جلد اور سبک طریقہ سے کہ معلوم ہوگا کوئی تیتری ہے۔ انگلستان کی عورت درس وتدریس کی جگہ ایک بہترین مدرس دہادی ہے، تجارتی کارخانوں میں نہایت ماہر مہتمہ ہے اسٹیج پر بہترین رقاصہ ومغنیہ ہے اور پارلیمنٹ میں زبردست خطیب ہے۔

میں نے ایک عورت کو دیکھا جو بڑا خاندان رکھتی ہے اور اپنے شوہر، اپنی اولاد اور مہمانوں کی تمام راحتوں کی کفیل ہے۔
لیکن اسی کو میں نے کھیل کود میں مردوں سے بازیاں جیتتے، گھوڑدوڑ میں گھوڑے دوڑاتے، دریا میں کشتی چلاتے، خشکی میں موٹر چلاتے، غباروں میں اڑتے، پانی میں تیرتے، ساحل پر ریت میں لوٹتے، رقص گاہوں میں بہترین لباس کے ساتھ رقص کرتے اور سیاسی مجالس میں فصیح ترین تقریر کرتے بھی سنا اور میں حیران رہگئی کہ اس جامعیت کا کیا ٹھکانا ہے۔
یہاں عورت کی تعلیم بھی بالکل مردوں کی طرح مکمل ہوتی ہے اور دوسرے ممالک میں بھی مخصوص فنون حاصل کرنے کیلئے باقی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخر کار انتخاب ان کو مل گیا اور اب اس وقت ۹۹۷۷۹۶۲۱ مردوں کے مقابلہ میں ۱۲۹۴۳۰۴ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔

کریم النفسی اور تہذیب

انگلستان جانے کے بعد سب سے پہلے جو لفظ میں نے سنا وہ ([illegible]) تھا اس کا استعمال یہاں کے لوگ بار بار کرتے ہیں، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا جمالی پہلو ہی اُن کے سامنے رہتا ہے اور مشکل سے کبھی لفظ ([illegible]) اُن کے منہ سے سننے میں آئے گا جو اول الذکر لفظ کا بالکل ضد ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں نقائص بھی ہیں اور برائیاں بھی لیکن کریم النفسی کی مثالیں ان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ وطن پرستی، مفاد قومی، تعاون باہمی، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخص کی کریم النفسی پر دلالت کرتی ہیں اور یہاں کی آبادی کا غالب حصہ (مرد عورت دونوں کا) ان صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ یہاں کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوکان میں مال بیچنے والا، اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا پہلے شکریہ ادا کریگا اور پھر مال یا ٹکٹ دیگا۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ نوکر کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور ایک افسر اپنے ماتحت کی خدمت کا بھی اعتراف شکریہ سے کرتا ہے۔
دوسروں کی خدمت و امداد کے لئے یہاں کے لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رشمونڈ پارک میں ٹہل رہی تھی اور میری چھوٹی بہن جو بیمار تھی میرے بھائی کی گود میں تھی جس کو وہ بہت دیر سے لئے ہوئے تھا ہمارے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مرد بزرگ بھی جس کی عمر ۶۰ سال کی ہوگی مع اپنی بیوی کے ٹہل رہا تھا صورت و لباس سے یہ لوگ بہت معزز معلوم ہوتے تھے میرے بھائی نے تھک کر چاہا کہ بچی کو گود سے اتار دے، لیکن وہ اسے رہین تک نہ لایا ہوگا کہ اسی مرد ضعیف نے اپنی چھڑی اپنی بیوی کو دی اور بڑھکر آگے آیا اور بولا کہ "اب اس بچی کو گود میں لے کر چلنے کی باری میری ہے" جانوروں کے ساتھ بھی یہاں اسی لطف و رحم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دو سال انگلستان میں رہی لیکن اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جو دل کو بُرا لگتا۔
میں روزانہ صبح کو ریل میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کے لئے سفر کے لئے نکل جاتی، تاکہ میں یہاں کے لوگوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں۔ ریل میں ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں کے مرد عورت ریل میں بھی اپنا وقت ضائع کریں جسکو دیکھئے یا تو وہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتا ہوا ملیگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا یہی حال عورتوں کا ہے۔
ایک دودھ بیچنے والا نکلتا ہے اور ہر دروازہ پر دودھ کی بوتلیں رکھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نہ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اور نہ چوری

کا اندیشہ اُس کو ہوتا ہے۔ راستہ میں میز کے اوپر اخبار رکھے ہوئے ہیں، لوگ گزرتے ہیں قیمت وہیں رکھدیتے ہیں اور اخبار لیکر چلے جاتے ہیں پھر یہ دیانت و امانت پولیس یا قانون کے خوف سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اُن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان ایسی سخیف و ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف ان کی اعلیٰ تربیت ذہنی کا۔ برنارڈ شاہ کہتا ہے کہ "مدنیت نام ہے اسکا کہ تم میرا اور میری خصوصیات کا احترام کرو، میں تمہارا اور تمہاری خصوصیات کا احترام کرونگا" حقیقت یہ ہے کہ اہل انگلستان نے اس کو پوری طرح سمجھا اور نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے ملک کے اندر اسپر عمل کر رہے ہیں۔

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

(۲)

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند، کرۂ زمین کی گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو حب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آ رہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آ گیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہ جاتا - واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین، جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آ رہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہونچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے میں نہیں کہتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخر کار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ "مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہونچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو، کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں ——— زمین کے سمندر بہ بہ کر نیچے کی طرف آ سکتے ہیں ——— تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہونچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہونچ سکتی ہیں لیکن کس عالم میں اس کا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"

خاتون - "یہ کیونکر"

کپتان: وہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلا نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہونچ جائے اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلا ہی طرح چاند کی طرف کھنچا جا رہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلا کی طرح نہیں بلکہ ایک طایر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے وہاں پہونچ جاویں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ ٹپک دیا جائے۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکہ کے ساتھ رک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکہ کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو کپتان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش پیما سے کیا تھا جو زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اب میں گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے۔ اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو۔"

کپتان نے اس واقعہ پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکہ سے کسی کو ایذا پہونچی ہو تو معاف کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا سمت کی تعین چونکہ فضائر بسیط میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روزانہ اور اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں، پھر چونکہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جاکر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہرحال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن پہلے ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا، یہی حال مشروبات کا تھا، اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علحدہ کر کے رکھدی گئی تھیں، پھیپھڑا

ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہوگئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کرکے خون میں ملجاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "اتری عضو" ہوکر رہگیا۔

سردی ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جارہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھکر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہوگیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہونچتا ہے، ادائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن و منور عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعتہً نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہوگئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں بادل

غبارے جو یکسر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہنچ گیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں اس کے چہرہ سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کرکے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا اقدام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور بمشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر اُنھوں نے نور کا جال بنا دیا معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Meteors) تھے۔ نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہوگیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی، جہاز کے عرشہ پر آکر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہوگئے ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے بہت سے ٹکڑے کرکے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دیے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھ لئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیے جائیں گے۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۲۰ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت نصارت آج ازسرنو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہوجاتا ہے۔

سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے تعارف اسم زیادہ ہوگئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لیکر باہر پھینکدیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن اُن کی اور میری

حیرت کی حد نہ رہی جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں، باہر پھینکدیں اور اس تماشہ کا لطف اُٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کرکے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینکدیا اور کپتان نے پھر اُسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ شغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہوکر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف ۳ گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کردیا۔ بجلی کی روشنی ہوئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص طیار ہوگیا اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفعتہً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھکر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں۔ جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہونچنے والے ہیں، کیونکہ اونچے اونچے پہاڑ بڑے بڑے دریا وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہمکو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جارہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی و پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔

الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اُترا جسے وہاں کی زبان میں عوشان یعنی تختہ گل کہتے ہیں۔

باقی ——— باقی

نیاز

رشتہ کی ضرورت

فلسفۂ مذہب

مذہب اور قومیت

(بسلسلۂ گزشتہ)

یہ خیالات مسلمانوں کو عجیب معلوم ہوں گے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون عرب جب اپنے ملک سے نکلے تو ان کو ایک جماعت کعب احبار و عبد اللہ ابن سلام کے قوم کی ملی اور انھوں نے اسلام کو اس دانشمندی کے ساتھ یہودیت کا مماثل بنا دیا کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس تعلیم یہود یا باطل فقہ و حدیث کے تار و پود کو یہاں کھول کر رکھ دیا جائے مگر اس کا یہ موقعہ نہیں۔ شائقین میری دوسری کتاب تنزیل القرآن کا انتظار کریں۔ البتہ "قطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات" ایک سطحی نظر اسلام فقہ و حدیث و اسلام قرآن پر ڈالونگا۔ اور پھر ہر صاحب فکر و فہم سے پوچھونگا کہ وہ وقت کب آئیگا جب ہم فی الواقع یہ کہنے کے قابل ہوں گے۔ "وحسبنا کتاب اللہ" ایک زمانے میں مجھے بھی عمل حدیث و فقہ پر غلو تھا۔ مجھے لباس و وقت کی نامناسبت سے اکثر اور خصوصاً مغرب اور ظہر کی نمازیں قضا کر دینی پڑتی تھیں اور اس وجہ سے دل پر ایک قسم کا غبار رہوجاتا تھا کیونکہ مجھے خدا کی عبادت سے کبھی گریز نہ تھا۔ مگر جسدن سے میں نے قرآن کو اپنی ہدایت کے لئے کافی سمجھا اور نماز قرآن کو اپنا معمول بنالیا۔ میرے نے نمازیں ایسی سہولیت پیدا ہوگئی کہ میں خدا کی تسبیح و تقدیس اس سے بہتر و زیادہ کرتا ہوں جتنا میں نے پہلے کبھی کیا تھا۔ نہ مجھے ظہر و مغرب کے خلاف معاشرت و تمدن وعادت (جو اوقات میری طرح اکثر اصحاب کے بینچ و آرام و تفنن ہواخوری کلب کے ہوتے ہیں) اوقات نماز قرآن میں نظر آئے اور نہ مجھے اُن کے لئے افسوس کرنا پڑا اور جب میں چاہتا ہوں تو خدا کی قدرت سے متاثر ہوکر بے اختیار سجدے میں گر کر یا مودبانہ کھڑے ہوکر یا ہاتھ باندھکر اس کی تسبیح و تقدیس پر نماز کو ختم کر دیتا ہوں اور کبھی علی الصباح صوفہ پر بیٹھکر با وضو کلام الٰہی کی تلاوت و معنی پر غور کرتا ہوں۔ اور اس کے ختم پر دعائیں مانگ لیتا ہوں اور کبھی جب مسلمانوں کی جماعت سے کام پڑتا ہے اور دل میں شوق و ولولہ جماعت کی طرح عبادت کا ہوتا ہے تو نماز کو فقہی ارکان و تعدیل سے کر لیتا ہوں، چونکہ مجھے عربی بھی انگریزی و فارسی کی طرح سمجھ میں آتی ہے کبھی جی چاہتا ہے قرآنی دعائیں عربی میں پڑھ لیتا ہوں اور کبھی اپنی زبان اور اپنے خاص دل کی دعا۔

"میں نے اب سمجھا کہ واقعی اسلام جو ترقی کا دشمن و مخالف تھا اس کی کیا حقیقت تھی وہ دراصل اسلام فقہ ہے نہ اسلام قرآن اور مجھے علی الرؤس والاشہاد اس بات کا اقرار ہے کہ میں غالباً ہندوستان میں پہلا شخص ہوں جو عملاً اور اعتقاداً اپنے دین و دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کو کافی سمجھتا ہوں۔"

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیءٍ وما من حسابک علیھم من شیءٍ فتطردھم فتکون من الظالمین"

اب قرآن و حدیث و فقہ کے مذہبی احکام کو بالمقابل رکھ کر دکھلاؤنگا کہ کون ہمارے لئے قابل عمل ہے اور کون نہیں - اور کیوں رہا ہے

اعتقادات و احکامات فقہ و حدیث	احکام قرآن	ان احکامات کا ماخذ	اس کے اختیار کرنے میں عقل و تہذیب کہاں تک مخالف ہے
اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر ہے کے وقت پہلے آسمان پر اتر کر پکارتا کہ کوئی بندہ ہے جو مجھ سے دعائیں مانگے - اور اس قسم کی دوسری خرافات	کوئی ذکر نہیں	یہود	آسمان خلا و ایتھر ہے - اور ایتھر کے پرت سات یا آٹھ طبقات سماوات قرآن میں ہیں اور آسمان ہر طرف محیط ہے - نہ لامکاں ہے
پل صراط و میزان	کوئی ذکر نہیں	مجوس	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان پر رہ رہے ہیں - قیامت کے دن نازل ہوں گے اور دجال پیدا ہوگا اس سے لڑیں گے	کوئی ذکر نہیں	نصاریٰ	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
مہدی کا ظہور سادات بنی ہاشم کا شرف	کوئی ذکر نہیں	موضوعات بنی عباس علویین	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
حوض کوثر و آفتاب کا روز حشر سوا نیزے سر پر ہونا	کوئی ذکر نہیں کوئی ذکر نہیں	توہمات عرب و واعظین	چونکہ قرآن میں کوئی ذکر نہیں لغو خیال ہے ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا
معراج آسمانی	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا و قابل مضحکہ باتیں نہ مانی جائیں
چار فرشتے بنام جبرئیل میکائیل اسرافیل عزرائیل وغیرہ اور ان کے کام	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
منکر نکیر کا سوال جواب و عذاب قبر	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
اللہ نے آدم سے پہلے نور محمدی پیدا کیا وغیرہ	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ایضاً
بعض الہامات متعلق معاشرت جہاد و سیاست برآنحضرت و صحابہ	کوئی ذکر نہیں	منافقین و مخالفین اسلام	

ومثلها كما قلنا عن اهل التلاوة الذين يسكنون البادية ولا تحقيق عندهم بمعرفة ما ينقلونه من ذلك الا انهم بعد تمیزهم عظمت
قدرهم لاتصافهم بما كان عليه من المقامات في الدين والملة فتلقيت بالقبول من يومئذ - (مقدمہ ابن خلدون [illegible])

اعتقادات واحکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
نماز پنجگانہ بہ تعدیل و بہ زبان عربی	تین وقت کی نماز بالتعین ارکان و تعدیل	مجوس	نماز کی عبادت جس طرح وقتی تقاضے کرے وقت کی پابندی قرآن سے بھی ثابت ہے باقی پابندیاں چاہے کرے یا نہ کرے
وضو میں پیر کا دھونا اور مسح پر سخت وعید	بلا تعین ارکان و تعدیل مسح پیر کا	عادات عرب	بعض روایات [illegible] بعض لوگ پیر کو نہیں [illegible] [illegible] ہو جاتا ہے قرآن سے ثابت نہیں [illegible] ہو تو حدیث پر عمل کرے
عشر و زکوٰۃ میں نصاب	کوئی ذکر نہیں	یہود	پابندی نہیں جتنی ہو سکے ادا کرے
قربانی تمام دنیا کے مسلمانوں پر [illegible] کے [illegible] نہیں	حج میں مگر [illegible] نہیں	[illegible] ت مو بیت عرب	[illegible] مسئلہ قربانی کو بت پرستی [illegible] کو بچنا چاہئے
عقیقہ	کوئی ذکر نہیں	[illegible] عرب	کوئی حرج نہیں
ختنہ	کوئی ذکر نہیں	عادت [illegible] عرب	کوئی حرج نہیں
عیدین	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
ڈاڑھی منڈانا مونچھیں چھوٹی رکھنا	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
احکام لباس و طعام (مثلاً ریشم و چاندی)	کوئی ذکر نہیں	یہود	کوئی پابندی نہیں
سونے کا استعمال یا عورت کے حرام و	,,	,,	,,
حلال کی فہرست تصویر رکھنا یا کتے پالنا	,,	,,	,,
فنون لطیفہ (موسیقی، تصویر نگاری وغیرہ) کی ممانعت	..	رہبانیت و بربریت	کوئی پابندی نہیں
رجم زانی و مرتد و ساحرہ	کوئی ذکر نہیں	یہود	قطعاً احکام قرآنی سے انحراف و منافی تمدن و تہذیب و اہتمام اسلام
دار الحرب سے ہجرت کرنا وہاں سود کی اجازت دار الاسلام کا قیام (یہ مسئلہ فقہ کا ہے حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں)	کوئی ذکر نہیں	سیاست	قطعاً غلط ہے اس واسطے کہ اسلام یہود کی طرح کی قوم نہیں ہے

عتقادات و احکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
جیہ پردہ (حدیث سے بھی ثابت نہیں ن علماء کے اجتہاد و مظنونات)	کوئی ذکر نہیں	حماقت	لغو ہے۔ قرآن کے احکام سے زیادہ تعمیل سدِّ راہ تمدن ہے۔
نہ و طلاق کی غیر پابندی و جواز ہر وقت ہر حالت میں (جہاں تک میں نے یث پر غور کیا یہ دونوں مسائل ریث سے جائز و ثابت معلوم ہوتے ہیں)	کوئی ذکر نہیں	نفسانیت و شہوت پرستی	قابل ترک ہے۔ خلاف معاشرت و تمدن
نامات بر اسلام (نعوذ باللہ)			
سلام آخری زمانے میں جس طرح سانپ	کوئی ذکر نہیں	منافقین و زنادقہ کی روایات	ترک کرنا چاہیئے
سا میں سمٹ کر بیٹھ رہتا ہے مدینہ میں	„	„	„
مٹ جائیگا۔	„	„	„
غلبۂ نصاریٰ سے فتح قسطنطنیہ بدست نصاریٰ	„	„	„
سلام میں ۷۲ فرقے ہیں سب ناری	„	„	„
یک ناجی۔	„	„	„
مرجیہ و قدریہ اہل جہنم ہیں خوارج	„	„	„
کے متعلق حدیثیں و مثل ہذا	„	„	„

مذہب اور الہیات ہم نے کہا ہے کہ مذہب کی اصل خدا شناسی ہے۔ لیکن بودھ اور جین مذہب یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کلیہ بالکل غلط ہے کیونکہ ان دونوں مذاہب میں خدا کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کی بنیاد عالم مابعد الموت اور سزا و جزا کے اعتقاد پر ہے تو یہود کا مذہب یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ توریت اس کے ذکر سے خالی ہے اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کے لئے ضروری چیز حشر و نشر ہے تو مذہب ہنود کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کا کوئی حشر نہیں وہ متعدد جنموں کی قلابازیاں دنیا میں کھایا کرتا ہے اگر اخلاق و عبادات پر مذہب کو موقوف سمجھیں تو نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ دونوں چیزیں مسیح کے کفارے کے مقابلے میں بیکار ہیں اور اگر ہم مذہب کو ان تمام اعتقاد پر محدود کریں تو اسلامی شریعت اس کو ناقص مذہب بتاتی ہے۔ جب تک کہ معاشرت و معیشت و سیاسیات و معاملات کی فضا میں بھی داخل نہ ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہم صرف انہیں مذاہب سے بحث کر رہے ہیں جن کے پاس کتاب و علم ہے ورنہ وحشیوں کے حرکات و سکنات و خیالات اوہامی تو دراصل ایک علیحدہ مذہب کی تعریف میں آتے ہیں جن کو ہم نے اپنی بحث میں چھوڑ دیا ہے۔

ایسی صورت میں لازم ہو کہ سب سے پہلے مذہب کی ایک جامع تعریف کیجائے یا مذہب کے لئے چند اصول متعارف بتائے جائیں اور اسپر مذاہب موجودہ کا معیار قائم کیا جائے۔ اور یہ اصول متعارفہ "مذہب فطرت" کے نام سے موسوم ہوں۔ مذہب فطرت کے اصول بتانے کے بعد ان اصول کو مختلف ابواب میں زیر بحث لاکر ان کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ مذہب فطرت سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم خود اپنی فطرت سے مجبور ہوکر ان اصول کو قبول کریں گو کہ مذہب جیسا ہم پہلے دکھلا آئے ہیں فی الواقع فطری نہیں ہے اور مذہب کے اختیاری ہونے پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے لئے لا مذہب ہونا ممکن ہے۔ یا دوسرے معنوں میں کیا انسان خود بخود بغیر کسی قسم کا مذہبی اعتقاد رکھتے ہوئے ایسی زندگی بسر کر سکتا ہے جو امن و سلامتی کی ضمانت خود اس کے اور نیز بنی نوع انسان کے لئے کر سکے۔

فرض کرو کہ مذہب محض وہم و لاشے ہے۔ خدا کا کوئی وجود نہیں اشیاے عالم اور انسان کا وجود ایک ناقابل تشریح و مبہم ذرات کی حرکت و امتزاج سے ظہور پذیر ہوا۔ اور حرکت مخالف یا انتشار سے ایک وقت معینہ کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ نہ جزا ہے نہ معاد۔ اور خود خدا کا وجود بھی کسی منطقی و فلسفی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کہ سبب اول یا محرک اول کو ماننے کے باوجود انسان کا ذہن فوراً ایک لا انتہائی سلسلہ کو شروع کر دیتا ہے اور یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا کا سبب کون ہوا (جیسا ہماری بعض مستند حدیثوں میں ابوہریرہ کی طرف سے اس قسم کے سوال پر آنحضرت کا یہ جواب نقل ہے کہ اس وقت تم فقط یہ کہدو کہ میں ایک اللہ پر ایمان لایا) اب تم اپنی دماغی کیفیت پر غور کرو۔ دن بھر ـــــ جاگنے کی حالت میں تم کائنات کے مختلف حوادث و اشیا کا مشاہدہ کرتے ہو اور ان مشاہدات کے نقوش تمہارے لوح دماغ پر بنتے رہتے ہیں رات میں جب تم سو جاتے ہو تو دماغ کے اندر نقوش مشاہدات عارضی طور سے رک جاتے ہیں مگر جب تم صبح کو بیدار ہوتے ہو تو اپنے دماغ کو پچھلے مشاہدات سے خالی نہیں پاتے ہو اگر بالفرض دماغ کا شبانہ تعطل ان نقوش کو جو گزشتہ مشاہدات سے دماغ پر بنے ہیں مٹا دیئے اور دوسری صبح کو تم بالکل کسی گزشتہ واقعہ کو یاد نہ رکھو تو رات کی نیند عملاً موت کے مرادف ہو گی اور دوسرے روز تم نیا خیال لیکر اٹھو گے لیکن اگر مشاہدات کے پچھلے نقوش قائم رہتے ہیں تو جب دماغ گزشتہ مشاہدات کے نقوش سے خالی نہ ہوا تو لازم ہوا کہ اس نقوش دماغی کے ہونے پر سے تم اپنی ہستی کو گم نہ کرو نہ صرف یہ بلکہ تمہاری ہستی دماغ کے تصورات سے گزشتہ سے لیکر آیندہ تک قائم ہو جاتی ہے اور فطرت کا تقاضہ ہو کہ جب تمہاری ہستی دماغ کی ان نقوش سے قائم ہو گئی تو تم یہ خیال کر لو کہ کچھ دنوں کے بعد وہ فنا ہو جائے گی۔ نہیں بلکہ اس کو لازوال ماننے کے لئے تمہارا دل مجبور کریگا۔ اگر برخلاف اس کے تمہارے دماغ کے نقوش ہر صبح مٹ کر نیا تختۂ دماغ ہو جاتا تو درحقیقت مذہب کے اس دوسرے بڑے جز یعنی عالم مابعد الموت کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا مگر تم مجبور ہو کہ تم اپنی ہستی کو ایک دن گم کرکے "دکنت ترابا" ہو جاؤ۔ تمہاری فطری خواہش یہ ہو گی کہ تم اپنی زندگی کا تسلسل اپنی موت کے بعد بھی قائم رکھتے۔

اب دیکھو کہ انسانی زندگی موت تک مکمل زندگی کہی جا سکتی ہے یا نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص ہے جسکو بلا سبب و قصور ایک جابر و قاہر انسان آگ میں زندہ جلانے کا حکم دیتا ہے تو کیا اس مظلوم کی حالت اور ظالم کی حالت میں جو تفاوت ہے وہ دونوں کی مکمل زندگی ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو مظلوم کو سوائے اس مذہبی اُمید کے کون چیز تسکین دے سکتی ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جبکہ وہ

اعمال کی سزا مستور دہو گی اور دوسرے کو اپنے شدائد کی دعذاب کی جزا ملیگی
کے ساتھ سزا وجزا کے خیالات کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور سزا وجزا کی وہی صورت
بلقابل بھی ہوں اور اپنے بُرانے اعمال سے باخبر بھی ہوں۔ ورنہ اگر دونوں نے اپنی
ان لغو ہوجاتا ہے۔ ہنود کے اداگون کے فلسفے میں جہاں تفادات زندگی کی تشریح ایک
سئلہ کہ انسان کا بقول ان کے دوسرا جنم پچھلے زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے پچھلی ہستی کے کم

سے سمجھ میں آجائیگی کہ ان باتوں کا سررشتہ ایسی ذات واحد کے ہاتھ میں ہوگا جس کو ہم بجا طور
ہب فطرت کے اصول یہ ہوئے الہیات۔ حشر و نشر جزا و سزا یہی خیالات اخلاق وعادات
کہ مذہب کے باقی نہیں عملی اصول ہیں ہم نے اس کو مذہب فطرت کہا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ
اصول اسلام کے ہیں لہذا ہم اصول اسلام کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں اصول مذاہب کی تشریح کریں گے جن کا ماننا ہماری فطرت
میں داخل ہے گزشتہ عنوان میں ہم نے قومیت مذہب پر بحث کرتے ہوئے اور دونوں کے تعلقات دکھلاتے ہوئے مذہب کو امور دنیاوی
اور سلطنت وشریعت سے علحدہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور چونکہ ہمارا مدعا مذہب کی بحث میں اسلام کا معیار مقرر کرنا تھا۔ ہم
اس غلط اصول کی تردید میں کہ مذہب اور قومیت لازم وملزوم ہیں اسلام کے ایک غلط اصول سے اُلجھ پڑے تھے ورنہ فلسفہ مذہب
میں ہم کسی خاص مذہب پر معاندانہ یا مناظرانہ تنقید کرنا نہیں چاہتے۔ اب ہم مختلف عنوانوں میں اصول مذہب فطرت یعنی الہیات
نبوت۔ تکوین۔ معاد۔ تقدیر اخلاق عبادات پر بحث کریں گے اور آخر میں دنیا کے مذہبی افکار جدید وقدیم پر ایک مورخانہ تبصرہ
کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اصول مذہب فطرت یا دوسرے معنوں میں اصول اسلام کس طرح قوموں میں خود بخود
جاگزیں ہو رہے ہیں اور کون سے اسباب موانع وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے اور اب کس طرح سے رفتہ رفتہ مذہب کی
دو بڑی تقسیمیں دنیا میں ہو رہی ہیں ایک اوہامی دوسرا الہامی۔

لہذا الہیات مذہب فطرت کا اصل الاصول ہے جب تک انسان کا اعتقاد اپنے سے بالاتر ہستی پر نہ ہوگا دیگر اصولی کڑیاں نہ صرف
ناتمام رہینگی بلکہ کوئی اصول اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا اور نہ بغیر الہیات کے مذہب کا سوال پیدا ہو سکتا ہے مگر الہیات ایسی
چیز ہے کہ جس پر تاریخ ومشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کے سوا اور کوئی فلسفیانہ منطقیانہ دلیل قائم نہیں ہو سکتی الہیات جس کا
مرادف انگریزی زبان میں (Theism) "تھیزم" ہے اس کی تعریف الہیات نظری سے زیادہ نہیں۔ لیکن خود الہیات فطرت
کی ایک تاریخ ہے۔ اسٹوئکس (Stoics) فلاسفی نے ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعات کے ایک جملے سے جو اس کے
گیارہویں باب کے آٹھویں مادے میں پایا جاتا ہے۔ الہیات کی تین تقسیمیں کی ہیں۔ الہیات اوہامی۔ الہیات فطری اور الہیات
سیاسی ومعاشرتی الہیات اوہامی تو وہ خیالات اوہامی ہیں جنھوں نے دنیا میں ہزارہا قسم کے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا ہے

اور جس کی ایک مختصر تاریخ ہم پہلے عنوان بحث میں بیان کر چکے ہیں الہیات سیاسی و معاشرتی وہ الہیات ہے جو الہیات نظری کو
کو مان کر خدا پرستی کی صورت پیدا کرے - اس کو ہم انشاء اللہ اگلے عنوان موت میں بیان کریں گے صرف الہیات نظری باقی رہتی ہے
اور اسی پر اس باب میں بحث ہے -

چونکہ اقوام عالم میں ایک الہیات الہامی بھی پائی جاتی ہے - اس کے خلاف دوسری الہیات کو الہیات فطری کہنا ذرا غلطی
سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ الہیات فطری کی در اصل تعریف وہی ہے جسے انسان کی اولین فطرت قبول کر چکی ہو - اور ہم دکھلا آئے ہیں
کہ انسان کی فطرت ہی نے الہیات الہامی کو پیدا کیا تھا - لیکن فلاسفہ کا الہیات فطری کو الہیات الہامی سے جدا سمجھنا ظاہر
کرتا ہے کہ الہیات فطری کے معنی وہی لئے جائیں گے جس طرف فطرت یا عقل سلیم یا عقل فلاسفہ ہدایت کرے - ہم اسکو الہیات
الہامی کہنا زیادہ موزوں سمجھتے ہیں مگر الہام ایک ما بہ النزاع لفظ ہے - اگرچہ ایک وقت میں ہماری طرح یورپ کا بھی اسپر اعتقاد
تھا مگر جب سے علم کی روشنی میں بائبل کے بعض ہفوات کے پرزے اڑ گئے علمائے یورپ الہام سے منکر ہو گئے ہیں - کاش یورپ
کے سامنے قرآن ہوتا تو غالباً وہ الہام کو اصول مذہب کے لئے ہماری طرح ضروری جانتے - کیونکہ ظاہر ہے کہ عقل سلیم یا عقل
فلاسفہ کا کوئی معیار نہیں - ممکن ہے کہ عقل فلاسفہ جس چیز کی طرف ہماری ہدایت کرے وہ اوہام سے زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں -

غرض کہ الہیات فطری ایک عام تعریف اس خداشناسی کی ہے جو بقول فلاسفہ عقل کی امداد سے حاصل کی جاتی ہے - اب ہمکو
یہ دیکھنا ہے کہ عقل فلاسفہ نے خداشناسی تک سمجھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی - یہ ضرور ہے کہ لاک (Locke) اور
والف (Wolff) نے الہیات فطری کی وہی تعریف کی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مگر اس کے برخلاف بعض فلاسفہ مثل شلیر ماخر
(Scheler macher) اور رسل (Russell) نے یہ پیروی عقلائے سوکانیان (Socinians)
الہیات فطری کے قائل نہیں ہیں اور اسی بنا پر کاتھلک عیسائیوں نے تمام ان خیالات کو جو خداشناسی کے بارے میں فلاسفہ میں
پائے جاتے ہیں بائبل اور الہامی خدا سے ایک جداگانہ اور معاندانہ خیال تصور کیا ہے فلاسفہ کے خیالات اُن کے نزدیک
مابعد الطبیعیات کے مظنونات ہیں اور چونکہ الہیات مذہب کا اعلیٰ اصول ہے، اور بعض ارباب علم نے الہیات فطری کو ہی مذہب
فطرت کا مرادف مانا ہے - اس لئے جب مذہب کے فطری اصول مسیحیت کے درجہ اوہام او تثلیث کی چیتاں کے ہمنوا نہ ہوئے تو
پادریوں نے مذہب فطرت کو لامذہبیت سے مطعون کرنا شروع کر دیا ورنہ فی الواقع یورپ کے کسی فلاسفر نے لامذہبیت کو اپنا مسلک
جان کر الہیات پر کلام نہیں کیا - الا شاذ و نادر چند ایسے مجانین و مخبوط الحواس لوگوں کے جن کے دلائل خود انکی بے عقلی پر دال
ہیں یا وہ ریاکاری سے لامذہبیت کو ایک قسم کا فیشن ایبل خیال جانکر دنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور ان کا دل کبھی اُن کے خود قول
پر گواہی نہیں دیتا - پادریوں نے جو یورپ کے فلاسفر اور تھیسٹ (Theist) کو نیچری اور ملحد کے نام سے موسوم کیا ہے
وہ محض ایک افترا ہے کیونکہ الہیات فطری کا درحقیقت ان خیالات سے کوئی تعلق نہیں جو قوانین فطرت کے نام سے عام طور پر
مشہور ہیں - چونکہ خود ہمارے ملک میں سرسید مرحوم قوانین فطرت پر کلام کرنے کے سبب سے عوام میں نیچری کے نام سے مشہور ہو گئے

تھے اسلئے یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ غالباً خود سرسید توانین فطرت کے معنی سے انتہائی ناواقف تھے جتنا ان کو نیچری کہنے والے لوگ۔ کیونکہ اگر اُنھوں نے معجزات کا مافوق العادۃ ہونے کی وجہ سے توانین فطرت کی بنا پر انکار کیا ہے تو وہ ان کے زیادہ تر ان خیالات سے لاعلمی کا سبب تھا جو قوانین فطرت کا دراصل منشا رہے۔ جیسا کہ اہل یورپ سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ توانین فطرت (جو لفظ درحقیقت سائنس کے انکشافات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ علمائے حقوق و قانون کا اپنا ایک مسکوکہ و فرضی جملہ ہے) کا ماننا وہی معنی رکھتا ہے کہ فطرت سے جدا کسی خدائے مشخص کا وجود نہیں۔ یعنی از بسکہ خود فطرت خالق و مخلوق ہے تو جس طرح ایک مشین کے کل پرزے خود بخود چل نکلے ہیں اور ان کا چلانے والا موجود نہیں۔ اس لئے ممکن نہیں کہ وہ مشین خلاف عادت کام کر سکے۔ ممکن ہے کہ بعض علمائے یورپ خدائے مشخص کے قائل نہ ہونے کے سبب سے ملحد کہلائے گئے ہوں مگر سرسید کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عام مسلمانوں کے خلاف ایک شخص قادر مطلق خدائے واحد کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ فلاسفہ یورپ کے نزدیک جو شخص خدا کے وجود کو فطرت سے علٰحدہ ایک ہستی تسلیم کرتا ہے اس کے لئے توانین قدرت یا فطرت ایک بے معنی الفاظ ہیں۔ ہم خود سرسید کے دلائل معجزات کے خلاف توانین فطرت کی بنا پر سمجھنے سے عاجز تھے۔ فطرت کی حرکت کے پیچھے اگر کوئی دماغ کام نہیں کر رہا ہے تو حرکات کا خلاف واقعہ ہو جانا ضرور مشکل ہے۔ مگر جب سرسید اس کے پیچھے ایک دماغ یا عقل اول کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر توانین فطرت کوئی معنی نہیں رکھتے سرسید کو اگر عربی و انگریزی میں ویسی ہی استعداد یا مہارت ہوتی جیسی ان کو اپنی مادری زبان یا فارسی میں تھی تو وہ کم سے کم ہیوم (Hume) اور ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کے مقالات کا خود مطالعہ کر کے بہت کچھ اپنی غلط رائے سے رجوع کر لیتے۔ کم سے کم وہ اپنے عجیب و غریب خیالات کو یہ نہ سمجھتے کہ یورپ کے فلاسفہ اُن کی تائید میں ہیں۔ اُنھوں نے قرآن میں کبھی دیکھ لیا کہ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" آیا ہے اور بس فوراً اس کی تاویل کر کے اس کو توانین قدرت کے معنے میں سمجھ لیا۔ ورنہ یورپ نے توانین کا اب تک کوئی کلیہ قائم نہیں کیا۔ اور نہ انکا یہ قول ہے کہ خدا مشاہدات کے خلاف کوئی فعل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کے خود ذاتی تجربات عالم اور خصوصاً اس زمانے میں جب کہ بہت سی معجز نما باتیں انسان سے ظہور میں آچکی ہیں اس کے خلاف شہادت دے رہی ہیں۔ ابھی حال کی اخباری دنیا کی خبر ہے کہ ایک لڑکی سترہ اٹھارہ برس کے بعد مرد ہو گئی بعض اوقات انسان کے بطن سے پیدائش کے وقت میں خلاف معمول باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو ہمارے مفروضہ توانین فطرت کو توڑ ڈالتی ہیں۔ آگ کا کام فطرتاً جلا دینا ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے عراق و شام میں بعض رفاعی درویشوں کو دیکھا ہے کہ ان پر آگ کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے شعلے اور انگارے اپنے منہ میں بھر لیتے ہیں۔ بعض نابینا اشخاص ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے آنکھ کا کام لیتے ہیں تو یہ کہنا کہ حضرت مسیح کی پیدائش یا حضرت ابراہیم کا آگ سے بے ضرر رہنا خلاف توانین قدرت ہے بالکل لغو ہے خدا کے لئے مافوق العادہ چیزیں ظاہر کرنا اس کی قدرت کی وسعت کے آگے اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک قطرے سے انسان کو بنا دینا۔ پس معجزات کا ماننا یا نہ ماننا محض روایت پر مبنی ہے، جس ذریعے سے ہم کو وہ اطلاع ملی ہے پھر بعض روایات ———— تو اس قدر لغو اور پوچ ہوتے ہیں (جیسے ہمارے امام بغوی کی تفسیر کے من گھڑت قصے) کہ انپر اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی کہ انکا معجزہ

کیا ہے مگر بعض خبریں تواتر مشاہدات سے یا اس کتاب سے جس کو ہم الہامی تسلیم کرتے ہیں اور ایسا تسلیم کرنے کی مضبوط دلیل ہمارے پاس ہے اس کے تردید کی سوائے اس کے اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں کہ یا تو ہم اس کو سرے سے مستند نہ سمجھیں یا اس کی لغو و لا طائل تاویل کریں۔ قرآن کے نئے آخری صورت کا حق سوائے عرب کے کسی کو نہیں ہو سکتا اور اس لئے کہ مفسرین قرآن زیادہ تر عجمی ہیں۔ اُن کی یا سرسید کی تاویلات کوئی وقعت اہل زبان کے آگے نہیں رکھتی اور سب سے بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ سرسید علیہ الرحمۃ کو جو رٹ قوانین ربانی کی تھی اُس کو یورپ کے فلاسفہ انکی نظر سے دیکھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک قوانین ربانی احکام عشرہ توریت میں اگر وہ بائبل کے مافوق العادہ باتوں کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں تو صرف اس لئے کہ انھوں نے بائبل کے بعض بے سر و پا باتوں کی بوالعجبانہ حیثیت سے تنقید کی ہے اور وہ بائبل کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچے ہیں جو قرآن نے ۱۳ سو برس پہلے ظاہر کر دیا تھا۔

برخلاف اس کے قوانین فطرت کا ماننے والا مادی شخص ہوگا جو خدا سے الہام کا منکر ہو کر خود فطرت کو خدا جانتا ہے۔ لیکن جب ایک خدا شناس قوانین فطرت سے بحث کریگا تو یا تو وہ خدا کی صفات و قدرت سے انکار کر کے اس کو معطل سمجھے گا یا اس کی مراد ان اصول مذاہب سے ہوگی جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ کالون (Calvin) اور زونگلی (Zwingli) مجددین مذہب پراٹسٹنٹ نے درحقیقت قوانین فطرت اسی کو سمجھتا ہے جو خدا نے توریت میں الہام کئے ہیں یعنی قوانین فطرت وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے انسان کو نیک و بد کی تمیز سکھلائی۔ قدیم رومیوں میں قوانین ربانی کے مرادف الفاظ جس جینشیم (Jus Gentium) یا جس نیچرلس (Jus Naturalis) یعنی قوانین فطری یا قوانین جبلی ہیں۔ روسو (Rousseau) نے فطری حقوق کا مدعا جس کے شور سے انقلاب فرانس گونج رہا تھا سوائے اس کے کچھ نہیں جانا کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور سلطنت و رعیت ایک غیر فطری پابندی ہے۔ اور لاک (Locke) نے قانون بین الاقوامی پر جو کلام کیا ہے انھیں رومیوں کے جس جینشیم یا قانون جبلی کا غلط مطلب لیکر قانون فطرت کا مطالبہ کیا ہے وہ قوانین معاشرت ہیں نہ قوانین فطرت الہیہ جیسا سرسید یا ان کے بعض متبعین سمجھتے ہیں۔

باقی ـــــــ باقی

سید مقبول احمد

یہ افسانہ میں نے انگریزی کے مشہور ناول نویس ٹامس ہارڈی کے ایک ناول "وڈلینڈرز" کو پڑھنے کے بعد لکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ افسانہ کی ترکیب و بندش اسی کتاب کو پڑھکر سوجھی لیکن اس کو ترجمہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا اور نہ ترجمہ ممکن تھا جبکہ افسانہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق بنانا میرے خیال میں سب سے زیادہ ضروری امر تھا لہذا آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ "وڈلینڈرز" کا چربہ یا نقش ثانی ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اصل سے کسی لحاظ سے "بہتر" ہے۔ ٹامس ہارڈی ایک بالکل انوکھا افسانہ نویس ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اور جس پیرایہ میں کہتا ہے اسمیں ایک خاص جادو ہوتا ہے۔ یہ بات مجھ جیسے آشفتہ بیان و آشفتہ نگار کو کبھی نہیں نصیب ہو سکتی۔

مجنوں

(۱)

میر قربان علی ضلع بستی کے باوقار اور متمول تعلقہ دار تھے۔ اُن کی کل جائداد کم و بیش پانچسو ماہوار کی تھی۔ گرد و نواح میں بجز ایک نوجوان بیوہ کے جسکا نام عائشہ تھا کوئی دوسرا زمیندار قربان علی کا ہمسر نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ خاتون جس کی زندگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں موضع رسول آباد میں ایک نہایت عالیشان اور پر تکلف عمارت میں رہتی تھی جو [illegible] کہلاتی تھی۔ رسول آباد کنک پور سے تقریباً ۴ میل کے فاصلہ پر تھا۔ کنک پور وہ گاؤں تھا جس میں خود میر قربان علی سکونت پذیر تھے اور جو رسول آباد سے دکھن اور پورب کی سمت تھا۔ قربان علی کو اپنی [illegible] دولت و ثروت کا صرف احساس ہی نہ تھا بلکہ ایک حد تک غرور تھا۔ لیکن اگر وہ خود کسی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو وہ "بیگم" تھی (قرب و جوار میں عائشہ اسی لقب سے مشہور تھی) سننے میں آیا کہ قربان علی کی ساری جائداد سے جو آمدنی تھی وہ "بیگم" کے صرف دو تین باغوں سے وصول ہو جاتی تھی۔

قربان علی نے خود پرانی روشنی میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ عربی و فارسی میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل تھی مگر وہ زمانہ کے تیور دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان کی معاشرت میں بتدریج جو انقلاب ہو گئے تھے وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اب وہ زمانہ تھا کہ جو انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہگیا اس کی نہ کہیں آؤ بھگت ہوتی، اور نہ اس کو زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے کافی موقع ملتا۔ جس صیغہ میں دیکھئے انگریزی دانوں کی مانگ تھی پرانے مکتب کے تعلیم پائے ہوئے بیچارے کہیں پوچھے بھی نہیں جاتے تھے خواہ وہ کیسے ہی فاضل اور متبحر کیوں نہ ہوں۔ "کریما" اور "مامقیماں" کی جگہ "لیتھبرج ریڈر" نے لے لی تھی "گلستاں"، "بوستاں" اور "انوار سہیلی" کی جگہ "حکایات ایسپ"، "اسمائل کی "سلف ہلپ" اور

رابن سن کروسو" کی دھوم تھی۔ ارسطو ارسٹاٹل افلاطون پلیٹو اور جالینوس گیلن ہوکر رہ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ زمین آسمان نہیں تو مشرق مغرب ضرور ہو رہا تھا۔

میر قربان علی میں خدا کی دی ہوئی بہت سی خوبیاں تھیں۔ غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنے، اپنے سے کم درجہ کے آدمیوں سے برابری کا برتاؤ کرنے، اسامیوں کو اپنی طرح انسان سمجھنے میں ان کا بڑا نام تھا۔ پوشیدہ طور پر ان کی خیرات ضرب المثل تھی۔ آج تک ان کو کسی نے غصہ سے مغلوب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے خدا ترس تھے۔ کسی کو دکھ یا مصیبت میں مبتلا دیکھتے تو کانپ جاتے۔ مگر ان سب محاسنِ اخلاق کے باوجود وہ پکے ابن الوقت تھے زمانہ کی متابعت کو وہ خدا کی متابعت سے کسی طرح کم فرض نہ سمجھتے تھے۔ یہی دنیا سازی اور مصلحت کوشی تھی جو اُن کی تمام خوبیوں پر حاوی تھی۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کو وہ نجات کا تنہا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے کو "جاہل" کہا کرتے تھے صرف اس لئے کہ جب وہ کچہری جاتے تو اُن کو کلکٹر صاحب کی باتیں اور کلکٹر صاحب کو اُن کی باتیں سمجھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ وہ اُس آنے والے وقت کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے جبکہ یہی نظام تعلیم جسکو وہ فلاح و بہبود کے لئے اسقدر ضروری خیال کرتے تھے پورا عروج حاصل کر چکا ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک وکیل کو دوسرے وکیل کی محرری بھی نہیں ملے گی۔ بی۔ اے، ایم۔ اے کالج سے ہر سال کی سند لیکر نکلنے کے بعد شوفری اور ٹکٹ کلکٹری کے لئے درخواستیں لئے پھریں گے اور حالی کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہوگا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر	وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

میر قربان علی خود اپنے میں جو کمی پا رہے تھے اس کو تو کسی طرح پوری نہ کر سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے اُن کو لڑکا دیا تو وہ جی کھول کر اس کو اپنے وقت کے معیار کے مطابق تعلیم دلائیں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوگی تو انگلستان بھی بھیجیں گے اُن کو بیٹے کا بڑا ارمان تھا۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ آرزوؤں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں قدرت کو ہماری آپ کی تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہیں رہی اُس کی طبیعت میں جو آئے گا وہی آپ کو دے گی۔ اور عموماً جو کچھ وہ دیتی ہے وہ آپکی خواہش کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ شادی کے بعد سات آٹھ برس تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ قربان علی کی نسل بس انھیں پر ختم ہو جائے گی۔ منتوں کی دعا تعویذ کے بعد گھر آباد بھی ہوا تو بیٹی سے۔ پہلے تو قربان علی کا سارا حوصلہ پست ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو کوئی زبردست دھکا لگ گیا۔ لیکن وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو فطرتاً گھریلو زندگی کے لئے بنائے جاتے ہیں اور جن کو اپنے آل و عیال کے ساتھ محبت کیا گرویدگی ہوتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں اُن کو بیٹی سے شدید محبت ہو گئی اور وہ اسی کو بیٹا تصور کرنے لگے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو اپنا سارا ارمان اُسی پر نکالتے۔ مگر دنیا نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی اور قربان علی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ دنیا کو کہنے سننے کی پروا نہ کرے اور بیٹی کو اسکول اور کالج کی فضا میں تربیت دلاتے۔

قربان علی اپنی خوبصورت بیٹی کو جس کا نام ذکیہ رکھا گیا تھا بدورا کہکر پکارا کرتے تھے اِن میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں شاعرانہ صلاحیت اور جذبۂ حسن پرستی کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ "الف لیلہ" بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ ذکیہ کا نام بدورا پڑ گیا اور دوسرے بھی اس کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ جس کی ذکیہ واقعی مستحق بھی تھی۔ یہاں قربان علی کی شادی کے واقعات کو جان لینا ضروری ہے جو اُن کی سیرت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی بیوی رضیہ اُن کی پھوپھی کی لڑکی تھی جس کے ساتھ اُن کو بچپن سے عشق تھا۔ لیکن تنہا یہی رضیہ کے

شق نہ تھے۔ اِن کے چچازاد بھائی میر عنایت علی بھی اُس کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ خود رضیہ کا میلان قربان علی کی طرف تھا لیکن
یہ کی ماں عنایت علی کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ عنایت علی کے ساتھ اس کو زیادہ لگاؤ تھا۔ قربان علی رضیہ
محبت میں اندھے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اُن کا اور کوئی زور نہیں چل سکتا تو ایک دن چپکے سے رضیہ کو لیکر بھاگ گئے
جاکر کہیں کسی قاضی سے نکاح پڑھوا لیا۔ عنایت علی بیچارے سیدھی سادی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُن کو جو صدمہ ہوا ہوگا اُس کا صحیح
اُن کے دل کو ہوگا مگر اپنے منھ سے اس کا اظہار اُنھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی انھوں نے قربان علی سے کشیدگی اور بیگانگی کا برتاؤ کیا گویا
ں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ آسمان تابع و معشوق بفرمان نہ شود رضیہ کی ماں کو البتہ اس واقعہ سے ایسا رنج ہوا تھا کہ وہ کچھ عرصہ بعد اسی کوفت
گھل کر تمام ہوگئی۔

اس کے بعد قربان علی کا ضمیر ہمیشہ چٹکیاں لیتا رہا اور اُن کے سکون و اطمینان میں کافی رخنے پیدا کرتا رہا۔ کیونکہ میر عنایت علی کی یہ پہلی
تلفی نہیں ہوئی تھی۔

قربان علی کے والد عرفان علی۔ عنایت علی کے والد احسان علی کا ایک طرح گلا ہی گھونٹ چکے تھے۔ میر ہدایت علی اپنی ساری جائداد
ے دونوں بیٹوں یعنی عرفان علی اور احسان علی اور ایک بیٹی کے درمیان تقسیم کر کے مرے تھے۔ دونوں بھائیوں کی مالی حیثیت برابر تھی
ن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عرفان علی نہایت چالاک دور اندیش شاطر اور کنجوسی کی حد تک کفایت شعار تھے
کی قارونیت ہر جگہ مشہور تھی۔ اُن کو روپئے حاصل کر کے جمع کرنے کا خبط تھا اور وہ ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑے رہا کرتے تھے
سان علی اِن کی ضد مقابل تھے۔ اِن کی حاتمی کا شہرہ دور دور دیہاتوں میں تھا۔ اُن کی فیاضی اور سخاوت اصراف کی حد تک بڑھی
ئی تھی۔ غریب پروری اور مہمان نوازی میں نہ جانے اُن کی کتنی دولت لٹ گئی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ اُن کے ہاں دو چار
سی یا دو چار دوست نہ پڑے رہتے ہوں۔ جتنے نادار اقربا تھے وہ سب انھیں کے طفیلی تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُن کو اِن خوش
ھنے والوں کے ساتھ شغف تھا جو شاہ پیر یا مرشد کہے جاتے ہیں۔ سال میں دو تین بار اِن کاکل والی بلاؤں کا احسان علی کے دولت
ہ ضرور ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ زمینداری سے جو کچھ آمدنی تھی اُس پر اُن کی بسر اوقات نہ ہو سکتی تھی اور اُن کو برابر احسان علی سے قرض
لینا پڑتا تھا۔ عرفان علی بھی پوری ہوشیاری کے ساتھ پرنوٹ لکھوا لکھوا کر قرض دیتے چلے جاتے تھے۔ آخر کار جب احسان علی مر گئے تو تین چوتھائی
زیادہ حصہ جائداد کا بمعاوضہ قرض عرفان علی کے قبضہ میں آگیا۔ عرفان علی اسی نیت سے قرض دیتے چلے گئے تھے وہ خوب جانتے
تھے کہ قرض چکانا احسان علی کے اختیار سے باہر ہے۔ بہرحال عنایت علی کو جو ترکہ ملا وہ بمشکل تمام تیس پینتیس روپئے ماہوار آمدنی
تھا۔ باپ کی شاہانہ زندگی دیکھنے کے بعد اتنے پہ گزر کرنا انھیں کا کام تھا۔ رضیہ کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لئے انھوں نے شادی
لی تھی جس سے ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام احمد تھا۔ عنایت علی اسی تیس پینتیس روپئے ماہوار میں احمد کو انگریزی تعلیم بھی دلا رہے
ے۔ خیال تھا کہ ممکن ہے احمد ہونہار ثابت ہو اور کما کر جو کچھ تلف ہو چکا ہے اس کو از سر نو حاصل کر لے۔ لیکن احمد نے جس سال
ل پاس کیا اُسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غریب کو سلسلۂ تعلیم منقطع کر دینا پڑا

احمد اگر چاہتا تو اسکو کوئی نہ کوئی سرکاری ملازمت مل جاتی۔ لیکن اُس نے اِس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی باپ کی موت کے بعد اُسنے سوچا کہ اگر استقلال کے ساتھ بیٹھکر جو کچھ زمینداری غیروں کے دستبرد سے بچی ہے اُس کی دیکھ بھال نہ کی گئی تو وہ بھی مٹی میں ملجائے گی۔ اس کے علاوہ دیہات کی زندگی کچھ اُس کی اپنی طبیعت کے موافق بھی تھی۔ وہ فطرتاً عزلت پسند تھا۔ اطراف و جوانب میں وہ سادھو سمجھا جاتا تھا۔ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ ہمیشہ موٹے سے موٹے کپڑے پہنتا تھا۔ ہاں اگر اس کو کسی چیز کا شوق تھا تو کتب بینی کا وہ فطرتاً شاعر تھا اگرچہ شعر کہنے کی زحمت شاید اس نے کبھی نہیں گوارا کی تھی۔ انگریزی شروع کرنے کے قبل اردو فارسی اور عربی میں وہ خاصی مہارت حاصل کرچکا تھا اور شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ اردو فارسی شعرا کے منتخب اشعار اس کو زبانی یاد تھے۔ وہ ان کو بہت بڑی دولت تصور کرتا تھا۔ اُس نے گھر بیٹھ کر غلہ کی تجارت شروع کردی جس میں اُس کو روز افزوں منافع ہو رہا تھا۔ اتفاقات زمانہ نے اُس کی کچھ ایسی یاوری کی کہ دو تین سال کے اندر اُس کی ماہوار آمدنی تیس پینتیس روپے ماہوار سے ڈیڑھ سو ہوگئی۔ قربان علی۔ رقیہ کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد اپنے کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگے تھے۔ عنایت علی کے ضبط و تحمل نے اُن پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے بلکہ اُن کے باپ نے احسان علی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی بھی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کفارہ ادا کرنا تو ایک طرف گناہوں کا ارتکاب بھی انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ بہرحال وہ خلوص دل سے تلافی مافات کا ارادہ کرچکے تھے اور اس کی بہترین صورت وہ یہ سوچتے ہوئے تھے کہ اپنی بدورا کے ساتھ احمد کی شادی کردیں گے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بچپن سے احمد اور بدورا میں بے انتہا محبت ہے اور جہاں تک موقع مل سکتا ہے دونوں لازم و ملزوم کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح اُن کو پوری امید تھی کہ عنایت علی اور اُن کے باپ کے ساتھ جو ظلم ہوئے ہیں اُن سب کا کفارہ ہو جائیگا۔ اس لئے کہ قربان علی کے کوئی دوسری اولاد ہونے کی امید نہ تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر تھا کہ بدورا کی وساطت سے اُن کی ساری جائداد احمد کو مل جائیگی۔

رقیہ بدورا کو چار برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی اور وصیت کر گئی تھی کہ حتی المقدور بدورا احمد ہی کے ساتھ بیاہی جائے۔ اس سے قربان علی کا ارادہ اور بھی مستحکم ہوگیا تھا۔ بدورا اُن کو اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ اُن کو رقیہ کی موت سے بڑا دکھ پہونچا تھا۔ انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ اب کبھی شادی نہ کریں گے۔ لیکن واقعات کو کسی کا عہد توڑتے ہوئے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ بدورا اپنی دائی سلمہ سے بے انتہا مانوس تھی۔ سلمہ قریب کے ایک گاؤں کی بیوہ تھی اور ذات کی پٹھان تھی۔ قربان علی نے اس کو بدورا کی خدمت کے لئے نوکر رکھ لیا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ سلمہ کا اُن کے گھر میں مستقلاً رہنا معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ ادھر بدورا دائی کی کچھ ایسی خوگر ہو چکی تھی کہ اگر اس سے جدا کی جاتی تو شاید اُس کی جان پر آبنتی۔ بادل ناخواستہ قربان علی کو بیوی کی یاد میں خون کے آنسو رو کر سلمہ کو اپنے نکاح میں لے لینا پڑا۔ اس وقت اُن کی عمر پینتالیس برس کے قریب تھی۔ اور اب اُن کی دلبستگی کا سامان لے دے کر بدورا رہ گئی تھی جو اُن کی ساری توجہ کی مرکز بنی ہوئی تھی اُن کو اس کا رنج تھا کہ وہ اس کو بیٹے کی طرح تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس پر تل گئے تھے کہ ایک لڑکی کو جہاں تک آزادی کے ساتھ پڑھایا لکھایا جا سکتا ہے۔ وہاں تک بیٹی کو پڑھا لکھا دیں گے۔ اس خیال سے انھوں نے ایک مولوی مقرر کیا۔ جس سے بدورا دس سال کی عمر تک عربی فارسی پڑھتی رہی۔ اس کے بعد خود قربان علی نے اس کو دو سال پڑھایا۔ جس میں بدورا کو

ہندی میں بھی مہارت پیدا ہوگئی۔

اسی درمیان میں قربان علی کی بہن جو لکھنؤ بیاہی ہوئی تھیں بھائی کو دیکھنے آئیں۔ بدورا کو دیکھکر اُن کا جی باغ باغ ہوگیا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں نے قربان علی سے اصرار کیا کہ بدورا کو اُن کے ساتھ کردیں۔ وہ لکھنؤ میں اُن کے ساتھ رہ کر اونچی صحبتوں میں بہت کچھ سیکھ لے گی۔ قربان علی کو بیٹی کی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ اودھ کی فضا میں بدورا کی تربیت اُن کی امیدوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوگی اور کچھ اس لئے کہ بہن اُن کے سر ہوگئی تھیں اُنھوں نے بدورا کو لکھنؤ بھیج دیا۔ بدورا لکھنؤ پھوپھی کے ساتھ رہنے لگی جس سے اُس کے مذاق میں روز بروز لطافت و پاکیزگی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سال میں ایک بار مہینہ دو مہینہ کے لئے آکر باپ کا جی بہلا جایا کرتی تھی اس کا سلیقہ اور اُس کی مہذب گفتگو دیکھکر باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب قربان علی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتے تھے کہ بدورا کی زندگی کو احمد کے سپرد کرنا کہاں تک مناسب ہوگا۔ اس لئے کہ اگرچہ احمد کی مالی حالت سدھر چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ صرف ایک "دہقان" کہے جانیکا مستحق تھا۔ اور اُن کی بدورا اس قابل تھی کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مدنی الطبع کی رفیق بنے یہ خیال قربان علی کو اب اکثر ستاتا رہتا۔ لیکن جب کبھی وہ اس پر غور کرتے تو اُن کو اپنا عہد یاد آجاتا۔ اُن کا ضمیر ملامت کرنے لگتا اور اُن کو اپنی ذات سے شرم آنے لگتی۔ مختصر یہ کہ وہ ابھی تک اپنے ارادہ پر قائم تھے اور احمد کو اپنا داماد سمجھتے تھے اور ہر وقت اس کی خیر اندیشی میں رہتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا وہ اسکی مالی امداد بھی کرنے کو تیار رہتے لیکن احمد غیور تھا۔ اُس نے اس کو پسند نہ کیا۔ اب وہ خود بھی خوشحال کہا جاسکتا تھا۔ پھر وہ کسی کا احسان مند کیوں ہوتا۔ قربان علی احمد کی اس غیرت و خودداری کی بڑی قدر کرتے تھے۔

(۲)

احمد موضع امیر نگر میں رہتا تھا جو گنگ پور کی مشرقی سرحد واقع تھا۔ اس گاؤں میں تین حصہ دار تھے۔ سب سے زیادہ حصہ قربان علی کا تھا۔ اس سے کم بیگم کا تھا۔ سب سے کم حصہ احمد کا تھا۔ احمد اپنے باپ دادا کے مکان میں رہتا تھا۔ جو وسیع اور خوش منظر تھا مکان کے پورب طرف دور تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دکھن کی طرف ڈھاک کا مختصر مگر نہایت گھنا جنگل تھا۔ جو بہار کے موسم میں احمد کے مکان کو دولھن بنا دیتا تھا۔ اُتر طرف ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک بڈھا کمہار اپنی بیٹی مالتی کے ساتھ رہتا تھا۔ مالتی کی عمر ۱۶ سال کی ہوگی۔ باپ کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ اُس کی شادی کرتا۔ خود مالتی باپ سے کہہ چکی تھی کہ میں تمکو اس بڑھاپے میں چھوڑنا نہیں چاہتی اس لئے میری شادی کی فکر نہ کرو۔ لیکن باپ اسی فکر میں گھل رہا تھا۔ احمد کے مکان سے پورب جانب تھوڑے فاصلہ کے بعد سے ایک بڑا باغ شروع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر آم اور مہوے کے درخت تھے اور جو گنگ پور کی سرزمین میں تھا۔ یہ باغ احمد اور قربان علی کے درمیان تقسیم تھا لیکن اسمیں احمد کا حصہ زیادہ تھا۔ قربان علی صرف ۲ کے حصہ دار تھے۔ احمد کو اس باغ سے سال میں بہت کچھ مل جاتا تھا۔

احمد اپنے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ نوکروں کو وہ سرشام چھٹی دیدیا کرتا تھا۔ اُس کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں زیادہ راحت ملتی تھی۔ کھانا پکانے اور جھاڑو دینے کے علاوہ جس قدر کام ہوتا تھا وہ خود کر لیتا تھا۔ ایک مسلمان عورت تھی جو صبح و شام معمولی کھانا

پکا کر چلی جاتی تھی۔ احمد اس کو نعمت سمجھ کر کھا لیتا تھا۔ مالتی دونوں وقت آ کر جھاڑو دے جایا کرتی تھی۔ مالتی کو احمد کے ساتھ تنہی لگاؤ تھا احمد کی نہ صرف معصومیت بلکہ صورت شکل بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور لوگ اگر احمد کو سادھو کہتے تھے تو مالتی اس کو دیوتا کہتی تھی۔ احمد کو مالتی کی محبت کا ایک حد تک علم بھی تھا لیکن وہ اس محبت کی صرف قدر کر سکتا تھا اور کسی طرح اس کا بدلہ نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ بچپن سے وہ بدورا کو چاہتا تھا اور اس چاہ نے اس کو ایسا اپنا بنا لیا تھا کہ کسی دوسرے کے خیال کے لئے بھی اب اس کے دل میں گنجائش نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ مالتی کی محبت کو شدید جذبۂ احترام سمجھ رہا تھا۔

احمد سوداوی المزاج تھا۔ وہ دنیا کو واقعی دارالمحن سمجھتا تھا جہاں ہنس کھیل کر زندگی گزار دینا ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ وہ گرد و پیش مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کو دیکھتا تھا اور پھر زمینداروں کو دیکھتا تھا تو یہ تفریق اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ ان فاقہ مستوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے اُن لوگوں پر راج کر سکتے ہیں جو آج اُن کے آقا بنے بیٹھے ہیں۔ پھر آخر یہ کس جرم کی سزا ہے کہ ان کسانوں اور مزدوروں کو انتہائی محنت اور جانفشانی کے بعد بھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا کسی طرح یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ کسی رحیم و کریم یا منصف مزاج خدا کا کام ہے۔ زندگی کی تعریف اس کے ذہن میں یہ تھی کہ ہر چیز غلط جگہ ہو۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اگر کوئی فوق الادراک قوت ہے جو کائنات کی پیدا کرنے والی کہی جا سکتی ہے۔ تو وہ شیطانی قوت ہوگی۔ زندگی اس کے لئے عذاب نہ تھی تو سرتاسر کاتب الفلک کی ایک بے معنی اور دل آزار ستم ظریفی ضرور تھی۔ اس سوداویت کے باوجود احمد اپنی زندگی میں کامیاب ہو رہا تھا اور زیادہ کامیاب ہونے کے لئے مسلسل کوشش کر رہا تھا؟ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اس کا مذہب یہ تھا کہ زندگی میں اس "شیطانی قوت" کے ساتھ جنگ آزمائی کرنا انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ دوسرے وہ خوب جانتا تھا کہ بدورا کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ہو۔ اس معاملہ میں محض "مجنون" ہونا کافی نہ تھا۔ دنیا میں اس کا صرف ایک مدعا تھا اور وہ بدورا کو اپنا بنا لینا تھا۔ احمد سب کچھ چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن بدورا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے بدورا لکھنؤ گئی اس وقت سے وہ اس کے "خواب کی پری" بنی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اور فرصت میں کتب بینی کرتے ہوئے بدورا کی شبیہ احمد کے پیش نظر رہتی تھی۔ اگر اس کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ بدورا کی شادی اس کے ساتھ ہوگی تو شاید اس کا جینا وبال ہو جاتا۔ چنانچہ جب کبھی اس کی سوداویت معمول سے زیادہ بڑھ جاتی تو اس کو اندیشہ ہونے لگتا کہ کہیں ایسا نہ ہو بدورا اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔ اور اس کی حسرتیں خاک میں مل جائیں۔ ایسے دنوں میں احمد کو زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہونے لگتی تھی اور پھر اس کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

چیت کی شام تھی چاروں طرف نمو کا عالم تھا ہر طرف نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین ایک وریائے اخضر معلوم ہوتی تھی۔ ڈھاک کے درخت اپنے سرخ جوڑے پہن چکے تھے۔ کائنات ازسرِ نو رنگ و بو سے معمور ہو چکی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت انسان کی محرومیوں کی تقریب میں جشن کر رہی ہے اور مصیبت زدوں کو منہ چڑھا رہی ہے۔ احمد اپنے مکان کے پیچھے ڈھاک کے درختوں میں چھپا ہوا قدرت کے ان مناظر پر غور کر رہا تھا اور اس کو رہ رہ کر عمر خیام کی یہ رباعی یاد آ رہی تھی۔

ہر جا کہ گلے و لالہ زارے بودہ است | از سرخیٔ خون شہریارے بودہ است
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید | خالے است کہ بر رخ نگارے بودہ است

آج وہ غیر معمولی طور پر متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مالتی کا باپ سات آٹھ روز سے بیمار تھا اور آج اُسکی حالت بہت خطرناک تھی۔ باپ کے سوا مالتی کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا جو اُسکا ہاتھ پکڑتا۔ احمد مالتی کی آنیوالی بیکسی کا خیال کر رہا تھا اور دل دکھ رہا تھا مصیبت یہ تھی کہ وہ خود مالتی کی زندگی میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا۔ یکایک وہ کسی خیال سے چونک پڑا جیسے اُسنے کوئی مسئلہ حل کر لیا ہو اور اُس کو یک گونہ اطمینان ہو گیا ہو۔ احمد قربان علی سے سُن چکا تھا اور اس کا چرچا گاؤں والوں میں بھی تھا کہ ایک نہایت ہوشیار ڈاکٹر آجکل پڑوس میں آیا ہوا ہے جس کا نام ابوالخیر تھا اور جو دنیا کی سیر کرنے اور تجربات حاصل کرنے کے بعد اب یہ چاہتا تھا کہ اسی نواح میں گوشہ نشینی اختیار کر کے جہاں تک اس سے ممکن ہو خلق اللہ کو فیض پہونچائے۔ اس غرض سے اُس نے مادھو پور میں دریا کے کنارے کچھ زمین بھی خریدی تھی اور وہاں ایک مختصر سا مکان تعمیر کرا رہا تھا جس میں وہ خود رہے گا اور اپنا دواخانہ رکھے گا۔ فی الحال وہ اسی گاؤں میں ایک جھونپڑی ڈالکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قربان علی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس جوار کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اس سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کسی زمانہ میں اسی گرد و نواح میں آٹھ کوس تک راج کر چکا تھا زمانہ کی گردش نے اب اس خاندان کا نام و نشان بھی مٹا کر رکھدیا تھا۔ قربان علی جس بات سے سب سے زیادہ مرعوب تھے وہ ڈاکٹر کی عالی نسبی تھی۔

احمد کو اس سے بحث نہ تھی کہ ڈاکٹر سیدوں کی نسل سے تھا یا واجد علی شاہ کی۔ اس کو اس وقت ابوالخیر کی بحیثیت ایک ماہر فن کے ضرورت تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر آکر مالتی کے باپ کو بچا سکے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اگرچہ اندھیرا ہو چلا تھا اُسنے اپنا گھوڑا کسا اور مادھو پور کی سمت روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مالتی کی تنگ و تاریک جھونپڑی میں احمد کے ساتھ ساتھ ایک بلند قامت متناسب الاعضا جسم چوڑی مہری کا پائجامہ اور حیدرآبادی شیروانی زیب جسم کئے ہوئے داخل ہوا۔ اُس کی عمر تیس۳۰ سال سے کسی طرح متجاوز نہ تھی۔ رنگ روپ دلکش اور نظر فریب تھا۔ چہرہ کی تراش میں کسی قدر نسائیت تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جو بہر وقت تبسم معلوم ہوتی تھیں۔ آواز مترنم تھی۔ مختصر یہ کہ وہ بحیثیت مجموعی ایک ایسی چیز تھا جس کو دیکھتے رہ جانے کو جی چاہتا ہے۔

جس وقت ڈاکٹر جھونپڑی میں داخل ہوا گاؤں کے اکثر مرد و عورت بیمار پرسی کے لئے جمع تھے اور مریض کو گھیرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پہونچتے ہی حاکمانہ لہجے میں "بھیڑ نہ لگاؤ!" "کھلی ہوا آنے دو!" "بیمار کا دم گھٹ جائیگا!" کا نعرہ مارا۔ ایک تو ڈاکٹر کا نام سنتے ہی سب نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آج اُن کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق کا سامنا کرنا ہے۔ ڈاکٹر کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی بہتیرے تو دبے پاؤں جھونپڑی سے باہر ہو گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ سمٹ کر ایک طرف کو سمٹ گئے۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر تک گرد و پیش کا جائزہ لیا اور احمد سے کچھ مختصر باتیں کیں۔ اس درمیان میں اس کی نگاہیں کئی بار مالتی پر جم جم کر رہ گئیں جو اپنے باپ کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی کو ڈاکٹر کی نگاہیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ حرکات و سکنات سے ڈاکٹر مالتی کو بندۂ نفس معلوم

ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ شخص اپنا کام کرکے اپنا راستہ لے۔ ڈاکٹر کے آنے سے مالتی کے سوا ہر شخص کو امیدیں بندھ گئی تھیں۔ مالتی کا یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ جو شخص ایک غریب بیکس لڑکی پالیں نگاہیں ڈالے وہ موت و زندگی پر کبھی قابو پاسکتا ہے۔ مریض پر بے انتہا ضعف طاری تھا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ آخر کار اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور احمد کو مخاطب کرکے کہا "مرض یوں تو بہت پرانا ہے لیکن اگر آپ لوگ ایک مہینہ پہلے بھی اسکا معقول علاج شروع کردیتے تو بہت کچھ امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن اب تو مرض نہ صرف جڑ پکڑ گیا ہے بلکہ زندگی پر بُری طرح حاوی ہوچکا ہے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ مریض مشکل سے ایک دن کا مہمان ہے اس کا دل پھول گیا ہے جو نہایت مہلک بیماری ہے" اس فاش گوئی کا اثر مالتی پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اُس نے اپنے دل کی حالت کو دل ہی میں چھپا لیا اور اپنے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مگر احمد گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مالتی دل کی گہری ہے اور ایک اجنبی کے سامنے جو کیس اُس کے اندر اُٹھ رہی ہیں اُن سے مغلوب ہونا نہیں چاہتی۔ احمد نے جیب سے روپے نکالے اور ڈاکٹر کو فیس دیکر رخصت کرنا چاہا۔ ڈاکٹر نے فیس سے انکار کردیا۔ لیکن اس کی تاب نہ لاسکی۔ اس نے احمد سے زور دیکر کہا "نہیں صاحب۔ فیس ان کو ضرور دیجئے مرنے والے کی روح کو اس سے راحت ملے گی"۔ آج مالتی احمد کے احسان کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔ ابوالخیر کی خیرات اور منفس نوازی اس کو گوارا نہ تھی۔ ڈاکٹر نے حیرت زدہ ہوکر فیس لے لی اور چلا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مالتی کا باپ بیٹی کو حوادثِ چرخ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۳)

یہ تو معلوم ہوچکا ہے کہ ابوالخیر سیدوں کی پشت سے تھا۔ اب سیدوں کے بارے میں بھی کچھ جان لینا ضروری ہے۔ یہ ایک بہت پرانا خاندان تھا جو کم و بیش بلا شرکت غیرے قرب و جوار میں حکومت کرچکا تھا۔ کنک پور، امیر نگر، مادھو پور، اور رسول آباد کے چاروں طرف جتنی زمین تھی وہ سیدوں کی ملکیت رہ چکی تھی۔ آج وہی جاگیر مختلف زمینداروں میں بٹ گئی تھی جو ہر وقت ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لیئے تیار رہتے۔ زندگی کی بوقلمونی مشہور ہے۔ دنیا نام ہے متضاد حادثات کے ایک لامتناہی سلسلہ کا یہاں بہار و خزاں ہم آغوش ہے۔ کمال و زوال۔ عروج و ہبوط باوجود ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے لازم و ملزوم ہیں اسی لئے جرمنی کا مشہور شاعر فلسفی ہیگل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ زندگی اضداد کا نہ صرف مجموعہ ہے بلکہ ہر چیز اپنی ضد ہی کی بنا پر قائم ہے۔ سیدوں کی آدھی سے زیادہ کی جائداد تو غدر کی بدعملیوں میں اُن کے قبضہ سے نکل چکی تھی۔ جو کچھ باقی رہ گئی تھی وہ تین پشت کے لئے "شراب و شاہد" فراہم کرتی رہی۔ ابوالخیر کے بزرگوں کی "شانِ ریاست" لیکن عیاشی کے لئے قارون کا خزانہ بھی کفایت نہ کرسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُن کی ساری جاگیر اُن کے ہاتھ سے نکلتی رہی یہاں تک کہ "خرقہ و سجادہ" رہن رکھنے کی نوبت آگئی۔ ابوالخیر کے دادا نسبتاً دور اندیش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے پاس سوا رسول آباد کے مکان کے کچھ اور نہیں رہا ہے تو انھوں نے اس کو بھی نصیر خاں کے باپ اکبر خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ وہی مکان تھا جو بعد کو از سرِ نو تعمیر ہوکر

ہر جا کہ گلے و لالہ زارے بودہ است — از سرخیٔ خون شہریارے بودہ است
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید — خالے است کہ بر رخ نگارے بودہ است

آج وہ غیر معمولی طور پر متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مالتی کا باپ سات آٹھ ماہ سے بیمار تھا اور آج اُسکی حالت بہت خطرناک تھی۔ باپ کے سوا مالتی کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا جو اُسکا ہاتھ پکڑتا۔ احمد مالتی کی آنیوالی بیکسی کا خیال کر رہا تھا اور دل دکھ رہا تھا مصیبت یہ تھی کہ وہ خود مالتی کی زندگی میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا۔ یکایک وہ کسی خیال سے چونک پڑا جیسے اُسنے کوئی مسئلہ حل کر لیا ہو اور اُس کو یک گونہ اطمینان ہو گیا ہو۔ احمد قربان علی سے سن چکا تھا اور اس کا چرچا گاؤں والوں میں بھی تھا کہ ایک نہایت ہوشیار ڈاکٹر آجکل پڑوس میں آیا ہوا ہے جس کا نام ابو الخیر تھا اور جو دنیا کی سیر کرنے اور تجربات حاصل کرنے کے بعد اب یہ چاہتا تھا کہ اسی نواح میں گوشہ نشینی اختیار کر کے جہاں تک اس سے ممکن ہو خلق اللہ کو فیض پہونچائے۔ اس غرض سے اُس نے مادھو پور میں دریا کے کنارے کچھ زمین بھی خرید لی تھی اور وہاں ایک مختصر سا مکان تعمیر کرا رہا تھا جس میں وہ خود رہے گا اور اپنا دواخانہ رکھے گا۔ فی الحال وہ اسی گاؤں میں ایک جھونپڑی ڈالکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قربان علی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس جوار کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اس سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کسی زمانہ میں اسی گرد و نواح میں آٹھ کوس تک راج کر چکا تھا۔ زمانہ کی گردش نے اب اس خاندان کا نام و نشان بھی مٹا کر رکھدیا تھا۔ قربان علی جس بات سے سب سے زیادہ مرعوب تھے وہ ڈاکٹر کی عالی نسبی تھی۔

احمد کو اس سے بحث نہ تھی کہ ڈاکٹر سیدوں کی نسل سے تھا یا واجد علی شاہ کی۔ اس کو اس وقت ابو الخیر کی بہ حیثیت ایک ماہر فن کے ضرورت تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر مالتی کے باپ کو بچا سکے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اگرچہ اندھیرا ہو چلا تھا اُسنے اپنا گھوڑا کسا اور مادھو پور کی سمت روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مالتی کی تنگ و تاریک جھونپڑی میں احمد کے ساتھ ساتھ ایک بلند قامت متناسب الاعضا اجنبی چوڑی مہری کا پائجامہ اور حیدرآبادی شیروانی زیب جسم کئے ہوئے داخل ہوا۔ اُس کی عمر تیس ۳۰ سال سے کسی طرح متجاوز نہ تھی۔ رنگ روپ دلکش اور نظر فریب تھا۔ چہرہ کی تراش میں کسی قدر نسائیت تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جو ہر وقت متبسم معلوم ہوتی تھیں۔ آواز مترنم تھی۔ مختصر یہ کہ وہ بہ حیثیت مجموعی ایک ایسی چیز تھا جس کو دیکھتے رہ جانے کو جی چاہے۔

جس وقت ڈاکٹر جھونپڑی میں داخل ہوا گاؤں کے اکثر مرد و عورت بیمار پرسی کے لئے جمع تھے اور مریض کو گھیرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پہونچتے ہی حاکمانہ لہجے میں "بھیڑ نہ لگاؤ!" "کھلی ہوا آنے دو!" "بیمار کا دم گھٹ جائیگا!" کا نعرہ مارا۔ ایک تو ڈاکٹر کا نام سُنتے ہی سب نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آج اُن کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق کا سامنا کرنا ہے۔ ڈاکٹر کی زبان سے یہ الفاظ سننے ہی بہتیرے تو دبے پاؤں جھونپڑی سے باہر ہو گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ سہم کر ایک طرف کو سمٹ گئے۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر تک گرد و پیش کا جائزہ لیا اور احمد سے کچھ مختصر باتیں کیں۔ اس درمیان میں اُس کی نگاہیں کئی بار مالتی پر جم جم کر رہ گئیں جو اپنے باپ کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی کو ڈاکٹر کی نگاہیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ حرکات و سکنات سے ڈاکٹر مالتی کو بندۂ نفس معلوم

ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ شخص اپنا کام کرکے اپنا راستہ لے۔ ڈاکٹر کے آنے سے مالتی کے سوا ہر شخص کو امیدیں بندھ گئی تھیں۔ مالتی کا یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ جو شخص ایک غریب بیکس لڑکی پر ایسی نگاہیں ڈالے وہ موت و زندگی پر کبھی قابو پا سکتا ہے۔ مریض پر بے انتہا ضعف طاری تھا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ آخر کار اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور احمد کو مخاطب کرکے کہا "مرض یوں تو بہت پرانا ہے لیکن اگر آپ لوگ ایک مہینہ پہلے بھی اسکا معقول علاج شروع کر دیتے تو بہت کچھ امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن اب تو مرض نہ صرف جڑ پکڑ گیا ہے بلکہ زندگی پر بڑی طرح حاوی ہو چکا ہے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ مریض مشکل سے ایک دن کا مہمان ہے اس کا دل پھول گیا ہے جو نہایت مہلک بیماری ہے" اس فاش گوئی کا مالتی پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اُس نے اپنے دل کی حالت کو دل ہی میں چھپا لیا اور اپنے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مگر احمد گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مالتی دل کی گہری ہے اور ایک اجنبی کے سامنے جو ہوکیں اُس کے اندر اُٹھ رہی ہیں اُنسے مغلوب ہونا نہیں چاہتی۔ احمد نے جیب سے روپئے نکالے اور ڈاکٹر کو فیس دیکر رخصت کرنا چاہا۔ ڈاکٹر نے فیس سے انکار کر دیا۔ مالتی اس کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے احمد سے زور دیکر کہا "نہیں صاحب۔ فیس ان کو ضرور دیجئے مرنے والے کی روح کو اس سے راحت ملے گی"۔ آج مالتی احمد کے احسان کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔ ابوالخیر کی خیرات اور مفلس نوازی اس کو گوارا نہ تھی۔ ڈاکٹر نے حیرت زدہ ہوکر فیس نے لی اور چلا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مالتی کا باپ بیٹی کو حوادثِ چرخ کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۳)

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ ابوالخیر سیدوں کی پشت سے تھا۔ اب سیدوں کے بارے میں بھی کچھ جان لینا ضروری ہے۔ ایک بہت پرانا خاندان تھا جو کم و بیش بلا شرکت غیرے قرب و جوار میں حکومت کر چکا تھا۔ کنک پور۔ امیر نگر۔ مادھو پور۔ اور رسول آباد کے چاروں طرف جتنی زمین تھی وہ سیدوں کی ملکیت رہ چکی تھی۔ آج وہی جاگیر مختلف زمینداروں میں بٹ گئی تھی جو ہر وقت ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار رہتے۔ زندگی کی بوقلمونی مشہور ہے۔ دنیا نام ہے متضاد حادثات کے ایک لامتناہی سلسلہ کا یہاں بہار و خزاں ہم آغوش ہے۔ کمال و زوال۔ عروج و ہبوط باوجود ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے لازم و ملزوم ہیں اسی لئے جرمنی کا مشہور شاعر فلسفی ہیگل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ زندگی اضداد کا نہ صرف مجموعہ ہے بلکہ ہر چیز اپنی ضد ہی کی بنا پر قائم ہے۔ سیدوں کی آدھی سے زیادہ کی جائداد تو غدر کی بدعملیوں میں اُن کے قبضہ سے نکل چکی تھی۔ جو کچھ باقی رہ گئی تھی وہ تین پشت کے لئے "شراب و شاہد" فراہم کرتی رہی۔ ابوالخیر کے بزرگوں کی "شانِ ریاست" یعنے عیاشی کے لئے قارون کا خزانہ بھی کفایت نہ کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُن کی ساری جاگیر اُن کے ہاتھ سے نکلتی رہی یہاں تک کہ "خرقہ و سجادہ" رہن رکھنے کی نوبت آ گئی۔ ابوالخیر کے دادا نسبتًا دور اندیش تھے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کے پاس سوا رسول آباد کے مکان کے کچھ اور نہیں رہا ہے تو اُنھوں نے اس کو بھی نصیر خاں کے باپ اکبر خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ وہی مکان تھا جو بعد کو از سر نو تعمیر ہوکر

"نصیر کوٹ" کہلانے لگا۔ ابوالخیر کے دادا مع اپنے بیٹے نورالحسن (یعنی ابوالخیر کے باپ) کے یہاں سے ہجرت کر گئے اور جاکر حیدرآباد میں بس گئے جہاں وہ اور پھر اُن کے بعد نورالحسن سرکاری خدمات انجام دیتے رہے۔ ابوالخیر وہیں پیدا ہوا اور شروع شروع وہیں تعلیم پاتا رہا۔ نورالحسن نے اپنی ذات سے بڑی ترقی کی تھی اور اب اُن کی فراغت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ خوش نصیبی سے کثیرالاولاد بھی نہ تھے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی پرورش اب اُن کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بیٹی کو تو انھوں نے حیدرآباد ہی میں ایک امیر گھرانے میں بیاہ دیا۔ ابوالخیر کی بھو دانھوں نے اس میں سمجھی کہ اس کو ڈاکٹری پڑھائیں۔ ابوالخیر نے بھی اپنے کو اس کا اہل ثابت کیا اور ۲۳۔ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر برسرکار ہو گیا۔ لیکن باپ کے پلٹتے ہوئے دن نہ دیکھ سکا ابوالخیر کو ملازمت کرتے ہوئے سال بھر ہوئے تھے کہ نورالحسن کو پیغامِ اجل پہونچا اور وہ بیٹے کو آخری دعائیں دیتے ہوئے چل بسے۔

ابوالخیر بچپن سے اپنے خاندان کے عروج و زوال کی داستانیں سنتا چلا آتا تھا۔ اس کا اس کے دماغ پر ایک خاص اثر ہوا کرتا تھا۔ اگر عبرت نام ہے کسی مجہول کیفیت کا تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ابوالخیر کو اپنے اسلاف کی سرگزشت سنکر مطلق عبرت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کا خون جوش میں آجاتا تھا اور وہ اپنے دل میں کہا کرتا تھا "اگر خدا نے مجھکو استطاعت دی تو رفتہ رفتہ میں اپنے کھوئے ہوئے اقبال کو جہاں تک ممکن ہوگا پھر حاصل کروں گا۔ اور پھر اسی جگہ اپنا سکہ چلاؤں گا جہاں کبھی میرے مورثِ اعلیٰ چلا چکے ہیں" یہ امنگ محض ایک طفلانہ جوش نہ تھی عمر کے ساتھ اس کی یہ دھن بھی بڑھتی گئی۔ خدا نے اس کو استطاعت بھی دی۔ اُس کو اپنے پیشہ میں امیدوں سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی جس سے اُس کی دولت و ثروت پانی کی طرح بڑھتی رہی۔ اس کو سل اور دق اور معدہ کی بیماریوں کے علاج میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جراحی میں بھی مشاق تھا۔ ٹھیک ٹھیک تو معلوم نہیں مگر سُنا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی سات سال کی ملازمت میں پچاس ساٹھ ہزار روپئے بینک میں جمع کر لئے۔ اُس نے دو رئیس زادوں کو مہلک امراض سے بچا لیا تھا۔ اور پانچ پانچ ہزار روپئے یکمشت مل گئے تھے۔ اب اُن ریاستوں سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپئے ماہوار مل رہے تھے۔ جب کبھی وہاں کوئی بیمار ہوتا تھا تو ابوالخیر ہی بلایا جاتا تھا اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتا تھا اُس کو اپنا ہرج کرکے جانا پڑتا تھا۔ ابوالخیر نے جب دیکھا کہ اس کے پاس کافی سرمایہ ہو گیا ہے تو اسکو اپنے بچپن کا عہد پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ اسی نیت سے اس نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور مادھوپور میں کچھ زمین خریدکر مکان بنوانا شروع کیا۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ وہ تارک الدنیا ہوکر بندگانِ خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابوالخیر یہ چاہتا بھی تھا اس کو تجربہ ہو چکا تھا کہ طبی امداد کی سب سے زیادہ ضرورت دیہاتوں میں ہے جہاں لوگ حفظانِ صحت کے اصول سے قطعاً ناآشنا ہیں اور جہاں وقت پر کوئی طبی مدد نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن اس کی اصلی غرض اپنے شہر میں شہر یاری کرنی تھی اور اسی غرض نے اس کو اس کورِدہ میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا جس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ یہاں سب سے پہلے جس باوقار شخص سے ابوالخیر کا تعارف ہوا وہ میر قربان علی تھے جو ایک دن کسی ضرورت سے قریب کی تحصیل میں کسی ضرورت سے تحصیلدار صاحب سے ملنے گئے تھے۔ ابوالخیر بھی وہاں کسی مریض کو دیکھنے گیا تھا۔ اس وقت اس کو مادھوپور میں رہتے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے مگر اب تک اس نے قربان علی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی تحصیلدار صاحب سے ابوالخیر کے نسب نامہ کا حال معلوم ہوا تو قربان علی پر ایک طرح کا رعب طاری ہو گیا اور وہ نہایت تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ڈاکٹر سے ملے مگر ڈاکٹر کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی خاندانی فوقیت کا احساس ہے اور وہ میر قربان علی کے ساتھ خلوص محبت

سے نہیں پیش آسکتا ۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میر قربان علی کا گھر اس کی خاندان بربادی کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا ۔ ایسی حالت میں اُس کو میر صاحب سے مقابلہ کرنا تھا نہ کہ دوستی کرنا ۔ ابوالخیر سُن چکا تھا کہ میر صاحب کے باپ دادا سیدوں کے نوکر نہیں تو مصاحب اور ندیم کی حیثیت ضرور رکھتے تھے اور اُنھیں کی دی ہوئی روٹی پر جیتے تھے ۔ سیدوں کے ادبار کے ساتھ ساتھ اِن کا ستارہ چمکنا شروع ہوا تھا اور آج میر قربان علی ابوالخیر کے ہم رتبہ بنے بیٹھے تھے ۔ ابوالخیر کو قدرت کا یہ مسخرہ پن کچھ تلخ سا معلوم ہوا ۔ اس کے علاوہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کی بنا پر بھی میر قربان علی کو ہیچ سمجھنے کا حق رکھتا تھا ۔ وہ اُن سے اتنا مکمل کرنا ملا جتنا کہ امید کی جا سکتی تھی ۔

ابوالخیر کی طبیعت کچھ عجیب معجون مرکب تھی ۔ اس میں جتنی خصوصیتیں تھیں وہ سب آپس میں متضاد اور متخالف تھیں وہ طبعاً رنگین مزاج تھا اور اس میں وہ عیاشی اور لذت پرستی بدرجۂ تمام موجود تھی جو اس کے خاندان کا امتیازی تمغہ تھی ۔ وہ ابتک نہ جانے کہاں کہاں "عشقبازی" کر چکا تھا اور اس کو سیری نہ ہوئی تھی ۔ جہاں جہاں وہ بہ سلسلۂ ملازمت رہا ۔ اس کی بوالہوسی اور نفسانیت اپنی یادگاریں قائم کرتی رہی ۔ ان میں سے سب سے بڑی یادگار دہلی میں تھی ۔ ملازمت کے دوسرے سال میں وہ دہلی میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا یہاں وہ ایک شریف اور دولتمند تعلقہ دار کے پڑوس میں رہتا تھا ۔ اور اُس کے وہاں آیا جایا کرتا تھا ۔ تعلقہ دار کی بیٹی بڑی حسین تھی ابوالخیر نے اس کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اندر ایک خرخشہ پیدا ہو گیا تھا ۔ اُس نے اس لڑکی پر اپنا جال پھینکا اور کچھ دنوں میں اُس کو اپنے قابو میں کر لیا ۔ لڑکی خود ابوالخیر کی صورت پر فدا ہو چکی تھی اور آتشِ الفت کا مقابلہ کرنا اُس کے اختیار کی بات نہ تھی ۔ اس نے انجام سے بے خبر ہو کر اپنے کو ابوالخیر کے سپرد کر دیا ۔ ابوالخیر بھی عرصہ تک یقین دلاتا رہا کہ اُس کی محبت پائدار ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ راز طشت از بام ہو گیا ہے اور لڑکی کے گھر والے بر سرِ انتقام ہیں تو ابوالخیر نے درخواست دیکر اپنا تبادلہ کرا لیا ۔ اور پھر پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُس نیم بسمل کا کیا حال ہے ۔ بدنصیب لڑکی مدتوں اس رنج میں بیمار رہی اور آخر کار رو پیٹ کر صبر کر لیا ۔ ابوالخیر کی نفس پرستی اب تک بدستور تھی ۔ ادھر پور آئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ اس کی نظرِ انتخاب رکمنی پر پڑی جو کنکٹ پور کے ایک اہیر کی بیوی تھی اور جو ابوالخیر کے وہاں دودھ بیچنے جایا کرتی تھی ۔ ابوالخیر کے پاس سب سے بڑا منتر اس کی صورت تھی جو دلوں پر کھب کر رہ جایا کرتی تھی ۔ رکمنی اس منتر سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکی ۔ ڈاکٹر اور رکمنی میں جو تعلقات تھے اُن کا علم عرصہ تک کسی کو نہ ہوا ۔

اِن بے عنوانیوں کے باوجود ابوالخیر اپنے صدہا ہم مشربوں کی طرح زندگی میں ناکام اور پریشان حال نہ تھا ۔ وہ اقبال مند تھا اور دنیا میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا ۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر تھا اگرچہ سائنس کے ساتھ اس کو جو دلچسپی تھی وہ فطری نہ تھی بلکہ اکتسابی تھی ۔ اس سے اس کے ارادہ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے ۔ ابوالخیر اپنے بزرگوں کی طرح ناعاقبت اندیش نہ تھا ۔ اس کو روپیہ کی قدر تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ لالچی اور زر پرست تھا ۔ صرف بجا کا تو ذکر ہی بے کار آج تک اُس نے بجا طور پر بھی بلا دیر تک سوچے سمجھے ایک پیسہ نہیں صرف کیا ۔ اس کی کامیابی کا اصل راز یہی تھا ۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں رہتا اپنے خلق و مروت سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتا وہ غریبوں کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا اور اُن کے ساتھ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ کرتا اگرچہ اس خوبی کے پہلو بہ پہلو اس میں رعونت بھی بے انتہا تھی جس کی ایک مثال اس کا وہ خشک اور خوددارانہ برتاؤ بھی تھا ۔ جو اُس نے قربان علی کے ساتھ کیا تھا ۔

بہر حال ابوالخیر کو زندگی میں پہنچنے کا فن معلوم تھا۔ تقدیر بھی کچھ موافق نظر آ رہی تھی۔ اس کو پورا یقین تھا کہ جس ارادہ سے وہ ادھو پور میں آیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اُس کو آئے ہوئے اور مکان کی بنیاد ڈالے ہوئے قریب قریب چھ ماہ ہو گئے تھے۔ جس وقت احمد اس کو مالتی کے باپ کے لئے بلانے آیا تھا اس وقت مکان کی تعمیر کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا۔ صرف کچھ ادھر اُدھر کا کام باقی رہ گیا تھا۔ یہ ابوالخیر کی فتح کا پہلا باب تھا جو یقیناً امید افزا تھا اور جس کے خیال سے ابوالخیر کی امنگیں بڑھ رہی تھیں۔

(۴)

بدورا لکھنؤ میں چھ برس رہ چکی تھی۔ اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ پرانے نظام تمدن کے لحاظ سے اس عمر تک لڑکی کو بٹھائے رہنا معیوب تھا۔ قربان علی نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا کہ ابتک اس موضوع پر جو چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اُن کی طرف سے کان بند کر لئے تھے مگر اب وہ خود بھی بدورا کی شادی زیادہ دنوں تک ملتوی رکھنے کو برا سمجھ رہے تھے۔ بدورا کو اب لکھنؤ رہنے کی اُن کی رائے میں مطلق ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے لڑکی کو پھوپھی کے پاس سے بلا لیا۔ گاؤں والوں میں اس کے تذکرے ہونے لگے تھے کہ اب بہت جلد احمد اور بدورا کی شادی رچائی جانے والی ہے۔ وہ احمد کا سہرا دیکھنے کے مشتاق تھے۔ احمد دیہاتوں میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ اس لئے کہ اس کو اُن کے ساتھ خلوص تھا۔ وہ خود اپنے کو انھیں فلاکت زدہ مگر پاک سرشت اور صاف باطن لوگوں میں سے سمجھتا تھا اور اُن کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتا تھا کہ گویا وہ اُس کے اپنے ہیں۔ گاؤں میں ہر شخص کو معلوم تھا کہ احمد بدورا کی پرستش کرتا ہے۔ اور اب ہر شخص اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جبکہ احمد کی دیوی اس کا گھر آباد کرے گی۔ بدورا کو کنک پور آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اور احمد بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ بدورا اُسکی اپنی ہو جائیگی۔ اگرچہ قربان علی نے ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی گفتگو نہیں کی تھی۔ جو کوئی اُن سے پوچھتا کہ بیٹی بیاہنے کا ارادہ کب تک ہے تو وہ مختصر اور مبہم جواب دیدیتے کہ "بس پانچ چھ مہینوں میں"۔ احمد عجیب انتشار اور بے چینی میں مبتلا تھا اگرچہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھا رہی تھی۔ وہ اطمینان سے محروم تھا۔ قربان علی کے سکوت سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور پھر بدورا میں جو تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن سے بھی اس کو اندیشہ تھا۔ ادھر اُس نے دو تین بار بدورا کو دیکھا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ بدورا کچھ اس سے اجنبی اور بیگانہ ہو گئی ہے۔ وہ اُس کے بچپن کی بدورا نہ معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ احمد کے جذبات محبت میں کوئی فرق ہو گیا تھا۔ وہ اسکو اسی طرح جی جان سے چاہ رہا تھا اور اس کی دل گرفتگی کا اصل سبب بھی یہی تھا۔ بہر حال احمد اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اور امید کا دامن پکڑے ہوئے اور تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔

بدورا میں جو تغیر ہو گیا تھا وہ واقعی ایسا تھا کہ خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔ بدورا کی جگہ آج اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو شاید وہ اس گندی فضا میں اب سانس لینا بھی گوارا نہ کرتی۔ لیکن کنک پور بدورا کا مولد و موطن تھا اور اس لئے اُسکی نظر میں سارے جہان پر فوقیت رکھتا تھا۔ اُس کو کنک پور کے ساتھ کچھ ایسی شدید محبت تھی جس کو بدورا کی شہرت بھی کم نہ کر سکی۔ اس جذبۂ وطن پرستی نے اس کی مدنیت کے ساتھ مل کر ایک عجیب اثر پیدا کیا تھا۔ بدورا کا ارادہ تھا کہ اپنے گھر میں ایک مکتب کھولے جس میں وہ خود گاؤں کے

لڑکوں لڑکیوں کو پڑھائے لکھائے اور اس طرح اُن کو شہریوں کی طرح مہذب اور شائستہ بنائے۔ احمد کے ساتھ اس کو بچپن سے لگاؤ تھا اسمیں البتہ نمایاں فرق ہوگیا تھا۔ وہ یہ تو تسلیم نہ کرسکتی تھی کہ اب اس کو احمد سے اگلی سی شدید محبت نہیں رہی۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ احمد پختہ مغز ہے اور اُسکی محبت میں سر مو فرق نہ ہوا ہوگا۔ بایں ہمہ اب وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ آخر احمد کی بیوی بننا خود اسکے حق میں کہانتک بہتر ہوگا اس لئے کہ دونوں کے مذاق معاشرت میں بھول اور خاشاک کی نسبت تھی۔ بدورا اب شوہر کا ایک بلند معیار اپنے ذہن میں قائم کر چکی تھی۔ قربان علی نے بھی بیٹی کے طور طریقہ میں جو تبدیلی ہوگئی تھی اس کو محسوس کر لیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اس کو اس کے مذاق کا شوہر ملنا چاہئے۔ لہٰذا اب یہ مسئلہ اُن کے لئے اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ پہلے وہ سمجھ رہے تھے۔ اب اُن کے ارادہ میں تزلزل شروع ہوگیا تھا۔ لیکن احمد کے ساتھ اگر بیٹی کی شادی نہ کریں تو پھر کس کے ساتھ کریں ؟ اس سوال کا جواب اُن کے پاس کوئی نہ تھا اس لئے احمد کے خیال کو چھوڑ نہ سکتے تھے وہ فکرمند تھے اور ابھی کسی فیصلہ پر پہونچ نہ سکے تھے۔

بھادوں کا بے اعتبار موسم تھا۔ ساون اپنا کرتب دکھا چکا تھا تا حد نظر زمین زمردین چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کسان بڑی سرگرمی کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اس لئے کہ کھیتوں میں دھان کے ساتھ گھاس کا بھی پورا زور تھا جس کو کاشتکار اپنے اپنے کھیتوں سے کٹا کر علٰحدہ کرا رہے تھے۔ احمد امیر نگر کی پوربی سرحد پر پختہ سڑک کے کنارے اپنی سیاہ چھتری لئے ہوئے ایک کھیت کی مینڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھیت میں مزدور لگے ہوئے تھے۔ جن میں اکثر تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ ان بدقسمتوں پر موسم کا پورا اثر تھا عورتیں جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔ جس طرف نظر اٹھا لیجئے یہی سماں تھا۔ ان کی لمبی تانوں سے فضا لرزاں تھی۔ احمد سوچ رہا تھا کہ دیکھئے خدا کی ایک یہ بھی مخلوق ہیں جو آسودگی اور مسرت کے راز سے واقف ہیں۔ ان کو کبھی دو وقت پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوتا اسپر بھی وہ کسقدر خوش و خرم ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ایک وہ مخلوق ہیں جن کو ہر طرح کی نعمت اور آرائش میسر ہے مگر سکون و طمانیت کے خواب سے بھی وہ محروم ہیں۔ احمد برابر کہا کرتا تھا کہ ان میں سے ایک ہابیل کی نسل ہے۔ دوسری قابیل کی۔ وہ اسی خیال میں گم تھا کہ فاختہ کا یک جوڑا اڑکر آیا اور اس کے سامنے ببول کے ایک چھوٹے سے درخت پر بیٹھ گیا۔ احمد کی نگاہ اوپر اُٹھ گئی۔ دیکھا تو دونوں آپس میں راز و نیاز کا اظہار کر رہے تھے۔ احمد کے خیال کا مرکز بدل گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کو کبھی زمانہ اس کا موقع دے گا کہ وہ بھی اسی طرح بدورا کی خدمت میں اپنا ہدیۂ نیاز پیش کرے۔!

مطلع ابھی بالکل صاف تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ ہر شخص پسینہ میں تر تھا۔ دفعتہً ہوا کے جھونکے چلے اور ان میں خنکی پیدا ہوئی دیکھتے دیکھتے بادل کے سیاہ منتشر ٹکڑے جو ابھی تک آسمان پر مست آواروں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے ایک جگہ اکٹھا ہوگئے اور بوندیں گرنی شروع ہوگئیں۔ بات کی بات میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ احمد کو دکر سڑک پر ہو رہا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے چھتری لگا کر بیٹھ گیا۔ مزدور بھیگ بھیگ کر اسی طرح اپنا کام کر رہے تھے بلکہ اُن کے ترانوں کا جوش کچھ اور بڑھ گیا تھا کچھ دیر یونہی گزری ہوگی کہ احمد نے دور سے مالتی کو آتے ہوئے دیکھا۔ احمد نے سمجھا کہ مالتی کہیں اپنے کسی کام سے جاتی ہوگی جب سے بدورا واپس آئی تھی اور گاؤں میں احمد کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے مالتی کا برتاؤ احمد کے ساتھ کچھ کھنچا ہوا سا تھا۔ اگرچہ وہ

اب بھی اُس کے گھر کا کام آکر کر جایا کرتی تھی۔ احمد اس کشیدگی کو محسوس کرتا تھا اور اس کے معنی سمجھتا تھا۔ عرصہ سے وہ دیکھ رہا تھا کہ ما
اُس کی گرویدہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کے حال پر احمد کو رحم ضرور آتا تھا اور بعض اوقات وہ اس کے لئے اپنے اندر وہ جذبات بھی پاتا تھا
جنکو محبت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسکو دُنیا کے رسوم و قیود کی پروا تھی بلکہ اس لئے کہ اس
سر میں پندورا کا سودا سمایا ہوا تھا۔

مالتی سیدھی آکر جہاں احمد بیٹھا ہوا تھا وہاں کھڑی ہو گئی اور چند منٹ تک احمد کو غور سے دیکھتی رہی۔ احمد نے حیرت سے
پوچھا "کہو مالتی خیریت تو ہے؟ اس آندھی پانی میں یہاں آنے کی کون سی ضرورت تھی؟"

"ضرورت نہ ہوتی تو آتی کیوں؟" مالتی نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔ پھر آہستہ سے کہا "مجھکو آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے معلوم
ہے کہ آپ کو سُنکر دُکھ ہوگا مگر میں بغیر کہے نہیں رہ سکتی"۔ احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے کہا "جلد کہو کیا ہے؟" پانی کا زور بڑھ گیا تھا
دن دوپہر شام معلوم ہوتی تھی۔ مالتی سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی "اب آپ کیا کریں گے؟ میر صاحب اپنی بیٹی کی شادی ڈاکٹر صاحب
کے ساتھ کرنے والے ہیں۔ وہی ڈاکٹر جو اُسدن ایسے نازک وقت میں بھی مجھکو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے"۔ احمد کو ایسا محسوس ہوا
کہ یکایک دنیا خلا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی کی آنکھوں میں طنز تھا۔ احمد نے سر پکڑ لیا۔
گھبرا گئی اُس نے اپنے لہجہ کو بدل کر کہا "ذرا ضبط سے کام لیجئے۔ آخر آپ کسی ایسے کے لئے کیوں کڑھتے ہیں جس کو آپ کی پروا نہ ہو
آپ کی نہ ہونا چاہے یا نہ ہو سکے؟" حالانکہ مالتی خود ایک ایسے ہی شخص کیلئے کڑھ رہی تھی۔ احمد نے اس سوال کی طرف بلا توجہ کئے ہوئے
"مگر یہ تو بتاؤ تم نے یہ خبر کس سے سنی ہے مجھے اس کا ابتک علم نہیں"۔ گویا احمد کو اس خبر کی صحت میں شبہ تھا۔ مالتی نے جواب دیا "
آپ کے لئے دودھ لیکر آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج صبح سے صرف میر صاحب کے گھر میں نہیں بلکہ سارے گاؤں میں اس کا ذکر ہو
آج دس پندرہ دن ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب نے میر صاحب کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔ میر صاحب نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں
تھا مگر کل شام کو انھوں نے سوچ سمجھکر ڈاکٹر صاحب کی درخواست منظور کر لی اور اُس کی اُن کو اطلاع بھی دیدی ہے"۔ اتنا کہکر مالتی رک گئی
وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر پس و پیش کر رہی تھی کہ احمد سے کہے یا نہ کہے۔ احمد کھویا ہوا تھا اور اپنے کو اور اپنے گرد و پیش کو بھولا ہوا تھا۔
نے آخر کار یہ طے کر لیا کہ احمد سے وہ دوسری بات بھی کہدے۔ دیکھے اس کا احمد پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی آواز کو اور بھی دھیما
کر کے کہا "آپ کو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب رکمنی کو بہکا کر خراب کر چکے ہیں۔ اور اب اُس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ رکمنی کو اس کا بڑا رنج ہے
وہ زار زار رو رہی تھی معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری صورت حرام ڈاکٹر کی موہنی شکل پر ریجھ گئی ہے۔ کیسی بے وقوف ہے!" مالتی خود بھی رکمنی
سے کچھ کم بے وقوف نہ تھی اگرچہ دونوں کی بیوقوفی کی نوعیت مختلف تھی۔

احمد اپنی محویت سے چونک پڑا۔ رکمنی گاؤں کی سیکڑوں سیدھی سادی عورتوں کی طرح بے حد معصوم تھی۔ اس کی یہ لغزش
اور فرض فراموشی احمد کے لئے حیرت کی بات تھی۔ مالتی نے احمد کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا "کہئے تو میں کسی طرح میر صاحب کو
اس واقعہ سے خبردار کر دوں۔ شاید اب بھی وہ اپنے ارادہ سے باز آئیں"۔

احمد نے مالتی کو ملامت کرتے ہوئے کہا "ایسی بات کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دینا چاہیئے خیر ڈاکٹر کا پاس نہ سہی لیکن رکمنی کا خیال
نا چاہیئے۔ اس کو رسوا کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں اپنی غرض پوری کرنا نہیں چاہتا۔
ر ہو جو ہو رہا ہے ہونے دو مجھے بھی صبر آجائے گا" آخری جملہ حسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مالتی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ منفعل ہو گئی۔
مطلع پھر بہ ہموار ہو کر صاف و شفاف ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ احمد بدستور پیڑ کے نیچے بیٹھا رہا۔ مالتی وہاں سے اٹھکر چلی گئی۔
اس کے کھیت میں مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگی۔ حالانکہ عرصہ سے اس نے احمد کے وہاں مزدوری نہیں کی تھی۔ آج وہ بلا کسی کے
سنے اس کے مزدوروں میں شامل ہو گئی تھی اور شام تک کام کرتی رہی۔ جب اندھیرا ہونے لگا مزدور اپنے اپنے گھر جانے لگے اور احمد
ں سے روانہ ہو گیا تو مالتی بھی اپنے گھر چلی آئی۔

(۵)

مالتی نے جو خبر احمد کو سنائی تھی اس کی تفصیل یہ ہے۔

ابوالخیر روزانہ شام کو سیر کرنے دور تک نکل جایا کرتا تھا۔ مادھوپور یوں تو کنک پور سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر تھا لیکن
یان میں ایک گھنا جنگل تھا۔ جس میں زیادہ تر ساکھو کے درخت تھے اور جس کا سلسلہ پورب میں دریا کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ شام
س جنگل کے اندر سے کوئی راستہ نہ چلتا تھا۔ مادھوپور سے ایک کچا راستہ جنگل کے پچھم سے گھومتا ہوا پختہ سڑک سے آکر ملجاتا تھا
ہ کو عموماً راہگیر اسی راستہ سے چلتے تھے۔ ابوالخیر بھی روز اسی راستہ سے نکلتا تھا۔ اس سے مادھوپور اور کنک پور کے درمیان پونے
یل کا فاصلہ پڑ جاتا تھا۔ ابوالخیر کی عادت شام کو دور تک چلنے کی تھی۔ وہ مادھوپور سے چلتا تھا اور پختہ سڑک پر رکمنی کے گھر کے سامنے
نا تھا جو سڑک ہی کے کنارے۔ میر قربان علی کے مکان سے کچھ دور ہٹ کر پچھم میں تھا۔ ابوالخیر رکمنی پر ایک نظر ڈالتا ہوا سیدھے پچھم کی طرف
جاتا تھا۔ وہ پورب کی طرف تفریح کرنے جاتا تھا نہیں، اس لئے کہ راستہ میں میر قربان علی کا مکان پڑتا تھا جس کو وہ دیکھنا نہیں
تا تھا۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ لاؤ قربان علی کے مکان پر آج ایک نظر ڈال لیں اس خیال سے آج وہ بجائے حسب دستور
م جانے کے پورب کی طرف مڑ گیا۔

میر قربان علی کا مکان ٹھیک سڑک کے کنارے تھا۔ عمارت دیکھنے میں مضبوط اور پر شوکت معلوم ہوتی تھی۔ سامنے مردانہ حصہ وسیع
شادہ تھا۔ پورب جانب ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جو پختہ اینٹوں کی چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا اور جو عورتوں کے مصرف میں رہتا تھا۔
خیر مکان پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ احاطہ کے وسط میں دروازہ کے سامنے پہونچ کر یکایک وہ ٹھٹھک گیا جیسے
ی آنکھیں چکا چوند ہو گئی ہوں۔ دروازہ کا ایک پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور بدورا بے شعوری کے عالم میں کھڑی قدرت کی نیرنگیوں
ر رہی تھی۔ دیہات میں شرفا بھی پردہ کی پابندی اس سختی کے ساتھ نہیں کرتے جیسا کہ شہروں میں رواج ہے۔ بدورا وغیرہ اکثر
ں کو کھیتوں اور جھاڑیوں میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ بدورا کا اس طرح کھلے سر دروازہ پر کھڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات
۔ شام کی گلابی روشنی اور ہلکی خاموشی میں بدورا جنگل کی کوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھکر بے اختیار یہ مان لینے کو

جی چاہتا تھا کہ جس شراب سے عراقی کا جام پہلی بار لبریز کیا گیا تھا وہ انھیں آنکھوں سے عاریۃً مانگی گئی ہوگی۔ ابوالخیر تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہوگیا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بدورا نے ابوالخیر کو دیکھا تو دروازہ بند کرلیا۔ ابوالخیر چند منٹ تک دم بخود کھڑا رہا اور پھر "فغاں زپردہ نشیناں کہ پردہ دارانند" کہکر جدھر سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہوگیا۔

ابوالخیر سمجھ گیا تھا کہ یہ میر قربان علی کی لڑکی بدورا تھی۔ اُس نے اس کا نام اکثر سُنا تھا لیکن آج ساعت مساعد تھی۔ اُس نے بدورا کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس نے ابتک کسی ایسے حسین پیکر کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اس دن ساری رات بدورا کی آنکھیں اس کو ستاتی رہیں۔ اور آرام سے سونہ سکا دوسرے دن شام کو پھر وہ اسی جگہ پہونچا۔ جہاں اپنا صبر و سکون کھو آیا تھا۔ دروازہ پھر اسی طرح کھلا تھا مگر وہ ابھی اس کے سامنے پہونچا بھی نہ تھا کہ بند کرلیا گیا۔ آج بدورا کل کی طرح بے خبر نہ تھی۔ ابوالخیر مایوس ہوکر واپس جانا چاہتا تھا کہ اُس کے دل نے کہا "آج چلو قربان علی سے مل لو"۔ قربان علی نے اس کو اپنی عزت افزائی سمجھا اور ابوالخیر کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ ابوالخیر کے برتاؤ میں بھی اب وہ خشکی اور بے گانگی نہ تھی۔ مختلف مسئلوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ قربان علی رہ رہ کر ابوالخیر کے ایثار اور نفس کشی کی داد دے رہے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ کسی معمولی انسان کا کام نہ تھا کہ دنیا کی گوناگوں نعمتوا اور دلچسپیوں کی طرف سے منھ موڑ کر ایسے ویرانہ میں اپنے کو خدا کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کردے۔ قربان علی دیکھ رہے تھے کہ ابوالخیر کی شہرت اتنی قلیل مدت میں دور دور تک پھیل گئی تھی ۲۵ کوس کے حلقہ میں کوئی زمیندار ایسا نہ تھا جو ضرورت کے وقت اس کو نہ بلاتا ہو۔ ذی مقدرت کاشتکاروں کے وہاں بھی وہ جایا کرتا تھا۔ اور جو مفلس اور نادار تھے وہ اُس کے وہاں آتے تھے اور وہ اُن کو مفت یا برائے نام قیمت پر دوائیں دیتا تھا۔ قربان علی کے لئے یہ کوئی عام بات نہ تھی۔ اسی اثنا میں قربان علی نے جس محنت و شفقت سے بدورا کی پرورش کی تھی اُس کا بھی تذکرہ چھڑ گیا۔

قربان علی نے فخریہ لہجہ میں کہا "بدورا کا ارادہ ہے کہ گھر میں ایک مدرسہ کھولے اور جو کچھ فائدہ عوام کو پہونچا سکتی ہو پہونچائے دیہات میں جو گندگی اور جہالت پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور وہ خلوص دل سے اس کو دور کرنے کی نیت رکھتی ہے"۔ قربان علی کو اس کا احساس ہوا کہ ابوالخیر نے بدورا کا مختصر ذکر بڑی دلچسپی سے سُنا اور اُن کا غرور بڑھ گیا۔

دوسرے روز صبح کو قربان علی کو ابوالخیر کی ایک تحریر ملی۔ القاب و آداب اور ایک طویل تمہید کے بعد اس کا مضمون یہ تھا۔

"میں نہ جانے کن ناموافق اتفاقات کی وجہ سے ابتک بحرّد کی زندگی بسر کرتا رہا ہوں جو مجھ جیسے آدمی کے لئے قطعاً نازیبا ہے اس طرف اکثر یہ سوچتا رہا ہوں اور اس کی ضرورت بھی محسوس کرتا رہا ہوں کہ مجھکو شادی کرکے اپنا گھر بسانا چاہئے۔ لیکن ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا۔ کل آپ سے ملنے کے بعد بڑی دیر تک غور کرتا رہا اور اگر آپ نے میری درخواست منظور کرلی تو میں اس مسئلہ کو حل شدہ سمجھونگا۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کی تعلیم و تربیت کا کل جو ذکر کیا تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اُن سے بہتر مجھکو کوئی شریک زندگی نہیں مل سکتی۔ میرا شجرہ نسبی تو آپ کو معلوم ہے۔ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی حلال کی کمائی سے اتنی دولت بھی پیدا کرلی ہے کہ عمر بھر آرام و آسائش سے گزار سکوں اور فکر میں ہوں کہ اگر مختصر سی زمینداری بھی خرید سکوں تو خرید لوں

آپ بھی اس مسئلہ پر غور کر لیجئے۔ امید ہے کہ آپ کو مجھے اپنی دامادی میں لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور میں ہر طرح آپ کی توقعات کے مطابق ثابت ہوں گا۔

بندۂ احقر ابوالخیر

قربان علی خط پڑھکر عجیب شش و پنج میں پڑ گئے تھے اور اُن کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر اس گتھی کو کیونکر سلجھائیں۔ وہ ابوالخیر کو بدورا کے لئے بہترین شوہر خیال کرتے تھے۔ لیکن آخر احمد کو کیا کریں جس کا خیال اُن کے دل میں نشتر چبھو رہا تھا۔ پندرہ دن وہ اسی اُدھیڑ بن میں گرفتار رہے آخر کار بیٹی کی بہی خواہی اُن کے ہر جذبہ پر غالب آئی اور انھوں نے ابوالخیر کی درخواست منظور کر لی اور اس کو لکھ بھیجا کہ دسمبر کے مہینہ میں انشاء اللہ شادی ہو جائے گی۔

دوسرے دن رات کو آٹھ بجے انھوں نے احمد کو حسب ذیل عبارت کا ایک خط لکھ بھیجا:۔

"عزیزم۔ گزشتہ سال بھر غور و مطالعہ کرنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا کہ تمھارا اور بدورا کا جوڑ باوجود اس قدر شدید محبت کے موزوں نہیں ہے۔ ابوالخیر کو ترجیح دینے کی یہی وجہ ہوئی۔ احمد میں تمھارا گنہگار ضرور ہوں لیکن بدورا کی محبت نے مجھکو اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور کیا۔ امید ہے کہ تم مجھکو معاف کردوگے۔ اور بدورا اور ابوالخیر کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ رکھوگے۔

دعاگو قربان علی

احمد نے خط پڑھکر ایک تلخ تبسم کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار | بزے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُس کے تبسم سے ٹپکتا تھا کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ سوچنے لگا کہ آخر خط بھیجنے کے کیا معنے ہیں جبکہ وہ قربان علی سے چار قدم پر رہتا تھا۔ اور قربان علی خود آکر یا اُس کو بلاکر اس سے بالمشافہ گفتگو کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شائد مطلب یہ ہے کہ اب ہمارے درمیان معمولی دکھاوے کے بھی تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ احمد نے یہ سب چکر دل میں کہا " خیر یونہی سہی "۔

رات بھیگ رہی تھی۔ شش جہت پر ایک ڈراونی تاریکی مسلط تھی۔ چاند اور ستارے مارے ہیبت کے نہ جانے کس پردے میں روپوش تھے ساری دنیا ایک سیاہ کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تھک کر خاموش تھی۔ رات کی بے شمار آوازیں کانوں میں آرہی تھیں جو سننے والوں کے دل میں عجیب عبرت پیدا کر رہی تھیں ہستی کا ہر نقش کسی کی "شوخیٔ تحریر" کا فریادی بنا ہوا تھا اور معلوم ہوتا تھا زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کراہ رہی ہے۔ نیند جس کو موت کا قائم مقام سمجھنا چاہئے ہر طرف اپنا جادو چلا چکی تھی۔ لیکن احمد اپنے مکان کے سامنے کھلے میدان میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سلگ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو اُس کے رخسار کو جلائے ڈالتے تھے۔ اس کے اندر اس وقت جو شورش تھی اسکو وہ کسی طرح دبا نہ سکتا تھا۔ اتنے میں جنگل سے "پی کہاں"! "پی کہاں"! کی صدا بلند ہوئی اور فضا گونج اٹھی پہلے تو احمد نے ایسا محسوس کیا کہ یہ جانکاہ شور خود اُس کی روح کی گہرائیوں سے اٹھا ہے مگر پھر وہ ہوش میں آگیا اور کہنے لگا " کچھ اکیلا میں ہی

ستم زدہ نہیں ہوں کائنات کا ذرہ ذرہ کسی نامعلوم ظالم کا ستایا ہوا ہے"۔ اس خیال کے بعد احمد کا بستر پر پڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھا اور جبکہ رات کی بھیانک تاریکی ہر شخص کو دھمکا دھمکا کر اپنی اپنی جائے پناہ میں بھیج رہی تھی وہ اپنا ڈنڈا لیکر اسی جنگل میں پہونچا جہاں سے کسی "پیاداسی" نے اپنے پیا کا پتہ پوچھا تھا۔ احمد ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سنتا رہا۔ اس سے اس کو اپنے درد کا احساس کچھ گھٹتا ہوا ضرور معلوم ہوا۔ کوئی پندرہ منٹ اسی عالم میں گزرے ہوں گے کہ احمد کو اپنے سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ آہٹ معلوم ہوئی اور وہ اس خیال سے چونک پڑا کہ اس سنسان جنگل میں وہ اس وقت تنہا نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی ہے جو اس جگہ اسی کی طرح یا تو اپنی دردناکیوں کے احساس کو کم کرنے آیا ہے یا اس کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے۔ اس کو ایک خلش سی پیدا ہو گئی اور وہ تفتیش کرنے کے لئے اٹھا اٹھتے دیر نہ ہوئی تھی کہ سامنے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر ایک عورت جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی۔ احمد نے قد اور چال سے پہچان لیا اور پکارا "مالتی بھاگتی کیوں ہو؟ سنو" مالتی بے بس ہو کر رک گئی۔ احمد نے قریب آکر پوچھا "اس وقت تم کو یہاں کیا کرنا تھا؟ ایسی اندھیری رات میں اور ایسے خطرناک مقام پر تمکو ڈر نہیں معلوم ہوا؟ اور پھر مجھکو دیکھکر بھاگنے کے کیا معنی؟

مالتی نے جواب دیا "آخر آپ بھی تو اسی جگہ ہیں جہاں میں ہوں۔ آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" مالتی کے لہجہ میں ترشی تھی مگر اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ احمد گھبرانے لگا۔ اس نے کہا "میرا حال ناحق پوچھتی ہو۔ جانتی ہو کہ میں زمانہ کا ستایا ہوا ہوں۔ قسمت کا مارا ہوا ہوں اور یہ قسمت آبائی ہے۔ باپ دادا کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ زندگی کو پاپ سمجھتا ہوں پھر میرا کہیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر مالتی تم کو کیا ہوا ہے؟ تمھاری آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم روتی رہی ہو"۔ احمد نے پوچھنے کو تو پوچھ لیا مگر وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کو یہ اعتراف نہ کرنا پڑے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ مالتی ابھی تک اپنے کو سنبھالے ہوئے تھی جیسا کہ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا لیکن احمد کے سوال سے جو اس کو تازہ ٹھیس لگی اس کو برداشت نہ کر سکی اور زار زار رونے لگی۔ احمد کا دل پہلے سے تپک رہا تھا۔ ابھی اسکی آنکھوں سے وہ آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے جو چند منٹ پہلے اس کا تکیہ تر کر چکے تھے۔ مالتی کی یہ حالت دیکھکر اس کی طبیعت پھر امنڈ آئی اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس وقت وہ قطعی اپنے کو قابل نفرین سمجھ رہا تھا۔ اس کو دل پر اختیار نہ رہا اس نے وحشیوں کی طرح مالتی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پوچھنے لگا "کیوں؟ کیوں؟ یہ کیوں؟ مالتی خدا کے لئے کچھ بولو!"

مالتی نے احمد کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہیں چھڑائے۔ اس کو اس سے راحت مل رہی تھی۔ اگرچہ احمد کے ہاتھ اس وقت سرد تھے اس نے احمد کو اسی بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "آپ کیوں بار بار مجھسے پوچھتے ہیں؟ آپ یا تو بڑے سنگ دل ہیں یا واقعی بڑے بھولے ہیں"۔ احمد نے طنز کے ساتھ کہا "ممکن ہے دونوں ہوں" اس کے بعد کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے تجاہل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور مالتی اس پر تلی ہوئی تھی کہ وہ احمد کا اعتراف اس کے منھ سے سن لے۔ آخر احمد نے بھی فیصلہ کر لیا کہ آج مالتی سے کھلے الفاظ میں گفتگو کرے اسنے مالتی کو اور قریب کھینچکر کہنا شروع کیا "مالتی تم سمجھتی ہو گی کہ میں تمھاری اصل حالت سے ناواقف ہوں یا اگر واقف ہوں تو تمھاری طرف دھیان دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھکو سنگ دل کہتی ہو حالانکہ مجھکو تم سے جو ہمدردی رہی ہے وہ تم خوب جانتی ہو۔ میں اپنے کو دھوکہ ضرور دینا چاہتا تھا اس لئے کہ بدورا کی صورت بچپن سے میرے دل پر اس طرح نقش ہو چکی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی۔ آج میں ایسا محسوس

کر رہا ہوں کہ اس جنم میں مجھکو جو سزائیں بھگتنا تھیں اُن کی حد ہو چکی ہے اور اب مجھکو کچھ کرنا دھرنا نہیں ہے "۔ مالتی نے جلکر کہا "جسطرح کسی کی صورت آپ کے دل میں گھر کر چکی ہے اسی طرح آپ میرے دل میں ۔نہیں ۔میرے ریشہ ریشہ میں گھر کر چکے ہیں ۔ اسکا جواب آپ کے پاس کیا ہے ؟ ہاں اسکا کوئی جواب نہ تھا ۔ جاہل مگر ذہین اور ذکی الحس مالتی نے نہایت سادہ پیرایہ میں اُن جذبات کا اظہار کر دیا تھا جو کسی نازک خیال شاعر کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کر سکتے تھے ۔ احمد قائل ہو گیا تھا ۔ وہ اسوقت مالتی کے چہرہ کا اور اُسکی ایک ایک شکن کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا مگر اُس کو بجز ایک دھندلے پیکر کے اور کچھ نظر نہ آ رہا تھا ۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے ایک آہ کی اور کہا " مالتی للہ مجھکو سمجھاؤ کہ مجھ میں کون سی ایسی خوبی ہے جسکی وجہ سے تم اس قدر محبت کرتی ہو ۔ میں جو دنیا میں ایسا بدبخت ہوں جس کا دل ہر وقت دکھا کرتا ہے جس کو جینے سے نفرت ہے ؟ "

مالتی کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا ۔ اُس نے جواب دیا " یہ مجھ سے نہ پوچھیئے میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیوں آپ کی محبت کرتی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میں آپکو چاہتی ہوں ۔ ہر گھڑی آپ کے خیال میں مگن رہتی ہوں ۔ اگر آپ بدبخت ہیں تو مجھے آپ کی بدبختی سے عشق ہے ۔ آپکا دل دکھا کرتا ہے تو میں اس دکھتے ہوئے دل کو پوجتی ہوں ۔ اگر آپ کو جینے سے نفرت ہے تو مجھکو آپ کی نفرت سے محبت ہے اور یہ محبت کچھ ایسا مجھ پر چھا گئی ہے کہ مجھے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ میں ہندو ہوں ۔ محبت میرا دھرم ہو کر رہ گئی ہے " مالتی کا جوش دھیرے دھیرے بڑھ گیا تھا اور احمد ششدر تھا ۔ وہ اسوقت اپنے کو اور اپنی بدبختی کو بھول گیا تھا ۔ اُس نے بے اختیار ہو کر مالتی کو لپٹا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیکر کہا " مالتی تم ہندوستان کی اُن عورتوں میں سے ہو جنکی ذات سے ستیا ۔ ساوتری اور دمینتی کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے میں منحوس ہوں جو تمہاری قدر نہیں کرتا ۔ آج سے تم مجھکو اپنا سمجھو اور اب میں بھلا اور کس کا ہو سکتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ اگر خود میری زندگی خراب و برباد ہو گئی ہے تو میں تمہاری تمناؤں کا بھی خون کر کے تمکو مٹا دوں ۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مجھکو ڈیڑھ دو سال تک آزاد رہنے دو اور اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا ماتم کر لینے دو ۔ سمجھنا کہ بدورا کا سوگ لئے ہوئے ہوں اس درمیان میں ہم ایک دوسرے کے اسی طرح رفیق رہینگے جس طرح ابتک رہتے ہیں ۔ اس کے بعد تم جو کہنا میں اُس کی تعمیل کرنے کے لئے تیار رہونگا اب میرا اُس دنیا میں تمہارے سوا کون ہے ؟ " اس عہد کو محکم بنانے کے لئے اس نے مالتی کو پھر پیار کیا ۔ اب احمد پر ایک ستم کا ردعمل شروع ہو رہا تھا اور اس کا دل سرد ہونے لگا تھا ۔ بدورا پھر یاد آ رہی تھی ۔

مالتی نے اپنے کو اب علانیہ احمد کی خدمت اور نگہداشت کے لئے وقف کر دیا اور دن رات اس کے گھر کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگی ۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ احمد اب اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا ۔ احمد نے بھی بڑی بڑی کوششوں کے بعد مالتی کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا تھا ۔ گو کہ اب بھی کسی صورت سے اس کو شگفتہ نہیں کہا جا سکتا تھا ۔ اُس کی آزردگی اور پژمردگی بدستور باقی تھی شہر طرف یہ بات مشہور ہونے لگی تھی کہ مالتی احمد پر عاشق ہے اور اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی ۔ مالتی کی برادری والوں نے مالتی کی شادی کی بڑی کوشش کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا اس سے لوگوں کا خیال اور بھی مستحکم ہو گیا ۔ اگر احمد کے چال چلن کا سکہ نہ بیٹھ چکا ہوتا تو نہ جانے مالتی کی گرویدگی کا کیا اثر ہوتا لیکن چونکہ احمد کو لوگ فقیر منش سمجھ رہے تھے اس لئے اس کی طرف سے

نہ کوئی بدظن ہوا اور نہ مالتی کے خلاف کوئی غصہ پھیلی۔

احمد نے خط پانے کے بعد سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب نہ وہ بدورا سے ملیگا اور نہ اُس کے گھر والوں سے۔ چنانچہ اُس نے کنک پور کی سرزمین قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بدورا کی شادی میں بھی نہیں شریک ہوا اور ایک دفعہ جبکہ بدورا نے رنج کے طور پر بلا بھیجا تو اُس نے جواب میں صرف اتنا لکھ دیا کہ "اب مجھکو اپنے حال پر چھوڑ دو"۔ وہ بدورا سے بے نیاز ہو سکا تھا یا نہیں؟ اس کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اب اُسکی وہ حالت ضرور تھی جس کو شاعر کی اصطلاح میں "بے دماغی" کہہ سکتے ہیں اور جس کی بنا پر عشق کا مرتبہ عموماً حُسن سے بھی سبقت لیجاتا ہے۔ دسمبر کا مہینہ آگیا اور بدورا کی شادی ابوالخیر سے ہوگئی۔ جشن تقریب میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ سنا گیا ہے کہ عین اسوقت جبکہ بدورا حجلۂ عروسی میں داخل کیجا رہی تھی کہیں سے بلی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ ہر شخص کانپ گیا تھا۔ دبی زبان سے ہر جگہ اس کا چرچا ہو رہا تھا مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس واقعہ کا علانیہ ذکر کرے۔

بدورا کو احمد کے ساتھ کمسنی سے جو قلبی ارتباط تھا اس میں کوئی کمی ہوئی تھی یا نہیں اس جگہ اس سے بحث کرنا بے محل اور بیکار ہے۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ اپنی شادی سے خوش تھی اور ابوالخیر کو اپنے معیار کا شوہر سمجھ رہی تھی جس سے اُسکی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

(باقی) مجنوں گورکھپوری

فردوسِ محبت

اے کاش! کھلیں آنکھیں گہوارۂ عشرت میں
اے کاش! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش!! پہنچ جاؤں کاشانۂ راحت میں
اے راہ نما لے چل
فردوس محبت میں

خوابیدہ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورش گہ ہستی سے بیزار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں
اے خضر وفا لے چل
فردوس محبت میں

ہے مشغلۂ دنیا توہین وفاداری
ہر ذرۂ ہستی ہے تصویر دل آزاری
انسان رہے کب تک محو غم خودداری
اے مرد خدا لے چل
فردوس محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدائیں ہیں
غم ریز ہیں نظارے خوں بار فضائیں ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضائیں ہیں
اے شمع ہدیٰ لے چل
فردوس محبت میں

اب شمع کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

نہ کوئی بدظن ہوا اور نہ مالتی کے خلاف کوئی شورش پھیلی ۔

احمد نے خط پانے کے بعد سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب نہ وہ بدوڑا سے ملیگا اور نہ اُس کے گھر والوں سے ۔ چنانچہ اُس نے کنک پور کی سرزمین قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ بدورا کی شادی میں بھی نہیں شریک ہوا اور ایک دفعہ جبکہ بدورا نے بچے کے طور پر بلا بھیجا تو اُس نے جواب میں صرف اتنا لکھ دیا کہ "اب مجھکو اپنے حال پر چھوڑ دو" وہ بدورا سے بے نیاز ہو سکا تھا یا نہیں ؟ اس کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن اب اُسکی وہ حالت ضرور تھی جس کو شاعر کی اصطلاح میں "بے دماغی" کہہ سکتے ہیں اور جس کی بناپر عشق کا مرتبہ عموماً حُسن سے بھی سبقت لیجاتا ہے ۔ دسمبر کا مہینہ آگیا اور بدورا کی شادی ابوالخیر سے ہوگئی جشن تقریب میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ۔ سنا گیا ہے کہ عین اسوقت جبکہ بدورا حجلۂ عروسی میں داخل کیجا رہی تھی کہیں سے بلی کے رونے کی آواز آئی تھی ۔ ہر شخص کانپ گیا تھا ۔ دبی زبان سے ہر جگہ اس کا چرچا ہو رہا تھا مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس واقعہ کا علانیہ ذکر کرے

بدورا کو احمد کے ساتھ کمسنی سے جو قلبی ارتباط تھا اس میں کوئی کمی ہوئی تھی یا نہیں اس جگہ اس سے بحث کرنا بے محل اور بیکار ہے ۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ اپنی شادی سے خوش تھی اور ابوالخیر کو اپنے معیار کا شوہر سمجھ رہی تھی جس سے اُسکی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔

(باقی) مجنوں گورکھپوری

فردوسِ محبت

اے کاش! کھلیں آنکھیں گہوارۂ عشرت میں
اے کاش! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش!! پہنچ جاؤں کاشانۂ راحت میں

اے راہ نما لےچل

فردوسِ محبت میں

خوابیدۂ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورشِ گہِ ہستی سے بیزار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں

اے خضرِ وفا لےچل

فردوسِ محبت میں

ہے مشغلۂ دنیا توہینِ وفا داری
ہر ذرۂ ہستی ہے تصویرِ دل آزاری
انسان رہے کب تک محوِ غمِ خود داری

اے مردِ خدا لےچل

فردوسِ محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدائیں ہیں
غم ریز ہیں نظارے خوں بار خلائیں ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضائیں ہیں

اے شمعِ ہدیٰ لےچل

فردوسِ محبت میں

اب شمعِ کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

اللہ کے گھر کی بھی توقیر نہیں باقی

اے میری دعا لے چل

فردوس محبت میں

اس جنت زریں میں انوار کے چشمے ہیں
آرام کے دریا ہیں "اپکار" کے چشمے ہیں
تقدیس کی نہریں ہیں ایثار کے چشمے ہیں

اے بحر عطا لے چل

فردوس محبت میں

اس بزم کا ہر گوشہ کاشانۂ راحت ہے
اس خلد کی ہر محفل نخانۂ راحت ہے
اس خاک کا ہر ذرہ افسانۂ راحت ہے

اے خلد نما لے چل

فردوس محبت میں

اس دامن زریں میں معصوم نظارے ہیں
اس وادی رنگیں میں معصوم نظارے ہیں
اس محفل تسکیں میں معصوم نظارے ہیں

معصوم وفا لے چل

فردوس محبت میں

ہر باغ میں الفت کی نہریں مترنم ہیں
ہر نہر میں عشرت کی موجیں مترنم ہیں
ہر موج میں راحت کی لہریں مترنم ہیں

اے نغمہ سرا لے چل

فردوس محبت میں

رنگینی الفت سے گلریز ہے ہر گوشہ
فیاضی فطرت سے زرخیز ہے ہر گوشہ

ارباب محبت سے لبریز ہے ہر گوشہ
اے شوخ ادا چل
فردوس محبت میں

اس "نور" کو راحت کی کرنوں نے بنایا ہے
اس "گیت" کو فطرت کے تاروں نے بنایا ہے
اس خلد کو الفت کے ذروں نے بنایا ہے
اے مست وفا چل
فردوس محبت میں

اس باغ کا ہر غنچہ تقدیس کا بوسہ ہے
اس ساز کا ہر نغمہ تسلیم کا سجدہ ہے
اس نور کا ہر شعلہ تسکین کی دنیا ہے
اے ہوش ربا چل
فردوس محبت میں

گلزار بہاروں سے شاداب ہے ہر کیاری
انوار کی نہروں سے سیراب ہے ہر کیاری
اک کیف ہے ہر غنچہ اک خواب ہے ہر کیاری
اے روح فزا چل
فردوس محبت میں

تغیر و تبدل سے آزاد ہے وہ دنیا
مسرور ہے وہ دنیا دلشاد ہے وہ دنیا
آغوش محبت میں آباد ہے وہ دنیا
چل راہبر خدا چل
فردوس محبت میں

روشن صدیقی

موت

فطرت کا التفات کہیں! یا جفا کہیں!
حیرت میں ہیں، کہ موت کے منظر کو کیا کہیں!

انجام بود ہے کہ یہ آغاز نیست ہے!
کوئے فنا کہیں! درِ دارِ بقا کہیں!

سنتے ہیں جب عوام کی آہ و بکا کا شور
جی چاہتا ہے موت کو کوسیں برا کہیں

لیکن ادھر ہے فلسفیٔ حال کی پکار
کیوں موت کو نہ خضرِ رہِ ارتقا کہیں؟

خوابِ گراں سے کیوں اُسے تعبیر کیجیے؟
کیوں ہم نہ اس کو پنجۂ مشکل کشا کہیں؟

وابستۂ گہر نمود سے ہے بودِ زندگی
پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں

لیکن اگر "نمود" کرشمہ ہے بود کا
کیوں موت کو نہ زیست کا اک شعبدہ کہیں"

آنکس زندہ است و ندارد حیات را
در حیرتم چہ طور بداند ممات را

امین حزیں

باسط بسوانی

دونوں راہیں چھوڑ دی ہیں ہمنے مشکل دیکھکر دیر و کعبہ کون جائے۔ وسعت دل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کچھ تو لازم تھا خیال اک ناتواں کا دوستو ساتھ میرا چھوڑتے۔ دو چار منزل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

غور سے دیکھا تو پایا اک جہانِ آرزو مجھکو حیرت ہوگئی ہے۔ وسعت دل دیکھکر
قیس کو محمل سے لیلا دیکھکر ہنستی رہی قیس کیوں روتا رہا لیلیٰ کا محمل دیکھکر
اشتیاق بزم عقبیٰ لیچلا سوے عدم سب کوئی اکتا گیا۔ دنیا کی محفل دیکھکر
بے بلائے کیوں گئے ہم ان کی بزم ناز میں بے اٹھائے کیوں اٹھے ہم رنگ محفل دیکھکر
حق بجانب تھا اگر صیاد کو ہوتی خوشی پھول کیوں ہنسنے لگے خون عنادل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

باسطِ شوریدہ سر ہنستا رہا بیٹھا ہوا
اور سب روتے تھے اسکی وحشت دل دیکھکر

جگر بریلوی

کوئی بُرا کہے کچھ مجھکو ناگوار نہیں کہ دل کے آگے کسی کا گناہگار نہیں
ابھی نہیں ہوئی تکمیلِ ضبطِ جوشِ جنوں ٹھہر ٹھہر ابھی خلوت خیال یار نہیں
دعاے مرگ مفاجات ہی یہ دیر دہ ہمیں زمانۂ راحت کا انتظار نہیں
وہ غم تھا داغ کلیجہ میں جس کہ باقی ہے یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

نگاہ پھیر نہ مجھ سے کہ دل لرزتا ہے بشر ہوں میں مری ہستی کا اعتبار نہیں

جو پھونک دے نہ کلیجہ نہیں وہ آتشِ گل
جو آگ بن کے نہ دل میں لگے بہار نہیں

چل اب خدا کے لئے خاکِ دشت پر پڑ رہیں
چمن میں اے دلِ ناداں مجھے قرار نہیں

جہاں کا شور ہے کانوں میں نقش آنکھوں میں
نہیں جگر تم ابھی محوِ انتظار نہیں

حافظ غازی پوری

مرے گریہ میں شبِ تارِ غم وہی آہ بے اثری رہی
کہ وہ شمعِ کشتۂ درد ہوں جو نہ جل سکی تو دھری رہی

مجھے دوریوں سے گلہ نہیں کہ ہوں شیدۂ ستم آشنا
جو خیال ہے تو یہی ہے اب نہ وہ پہلی جلوہ گری رہی

- -

کوئی جلوہ بار جو ہو گیا مری کائنات حقیر پر
تو ازل سے تا بہ ابد مجھے وہی ایک بے خبری رہی

یہ تغیرات و حدوث کیا مرے رنگ بو کو مٹا سکیں
ہوں وہ شاخِ گلشنِ راز میں جو خزاں میں بھی ہری رہی

کہوں کیا وہ خاص تھی کیفیت جو ملی جبینِ نیاز کو
وہی رازدارِ سجود تھی وہی وجہ بے خبری رہی

نہ وہ ذوقِ لطفِ سحر ہے اب نہ صبوحیوں میں شراب
وہ بہار اپنی گذر گئی کہ کٹوری گل کی بھری رہی

ترے "نورِ صاعقہ ریز" نے مجھے محوِ حسن کیا مگر
مری چشمِ حرص پسند کو وہی فکرِ کم نظری رہی

کھلے خاک غنچۂ دل مرا کہ خزاں کا دور اب آ گیا
نہ فضا میں اگلی ہے تازگی نہ گلوں میں جاں وہ رہی ہری

نہ قرار آیا کوئی گھڑی نہ ہوا نصیب مجھے سکوں
جو بہار آئی تھی باغ میں وہی وجہ دربدری رہی

ترے دل کی شمع بھڑک اٹھی ہوا جل کے خاک جگر ترا
تجھے حافظِ "تپشِ آشنا" کبھی فکرِ چارہ گری رہی!!

اثر رامپوری

نگاہوں سے ہوئے اوجھل جو وہ پیشِ نظر ہو کر
ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر

خدا رکھے تمہاری بزم بھی طرفہ تماشا ہے
جو آتا ہے وہ رہ جاتا ہے سرتاپا نظر ہو کر

زمانہ ہر طرح اہلِ جہان کا ساتھ دیتا ہے
کسی کا راہزن بن کر کسی کا راہبر ہو کر

حقیقت بیں نظر سے دیکھ دنیا کی ہر اک شے کو
مزہ جب ہے بنے تو حق نگر صورت نگر ہو کر

اثر سے بچ کے جانے کی کوئی حد و نہایت بھی
رہے گا ایک دن نالہ پشیمانِ اثر ہو کر

کمالِ جذبۂ الفت اگر ہو جائیگا پیدا
رہیگی ایک دل کی دوسرے دل کو خبر ہو کر

چھپے زیرِ نقاب انکا جمالِ روئے تاباں کیا
شعاعِ حسن پردہ میں رہے کیوں پردہ در ہو کر

بقدرِ حوصلہ دکھ درد کو بھی میں ترستا ہوں کہ رہ جاتا ہے اکثر درد دل در دجگر ہو کر

اثر جب تک حواسِ ظاہری ہیں پا نہیں سکتا
تلاش یار کو ہوش و خرد سے بے خبر ہو کر

ناطق گلاوٹھی

مری تدبیر الٹی ہے تو سید ھا امتحاں کروں سب اپنا فائدہ کرتے ہیں لاؤ میں زیاں کروں
اجازت ہو تو اپنی بے لبسی کا کچھ بیاں کروں اسی مُہر دہن کو بے زبانی کی زباں کروں
پلا ساقی کہ موج بے خودی سر سے گزر جائے خطِ ساغر کو غرقابی کا اپنی میں نشاں کروں
تمنا عیش کی دو لکو نہیں اے فرصتِ ہستی اجازت ہو تو تھوڑی دیر میں آہ و فغاں کروں
تمہیں کچھ ہاتھ آتا ہو تو میرا کچھ نہیں جاتا جو ایسی رائے ہو تو زندگی کو رائیگاں کروں
جو ایسا ہو تو آئینِ وفا قانونِ عالم ہو جو میرا بس چلے تو میں بتوں کو مہرباں کروں
یہ کرنا ہے کہ اب دنیا میں کچھ کرنا نہیں مجھکو ہزاروں کام کرنے کے ہیں میں کیا کیا یہاں کروں
فنا ہونا تو ہے لیکن ذرا شوقِ فنا دم لے میں اپنی موت کو پہلے حیاتِ جاوداں کروں
تمہاری بات رہ جائے جو تم دمساز ہو جاؤ مرا دل چاہتا ہے میں کسی کو رازداں کروں

- -

مضامین ہائے نو پیدا بہت ہو جائیں گے ناطق
مجھے یہ فکر ہے پہلے کہ پیدا قدرداں کر لوں

باب الاستفسار

معاد

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

خدا جانے کتنے بیشمار نظام شمسی اور کتنے سیارے اس کائنات میں پائے جاتے ہیں جن کے متعلق انسان کو اگر کوئی علم ہو سکا ہے تو صرف اس قدر کہ ان میں سے بعض اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک سیکڑوں سال میں پہونچتی ہے - اور یہ کہ روزانہ خدا جانے کتنے سیارے فنا ہو کر نئے ظاہر ہوتے رہتے ہیں پھر جب فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے اور اس کے اندر اجرام اور سیاروں کی کثرت کا یہ حال ہے تو یہ سارا نظام بے جان تو ہوگا نہیں، ان میں خدا جانے کس کس قسم کی مخلوق ہوگی اور اس سے قبل اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن سیاروں کی کس کس نوع کی مخلوق فنا ہو کر بالکل نئی مخلوق پیدا ہوئی ہوگی -

پھر جب خدا یا قدرت کا یہ معمولی مشغلہ ہے کہ ہزاروں کرے یا سیارے روز بنائے اور بگاڑے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمین ایسے حقیر کرہ کے متعلق وہ کوئی علحدہ نظام قائم کرے اور یہاں کی مخلوق کو فنا کرنے کے بعد وہ پھر از سر نو زندہ کرے بلحاظ خلق ایک انسان اور حقیر سی چیونٹی دونوں خدا کے نزدیک ایک ہیں، اس لئے اگر وہ حشر و نشر کو انسان کیلئے گوارا کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اور دیگر حیوانات و حشرات کو اس سے مستثنےٰ کر دے جبکہ خلق محض کے لحاظ سے خدا کے نزدیک ایک انسان اور معمولی کیڑے کی اہمیت یکساں ہے - پھر یہی نہیں بلکہ جملہ کائنات کے تمام ان اجرام کے مخلوقات کا حشر و نشر بھی ماننا ہوگا جو ازل سے ابد تک پائے جائیں اور چونکہ صفت خلق خالق سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مسئلۂ تخلیق لانہایت تک چلا جائیگا - اور جملہ مخلوقات کائنات کا حشر و نشر مستلزم ہوگا اس امر کو کہ علاوہ اس کائنات کے ایک اور لانہایت کائنات تسلیم کی جائے جو عالم خلق سے جدا ہو اور اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے - خدا پیدا کرتا ہے اور فنا کر ڈالتا ہے فنا کر دیتا ہے اور پھر بناتا ہے - یہ سلسلہ ازل سے ابد تک چلا جائے گا - یہ ایک ایسا سیدھا سا عقیدہ ہے جس سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے ماننے میں کوئی استبعاد عقلی ہے اور نہ محالات کو ممکن ماننا پڑتا ہے - برخلاف اسکے اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جتنی مخلوقات کو اس نے پیدا کر کے فنا کر دیا ہے (واضح رہے کہ آپ اس میں تخصیص محض انسان کی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے لئے آپ عقلی دلیل پیش کر سکتے ہیں) انھیں کو وہ پھر پیدا کر دیگا اور صرف اس لئے کہ ان سے محاسبہ کرے - ان کی پہلی زندگی کے اعمال و افعال کا تو اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، کیونکہ خود خدا کو جزا و سزا تنبیہ و تادیب سے کوئی فائدہ نہیں اور جن کو جزا و سزا دیجائے گی اُن کو پھر پہلی زندگی میں واپس کرنا نہیں کہ آئندہ کے لئے وہ اصول عذاب و ثواب کا لحاظ کر کے زندگی بسر کریں -

خدا کی عظمت و تقدیس کا حقیقی خیال بالکل اس امر کے منافی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق سے جو ہر لحاظ سے محتاج، بے نوا، مجبور
ور خدا کی عظمت کو دیکھتے ہوئے لاشے محض ہے، کسی نوع کا مطالبہ کرے یا اس پر کسی سختی کو روا رکھے ظاہر ہے کہ جو ہدایات
نبیاء کے ذریعہ سے انسان کو پہونچائی گئیں تھیں وہ صرف اسی کے فایدہ کے لئے تھیں، خدا کو ان سے کوئی غرض نہ تھی، اس لئے
ر کسی نے ان پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا تو اپنے لئے اور نقصان کیا تو اپنا، لیکن اس نفع و نقصان کو عالم بالعبد الحیات سے
تلق کرنا اور اس میں دوام و خلود کی شان ثابت کرنا اور اسی سلسلہ میں ہزاروں پیچیدہ مسائل پیدا کر کے سادہ فطرت
سانی میں الجھاؤ ڈالنا کسی طرح عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

اب اس کے بعد بحث کا پہلو یہ رہجاتا ہے کہ اگر یہ صورت معاد کی نہیں ہے تو پھر کوئی اور صورت ہوسکتی ہے یا نہیں اور
م سے جُدا ہونے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے یا کیا۔

ہر چند علمی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرنا مفید یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ انسانی علم و استقصار جس درجہ ناقص و نامکمل
وہ کسی سے مخفی نہیں، تاہم چونکہ انسان باوجود اس علم کے بھی مجبور ہے کہ وہ اطمینان نفس کے لئے عقل ہی سے کام لے اس لئے
ں کو اپنے گزشتہ تجربات پر اعتماد کر کے ہر امر کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانا پڑتا ہے کیونکہ بہر حال ریب و شک کی زندگی
ر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کوئی ایک مقصود متعین کر لیا جائے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔

حیات انسانی اور معاد کے مسئلہ کا تعلق عالم طبیعیات سے ہے کیونکہ انسان بھی اسی عالم طبیعی کا ایک مظہر ہے اور
رنے کے بعد اس کا وجود کسی نہ کسی طرح قائم رہا تو اس کا تعلق بھی اسی عالم سے ہوگا۔ اس لئے جب طبیعیات کے اصول سے
ہ مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر چند انسان کی وہ شکل و صورت تو قائم نہیں رہتی جو دنیا میں
ئی جاتی تھی۔ لیکن بہر حال اس کا وجود کسی ایک سے زیادہ مختلف صورتوں میں پایا جانا چاہئے۔ کیونکہ عالم طبیعی کی کوئی
ایسی نہیں ہے جو "لاشے" سے پیدا ہوتی ہو اور پھر معدوم ہو جاتی ہو۔ اس کی صورت کا بدل جانا اس کی صفات کا متغیر ہو جانا
س سے اس کا شعور نہ ہونا، نگاہ سے اس کا نظر نہ آنا یہ سب ممکن ہے لیکن اس کا بالکل معدوم ہو جانا طبیعیات کے
یک محال ہے۔ جب آواز ایسی چیز جس کا بظاہر کہیں وجود نہیں معلوم ہوتا، فنا نہیں ہوتی اور ایتھر کے امواج میں ملی رہتی
تو پھر اور اشیاء مادی کا کیا ذکر ہے۔

الغرض ہمارے حواس کا کسی شے کو محسوس نہ کرنا دلیل اس کے عدم وجود کی نہیں ہوسکتی۔ مادہ و قوت کے ساتھ
ر کا جو تفاعل ہوتا ہے وہ مخفی نہیں لیکن کیا ایتھر کے وجود سے انکار ہوسکتا ہے۔ حالانکہ اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا سیارات
تباط یہاں تک کہ نظام شمسی کا وجود، نور و کہربائیت کے مظاہر اور جواہر مادی کا مرتبط ہو کر جسم اختیار کر لینا سب
رہی کا کرشمہ ہے اس لئے جب مادہ و قوت جو حقیقتاً ایک ہی چیز ہیں اور صورتوں میں باقی رہتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ
ن کی حیات کے مسئلہ میں وہ فانی مان لئے جائیں اور مرنے کے بعد وہ قوت جس نے اسے زندگی بخشی تھی، باقی نہ رہے،

لیکن چونکہ مادہ یا قوت تفاعل کے ماتحت ہمیشہ مختلف صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان مرنے کے بعد انسان ہی رہے اور وہ قوت جو اس میں کام کر رہی تھی کوئی دوسری صورت نہ اختیار کرے۔

یہ ہے رائے اکثر علماء طبیعیات کی، جس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی حیات فنا نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اور مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ طبیعیات والے بڑی حد تک تناسخ کے قایل ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے بقاء حیات کی بہترین صورت یہی ہے۔

اب آئیے کلام پاک سے اس معمہ کا حل چاہیں اور غور کریں کہ قیامت، حشر و نشر اور معاد کے متعلق اس نے کیا بتایا ہے۔

کلام مجید میں قیامت کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے لیکن ہم اُن آیات کو یہاں نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف انکا مدعا و مفہوم مختصراً بیان کرتے ہیں۔ کلام مجید میں جن الفاظ کے ساتھ قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے وہ اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی ہولناک ہے اور بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ جس طرح فضاء کے اور بہت سے کُرے فنا ہو چکے ہیں اسی طرح کرۂ ارض بھی ایک نہ ایک دن فنا ہوگا۔ خواہ آفتاب اس کو اپنی طرف کھینچ کر خاک سیاہ کر دے خواہ کسی اور سیارہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے اور ایسی صورت میں خدا کا یہ فرمانا کہ اس دن زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دیگی، اس کی حالت بالکل ہی بدل جائے گی، وہ کپکپا اُٹھیگی بالکل صحیح و درست ہے اسی طرح پہاڑوں کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ دُھنکی ہوئی اُون کے مانند ہو جائینگے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ریت کے ٹیلوں کی طرح نظر آئیں گے بالکل درست ہے اسی طرح خدا نے سمندر کے متعلق بتایا ہے کہ وہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھیگا اور یہ بھی بالکل یقینی ہے کیونکہ کرۂ ارض کی تباہی کے وقت ان تمام مناظر کا پیش آنا کھلی ہوئی بات ہے، لیکن خدائے پاک نے اس سلسلہ میں صرف کرۂ ارض ہی کی تباہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ —— اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت کہکر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین کی طرح آفتاب اور دوسرے ستارے بھی تباہ ہو جائیں گے

الغرض کلام مجید میں جس قیامت کا ذکر اس نوع کے انداز بیان سے کیا گیا ہے اس سے مقصود تو وہ عام تباہی ہے جب ہمیشہ کے لئے یہ کرۂ ارض برباد ہو جائیگا اور اس سے مدعا انسان پر اپنی قوت و جبروت اور اُس کی بیچارگی و بے بسی کا ظاہر کرنا ہے لیکن اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ جب یہ ہوگا اُس وقت اعمال کی جزا سزا ہوگی، دوزخ جنت کا قصہ شروع ہوگا۔

وہ قیامت جس کا تعلق انسان کی جزا سزا سے ہے اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب انسان مرتا ہے اور جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں اسطرح کیا گیا ہے۔

یسئل ایان یوم القیامۃ الخ

یہ اعتقاد رکھنا کہ آغاز عالم سے عام تباہی یا قیامت کبریٰ کے وقت تک جتنے آدمی پہلے مر چکے ہیں وہ سب کے سب عذاب و ثواب کے لئے قیامت کے قبروں سے اٹھائے جائیں گے صحیح نہیں کیونکہ اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے جنت کا مستحق ہو سکتا ہے تو یہ کہانتک انصاف ہے کہ اُس کو اس نعمت سے قیامت کبریٰ کی وقوع تک محروم

ما جائے وہ اسی طرح ایک مجرم کو اتنی لمبی فرصت دیدیجائے جبکہ تباہی زمین کے لئے ارب در ارب سال کی مدت بھی بہت ہی جاتی ہے۔

کلام پاک میں بعث وحشر کا بھی ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن ان سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم بھی اُس کے ساتھ اُٹھایا جائے گا کیونکہ انسان سے مراد اس کا بدن نہیں ہے اور معاد کی حقیقت، بعث ونشر کا بیان، ان لوگوں کے سمجھانے کے لئے تھا جو بقاء روح کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ عذاب ثواب کا قصہ یونہی سا ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کلام مجید میں اس کا ذکر صراحتہً موجود ہے ارشاد ہوتا ہے :-

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر وما لھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون ۰ واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بینات ما کان حجتھم الا ان قالوا ائتوا بآبائنا ان کنتم صادقین ۰

(وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اس پر خدا فرماتا ہے۔ اُن کو حقیقت کا علم ہی نہیں یہ ان کا صرف وہم وگمان ہے اور جس وقت اُن کے سامنے ہماری کھلی ہوئی نشانیاں بیان کی جاتی ہیں تو ان کی حجت صرف یہ ہوتی ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو مر چکے ہیں لے آؤ) یعنی جس وقت ان سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی جس میں تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد جی اُٹھنا صحیح ہے تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ جو مر چکے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین ولو تری اذ وقفوا علی ربھم قال الیس ھذا بالحق قالوا بلی وربنا

یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور اس کے بعد ہم کیا اُٹھائے جائیں گے لیکن جب تم اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگے تو خدا تم سے پوچھے گا کہ کیا یہ سچ نہ تھا اور وہ کہیں گے کہ ہاں بیشک سچ تھا۔

تیسری جگہ اور منکرین کا اعتقاد اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ ءاذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمدینون ۰ یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی کے سوا کچھ نہ رہیں گے تو پھر کیا بدلا دئے جائیں گے۔

الغرض اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ بعث وحشر ناممکن ہے اور مرنے کے بعد سارا قصہ تمام ہو جائیگا نہ اچھے اعمال پر انعام ہوگا نہ بُرے اعمال کی سزا ملیگی۔ اسی اعتقاد کی تردید کلام مجید میں کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد یقیناً عذاب و ثواب ہوگا، لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ حشر بالاجساد ہوگا وہ جسم جو دنیا میں پایا جاتا تھا پھر پیدا ہوگا اور بالکل وہی نسبت تعلق جسم و روح کے پائی جائے گی جو دنیا میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حشر کے مفہوم کو مختلف صورتوں سے سمجھایا ہے کسی جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

واللہ انبتکم من الارض نباتا ثم یعیدکم فیھا و یخرجکم اخراجاہ
(خدا نے اگایا تم کو زمین سے ایک قسم کا اگانا، پھر تم کو اسی زمین میں لیجائے گا اور پھر اسی سے نکالیگا ایک قسم کا نکالنا)
اس آیت میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو زمین سے اگایا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہے کیونکہ تمام ذی حیات چیزیں گو ارتقائی مدارج طے کرکے موجودہ حالت پر پہونچی ہیں، لیکن اس میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی وجہ حیات اصل میں وہی زمین اور اس کے تغیرات ہیں۔ کلام مجید میں جہاں اور آیتوں سے مسئلہ ارتقاء ثابت ہوتا ہے وہیں ایک آیت یہ بھی ہے۔
اسلئے جس معنی میں پہلے انسان کا زمین سے پیدا کیا جانا بتایا گیا ہے اسی معنی میں دوبارہ اس کا زمین سے نکلنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حقیقتاً نہ پہلے وہ کبھی زمین سے اُگا اور نہ بعد کو کبھی زمین سے پیدا ہوگا۔ اس آیت میں نباتا اور اخراجا کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُگانے اور نکالنے معمولی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ کسی خاص قسم کا اگانا اور نکالنا مقصود ہے اگر حشر میں انسان کی دوسری زندگی بالکل دنیا ہی کی سی زندگی ہوتی اور اسی جسم کیساتھ ہوتی جس سے روح کو پہلے تعلق رہ چکا ہے تو نباتا اور اخراجا کے الفاظ ہرگز استعمال نہ کئے جاتے۔
علاوہ اس کے سورۂ واقعہ کی بعض آیتوں سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کی کیا حقیقت ہے اور حشر بالاجساد خدا کا مقصود نہیں ہے۔
سورۂ واقعہ میں پہلے منکرین حشر کا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔
ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمبعوثون ہ
(یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو پھر کیا اٹھیں گے) اس کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کی حقیقت کو خدا اس طرح بیان کرتا ہے:-
نحن خلقناکم فلولا تصدقون افرایتم ما تمنون - ء انتم تخلقونہ ام نحن الخالقون نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین علی ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون ہ
ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم نے اول اول تم کو پیدا کیا تو پھر کیوں تصدیق اس کی نہیں کرتے کہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتے ہیں، پھر جس طرح ہم نے تم کو پہلے پیدا کیا اور مار ڈالا اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ مرنے کے بعد ہم تمہارے امثال و اوصاف کو بدل دیں اور ایسی صورت و حالت میں پیدا کریں جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔
ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی ہوگی وہ بالکل مختلف ہوگی اور بعث و حشر کی جو صورت ہوگی وہ کچھ اور ہی ہوگی جس کو ہم اس وقت نہیں سمجھ سکتے۔ نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حشر انھیں یا ویسے ہی جسموں کے ساتھ ہوتا جو دنیا میں پائے جاتے تھے تو پھر ما لا تعلمون کے الفاظ ارشاد نہ ہوتے

حشر اجساد کے قائل سب سے بڑی زبردست دلیل جو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں وہ سورۂ قیامہ کی یہ آیات ہیں:-

ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علی ان نسوی بنانہ

(کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہ کریں گے۔ ہم تو اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کی پور تک درست کردیں)

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے حشر اجساد کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم ایسا کریں گے بلکہ صرف اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ پہلے منکرین بعث و حشر کے دل و دماغ میں خدا کی قدرت و عظمت کا خیال قائم کر دیا جائے اور پھر ان کو بتایا جائے کہ حشر و نشر کے بعد عذاب و ثواب کا طاری کیا جانا ناممکن نہیں ہے اور اس کے لئے خدا کو اختیار ہے۔ جس صورت و حالت میں چاہے تمہیں تبدیل کر دے۔ (جیسا کہ اس سے قبل کی آیت میں بتایا گیا ہے) سورۂ حج کی ابتدائی آیات بھی حشر اجساد کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں، جن میں "ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم" کہکر قیامت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور پھر انسان کی پیدائش، عہد طفلی، جوانی، ضعیفی اور موت کا ذکر کرکے، دوسرے زمین اور پھر بارش کے بعد اس سے نباتات کے اگنے کا بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد مردہ کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرکے ارشاد ہوتا ہے۔ وان الساعۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور (مخصوص ساعت بیشک آنے والی ہے اور اللہ اٹھائے گا اُن کو جو قبروں میں ہیں)

بظاہر ان آیات سے بالکل کھلے طور پر انسان کا مع جسم کے قبروں سے اُٹھنا ثابت ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کہیں قیامت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس امر کی کہ رسول اللہ کے دشمن پامال ہوں گے اور آخر کار اسلام کی فتح ہوگی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کی طرف سے ہدایت کی کوئی توقع نہیں ہے وہ بھی راہ راست پر آجائیں گے۔ **من فی القبور** سے وہ انسان مراد ہیں جو نہایت جہل و تاریکی میں مبتلا ہیں۔ کلام مجید میں اور جگہ بھی یہی مفہوم ان الفاظ سے لیا گیا ہے اور احیاء سے صاحب ایمان اور اموات سے کفار مراد لئے گئے ہیں، چنانچہ سورہ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما یستوی الاحیاء والاموات - ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور - ان انت الا نذیرہ

یعنی زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا سکتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبر میں ہیں۔ تم تو صرف اطلاع دینے والے ہو۔ نہ صرف اخیر کی آیت بلکہ ما قبل کی آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں **من فی القبور** سے مراد کفار و فجار ہیں۔

کلام مجید میں یوم قیامت کے لئے اور بھی بہت سے لفظ استعمال کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بعث و حشر، نشر و قیامت، سے واقعی حشر اجساد مراد ہے۔ وہ لوگ جو معاد کے لئے حشر اجساد کو ضروری خیال کرتے ہیں ان میں زیادہ حصہ ان حضرات کا ہے جو صرف منقولات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کو وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، اور کمتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو از روئے عقل بھی اس کو ضروری خیال

کرتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اگر فلسفۂ لذت والم پر غور کیا ہوتا تو وہ شاید حشر اجساد کو ضروری نہ قرار دیتے کیونکہ جسم انسانی صرف ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روح انسانی یا نفس انسانی تمام کام کرتا ہے اور آلہ کبھی مسئول و ذمہ دار شے قرار نہیں دیا جا سکتا، زندگی میں اعمال نیک و بد کا صدور حقیقتاً جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ نفس و روح کے ارادہ سے ہوتا ہے اور مسرت و الم، لطف و تکالیف کا احساس بھی اسی کو ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی چیز مستوجب سزا یا جزا کی ہوسکتی ہے تو وہ روح انسانی ہے نہ کہ جسم انسانی۔ مرنے کے بعد جسم موجود رہتا ہو لیکن چونکہ نفس و روح کا تعلق اس سے باقی نہیں رہتا اس لئے وہ بالکل بیکار چیز سمجھا جاتا ہے اور اُسے کوئی حس نہیں ہوتی۔ اس لئے حشر اجساد کے قایل وہی لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ روح انسانی اپنے احساس کے لئے جسم کی محتاج ہے اور ادراک محض نام ہے جوارح کے متاثر ہونے کا۔ حالانکہ ہمارا روز کا تجربہ اس کے منافی ہے۔ اگر حشر اجساد کو ضروری خیال کیا جائے اور اس کو صرف کرۂ ارض کے انسانوں ہی تک محدود رکھا جائے تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ مرنے کے بعد ہی اس کی قیامت کا آغاز مان کر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ مرنے کے بعد ہی پھر اپنے جسم کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہے، لیکن اس کو حشر اجساد والے بھی تسلیم نہیں کرتے اس لئے لازم آیا کہ اس کے لئے اس قیامت کبریٰ کا انتظار کرنا پڑے گا جب یہ سارا کرہ تباہ ہو جائیگا اور کوئی متنفس زندہ نہ رہیگا۔ ایسا ماننے میں سب سے پہلا اعتراض یہ ہوگا کہ اس وقت تک کہ قیامت کبریٰ قائم ہو (جس کو ابھی اربوں سال کا زمانہ ہے) تمام وہ انسان جو آغاز عالم سے اس کی انتہا تک مرچکے ہوں گے، کہاں اور کس عالم میں رہیں گے۔ اگر یہ اس وقت تک روحانی عالم میں رہیں گے تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق راحت و تکلیف میں رہیں گے یا نہیں، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ اتنا بڑا زمانہ بیکار عالم تعطل میں بغیر کسی احساس لذت و الم کے گزر جانا خلاف عقل ہے اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس زمانہ میں جو عذاب و ثواب ہو اوہ بغیر جسم کے ہوا (کیونکہ حشر اجساد تو اسی قیامت کبریٰ کے وقت ہوگا۔) اس لئے جب اتنا زمانہ بغیر جسم کے قید کے عذاب و ثواب یا لذت و الم میں گزر گیا تو آئندہ بھی حشر اجساد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اگر حشر اجساد کو ضروری قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کی شروع آبادی سے لیکر اس کے اختتام تک جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں سب کا حشر ہو اور وہ سب کے سب اپنے جسموں کے ساتھ اُٹھیں۔ پھر چونکہ جسم کے لئے مکان ضروری ہے اس لئے کھلی ہوئی بات ہے کہ جسم کے قیام کے لئے تمام اسی فضا کی ضرورت ہوگی جو دنیا میں پائی جاتی تھی اور اگر ایک ایک مردہ کے صرف کھڑے ہونے کے لئے ایک ایک فٹ زمین کی ضرورت ہو تو بھی اتنے آدمی پیدا ہو کر مرچکے ہیں اور آئندہ مرینگے کہ اگر لاکھوں کرۂ زمین ہوں تو بھی وہ کافی نہیں ہوسکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حشر نشر کے لئے اور بہت سے کُرے تیار کئے جائیں گے تو آیا وہ اسی نظام شمسی کے ماتحت ہوں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ نظام شمسی یہ نہ ہوگا کیونکہ کلام مجید میں کرۂ شمس کی بھی تباہی کا بیان ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا نظام شمسی ہوگا تو حشر و نشر کے لئے جو کُرے بنائے جائیں گے وہ اسی شمس کے اجزا ہونگے جس سے وہ متعلق ہیں یا کسی اور کے۔ اگر وہ اسی کے اجزا ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ان کے قابل آبادی بننے کے لئے اربوں سال

ان پر پہلے گزر چکے ہوں گے اور وہ اس وقت بھی موجود ہوں گے اور غالباً کیسی حالت میں ہوں گے۔ بہرحال اگر ہم اس کو تسلیم کریں کہ لاکھوں بلکہ کروروں کرّے اور حشر و نشر کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ جسوقت کرۂ زمین تباہ ہوگی تو اس کے سارے مردے اور لاکھوں کرّوں میں تقسیم کردئے جائیں گے جہاں وہ اپنا جسم لیکر اُٹھیں گے اور چونکہ ان کرّوں میں یہ اہلیت ہوگی کہ انسانی جسمانی آبادی کو اپنے اندر قائم رکھ سکیں اس لئے ضرور ہے کہ ان میں بھی پہلے سے آثار حیات و آبادی پیدا ہو چکے ہوں گے، تو کیا زمین کے مردوں کے لئے وہاں کی آبادیوں کو پہلے فنا کر دینا پڑے گا۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو خلاف عقل و انصاف ہے اور اگر نفی میں ہو تو پھر مردوں کی سمائی کیونکر ہوگی۔ اور اگر ہم اسے بھی مان لیں کہ خدا محض حشر و نشر انسان کے لئے بہت سے خالی کرّے پہلے سے طیار کر رکھیگا تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ کرّے کسی نہ کسی دن فنا ہوں گے اور اُنہیں کے ساتھ جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گی، کیونکہ بہرحال عذاب و ثواب کا قصہ بھی اُنھیں کرّوں میں ہوگا اور وہیں تمام درجات بہشت و دوزخ کے قائم کئے جائیں گے۔

الغرض حشر اجساد کے ماننے کے بعد ایک سلسلہ بہت سی خلاف عقل باتوں کا قائم کرنا پڑیگا جن کی کوئی علمی توجیہ نہیں ہو سکتی اگر یہ کہا جائے کہ خدا ایسی قدرت ہے کہ زمین ہی کو اتنا وسیع کردے کہ سب مردے اس میں سما جائیں، اور پھر اس کو غیر فانی بنا دے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہو کہ کیا خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بغیر جسم پیدا کئے ہوئے محض روح انسانی پر عذاب و ثواب کی کیفیات طاری کردے۔ خدا کے تمام کام ایک خاص نظام کے ماتحت ہیں اور اس کی قدرت کا انتہائی منظر یہ ہے کہ وہ کبھی اس نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اگر اس نے جسم کے لئے مکان کو ضروری قرار دیا ہے تو اُس کے یہ معنے ہیں کہ جسم جب اور جہاں کہیں ہوگا اُس کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور یہ ناممکن ہے کہ حشر اجساد ہو اور مکان کی ضرورت نہ ہو۔ پھر مکان کے وجود کے لئے جو شرائط و اسباب خدا نے ضروری قرار دیئے ہیں وہ ہمیشہ ہر مکان کے لئے ضروری رہیں گے اور ان میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ الغرض حشر اجساد ماننے کے بعد ایک لامتناہی سلسلہ خلاف عقل، خلاف اصول خلق ماننا پڑتا ہے اور روحانی عذاب و ثواب کے تسلیم کرنے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اجساد کے ساتھ عذاب و ثواب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف تناسخ ہے اور حشر اجساد کے تسلیم کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تناسخ کو تسلیم کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ و جنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں، لیکن اس بیان کو حقیقت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ان میں اکثر جگہ تو مقصود دنیا ہی کی کامیابی و ناکامیابی کو ظاہر کرنا ہے اور یہیں کے نعائم و لذائذ اور شدائد و مصائب کو خاص انداز سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں اگر یہ بیانات حیات بعد الموت سے متعلق ہیں تو صرف بطریق مجاز ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے۔

عرب کے لوگ عورت، شہد، دودھ، سونا، چاندی، جواہرات پر جان دیتے تھے اور ان کے نزدیک ان اشیاء سے زیادہ کوئی چیز محبوب تھی ہی نہیں، اس لئے اگر ان کی ترغیب کے لئے صرف یہ کہدیا جاتا کہ اچھے کاموں کا بدلا ایک روحانی مسرت

کی صورت میں پایا جائیگا تو وہ بالکل اس کو نہ سمجھتے اور کبھی اچھے کاموں کی طرف مائل نہ ہوتے۔ اسی طرح چونکہ وہ نظرتاً بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور لوگوں کو سزا دینے کے لئے آگ سے جلا دینا۔ گرم پتھروں پر لٹا دینا اور اسی طرح کی اور صورتیں اختیار کرنا معمولی بات تھی اس لئے ان کے سامنے دوزخ کا بیان اس طرح کیا گیا کہ وہاں دہکتی ہوئی آگ ہوگی، اژدہے ہوں گے، انگارے کھانے پڑیں گے، خون پیپ پینا پڑیگا وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان سے یہ کہدیا جاتا کہ بُرے کاموں کے عوض تم روحانی عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے تو ان پر کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ روح کے احساس شدید اور اس کے تاثر وتاذی کی حقیقت سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ چاندی سونے، موتی اور ہیرے کی قدر تو دنیا میں ہے اور صرف اس لئے کہ ان سے ہم کو کثیر مادی نفع پہونچ سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد جب مادیات کا قصہ ہی ختم ہو جائیگا، یہ چیزیں کیا لطف دے سکتی ہیں، شہد، دودھ خدا کی کوئی اتنی بڑی نعمت نہیں ہے کہ ساری چیزوں کو چھوڑ کر انھیں کا انتخاب کیا جاتا لیکن چونکہ اہل عرب کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب تھیں اس لئے ان کو سمجھانے کے لئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام صرف اہل عرب کے لئے تو نہیں تھا کہ ان کے ذوق کا خیال رکھا گیا تو اس کا جواب نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ جہاں خدا نے دوزخ جنت کی حقیقت کو امثال کی صورت میں بیان کیا ہے وہی اُن کی فلسفیانہ حقیقت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ بہشت کی ماہیت اس طرح بیان ہوتی ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون یعنی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے اعمال نیک کے عوض میں کونسی راحت مقرر کی گئی ہے۔ اسی طرح دوزخ کی آگ کی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:-

نار اللہ الموقدۃ اللتی تطلع علی الافئدۃ ٥ یعنی دوزخ وہ خدائی آگ ہے جو قلوب انسانی کے اوپر مستولی ہوگی اگر دوزخ کی آگ سے مراد یہی ظاہری ومعمولی آگ ہوتی تو کبھی ایسا ارشاد نہ ہوتا۔

اگر اسی کے ساتھ احادیث پر غور کیا جائے تو ہمیں ان سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے قال اللہ تعالیٰ اعدت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے جسے نہ انسانی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سُنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ اگر جنت کی حوروں، شہد و دودھ کی نہروں سے واقعی وہی چیزیں مراد ہوتیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتی ہیں تو ان میں سے کونسی چیز وہ ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا اور لا خطر علی قلب بشر۔ ظاہر ہے کہ وہ مادی دنیا کی چیزیں ہی نہیں ہیں اور جس کا احساس دنیا سے علٰحدہ ہونے ہی پر ہو سکتا ہے۔ چونکہ انسان اس دنیا کے تجربات لذت والم سے آشنا ہو کر اس قدر تنگ خیال ہو گیا ہے کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا کہ جسم سے مجرد ہونے کی حالت میں کیونکر راحت وتکلیف محسوس ہو سکتی ہے اس لئے کلام مجید نے بھی عموماً وہی انداز بیان اختیار کیا جس کو لوگ سمجھ سکتے لیکن چونکہ اسلام کو سارے عالم کا مذہب ہونا تھا اس لئے اہل فہم کے لئے کہیں کہیں وہ نکات بھی بیان کر دئے جو اہل عقل کے لئے باعث رشد وہدایت ہو سکتے ہیں اور جو واقعی حقیقیات سے بحث کرتے ہیں۔

نیاز

معلومات

زلزلہ خدا جانے کتنے نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت ایسے ہیں جن کا صحیح علم انسان کو نہیں ہو سکا ہے اور انھیں میں سے ایک زلزلہ بھی ہے۔ زلزلہ کی حقیقت کا علم نہایت دشوار ہے کیونکہ جسوقت وہ آتا ہے تو ہر شخص اپنی جگہ بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کو اتنا اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے کہ بیٹھکر اس کے حدوث کی حقیقت پر غور کرے۔

حال ہی میں ایک پروفیسر نے سنہ ۱۸۴۳ء اور سنہ ۱۸۷۳ء کے درمیان ایک ہزار زلزلوں کا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روزانہ دو زلزلوں کا اوسط پڑتا ہے۔ لیکن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان زلزلہ کی کیفیت کو اسوقت محسوس کرتا ہے جب ۱/۱۲۰ انچ کی مقدار سے زیادہ زمین میں حرکت پیدا ہو اور یہ حرکت ہر جگہ نہیں ہوتی۔

زلزلہ کی علامتیں کیا ہیں:—

(۱) آواز۔ اول اول زمین کے نیچے توپوں کے سر ہونے کی آواز آتی ہے اور کبھی دھونسا بجنے کی

(۲) اس آواز کے ساتھ ہی یا اس کے بعد زمین میں جنبش ہوتی ہے اور کبھی یہ جنبش اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بڑے بڑے مکان گر جاتے ہیں

(۳) اسکی حرکت یا تو عمودی ہوتی ہے اوپر کی طرف سے نیچے کی جانب یا افقی ہوتی ہے ایک طرف سے دوسری طرف اور کبھی چکر دار کھائی کی طرح ہوتی ہے۔

(۴) زمین میں ہر جگہ جنبش نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی خاص مرکزی جگہ پر ہوتی ہے اور پھر چاروں طرف اس طرح پھیل جاتی ہے جیسے ساکن پانی میں ڈھیلا پھینکنے سے لہریں پیدا ہوں۔

زلزلہ کی موج کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اگر کسی چٹانی یا پتھریلی زمین میں زلزلہ آئے گا اور زلزلہ کا مرکز عمیق ہوگا تو زلزلہ کی موج کی رفتار ۱۰ میل فی منٹ ہوگی کبھی کبھی ۳۰ میل تک بھی پہونچ جاتی ہے اور یہ رفتار موج کی طرح چاروں طرف یکساں پھیلتی ہے۔ زلزلہ کا مشہور سبب وہ تغیرات بیان کئے جاتے ہیں جو زمین کی سطح پر ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کا چھلکا یا بالائی سطح بہت بڑی اور وزنی ہے جو مرکز زمین کی طرف کھنچتی رہتی ہے اور زمین کا اندرونی حصہ خروج حرارت کی وجہ سے ہر وقت سکڑتا رہتا ہے اس لئے اس کیفیت سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور چٹانیں پھٹ جاتی ہیں، چنانچہ جن مقامات میں پہاڑ نہیں ہیں اور زمین ریتیلی ہے وہاں زلزلہ کا اثر بہت کم یا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زلزلہ کا سبب کوہ آتش فشاں کا وجود ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کوہ آتش فشاں کی آتش افشانی خود زلزلہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی شدید آندھی بھی زلزلہ کا باعث ہوتی، چنانچہ امریکہ کے ماہر زلزلہ ٹنڈروف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بحر اوقیانوس میں سخت آندھی چلی جس سے سواحل امریکہ کو ایسی سخت ٹکریں لگیں کہ زلزلہ محسوس ہونے لگا، لیکن ایسی

مثالیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔

اگر زلزلہ کا مرکز سمندر کی گہرائی میں ساحل سے قریب ہوتا ہے تو نہایت بڑی بڑی لہریں اُٹھکر ساحل سے ٹکراتی ہیں اور تباہیاں پھیلا دیتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قعرِ بحر مرکز زلزلہ کے قریب تموج میں آتا ہے اور یہ تموج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ پچاس پچاس فٹ کی بلند اور سیکڑوں میل کی لمبی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

۱۷۵۵ء میں پرتگال میں ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر سمندر میں زلزلہ پیدا ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر ساٹھ ساٹھ فیٹ کی اونچی لہریں ساحل سے آکر ٹکرانے لگیں۔ جس سے ۴۰ ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جب جاپان میں زلزلہ آیا تو اس کا مرکز بھی سمندر ہی تھا جو ساحل سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ آئرلینڈ کے ساحل پر بھی ۵ فٹ اونچی لہریں پیدا ہوگئیں۔

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں پیرو کے ساحل پر زلزلہ آیا جس کا مرکز سمندر تھا اور پانچ منٹ کے اندر عام تباہیاں پھیلا گیا۔

ڈاک کے عجائب

لندن کا محکمۂ ڈاک ریل سے صدر ڈاک خانہ تک ڈاک کے تھیلے لیجانے کے لئے زیر زمین ریل کا استعمال کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ہجوم حارج نہ ہو۔ یہ ریلیں بغیر ڈرائیور کے صرف مکانکی ذریعے سے چلتی ہیں اور روزانہ ۳۰ ہزار تھیلے پہونچاتی ہیں۔ ریل کی پٹڑی کی لمبائی ۶½ میل ہے اور ۷۰ فٹ زمین کے اندر سرنگ میں واقع ہے۔ یہ سرنگ گزشتہ جنگ کے دوران میں طیار کی گئی تھی تاکہ لندن کے عجائب خانہ کی تمام قیمتی چیزیں اس میں محفوظ کردی جائیں اور بم کے گولے ان پر اثر نہ کریں۔

چیونٹی اور آگ

فرانس کی ایک خاتون مرگریٹ نے دریافت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں ایک خاص جماعت آگ بجھانے کے لئے بھی ہوتی ہے جہاں چیونٹیوں کے بھٹ ہوتے ہیں وہاں ایک لکڑی جلاکر خاتون مذکورہ نے ذرا بلند مقام پر رکھدی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک جماعت چیونٹیوں کی نکلی اور کوئی رقیق سا مادہ چھڑک چھڑک کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ ان میں بعض جلکر مر بھی گئیں یہ بھی دیکھا گیا کہ جو چیونٹیاں آگ میں گر گئی تھیں اُن میں سے بعض کو دوسری چیونٹیوں نے نکال لیا اور پھر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئیں۔

بجلی کے اشتہار

برقی روشنی کے ذریعہ سے اعلان و اشتہار کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک جزیرہ منہاٹن میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ۲۱ ہزار اشتہارات کیلئے تقریباً ۱۳ لاکھ برقی قمقمے استعمال کئے جاتے ہیں ایک کمپنی نے یہاں ایک ہوٹل صرفاً اس لئے خرید کیا کہ اس کو صرف برقی اشتہارات کیلئے کام میں لائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوگی وہ ہوٹل کی آمدنی سے زیادہ ہوگی۔

انیمیا کا علاج

انیمیا (خون کی کمی) ایک بیماری ہے جسمیں خون کی تولید کم ہوجاتی ہے اور انسان دُبلا ہوتا جاتا ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر شلنگ نے اس کا ایک عجیب و غریب اور نہایت مجرب علاج دریافت کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ مریض کو گائے کی کچی کلیجی کھلائی جائے

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اُس نے اس طرح ۹۴ مریضوں کا علاج کیا جن میں سے ۹۰ بالکل صحتیاب ہو گئے۔ باقی چار اور بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

قطب جنوبی کی برف — جرمنی کے ایک پروفیسر مینارڈس کا بیان ہے کہ قطب جنوبی کے چاروں طرف جمی ہوئی برف کی مقدار اتنی زبردست ہے کہ اس سے سارے کرۂ ارض پر ۱۰۰ انٹ کی موٹی چادر بچھائی جا سکتی ہے اور اگر یہ پگھل جائے تو سمندروں کی سطح ۱۰۰ انٹ بلند ہو جائے۔ اُس کے خیال میں اس کا وزن .... ۲ ٹن ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قطب شمالی کی طرف جو برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں، وہ پہاڑ نہیں ہیں بلکہ یہی منجمد برف ہے جس کی تہوں نے ایک دوسرے پر چڑھ کر پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سب سے بڑا جہاز — فرانس کی ایک کمپنی نے سال گزشتہ ایک دخانی جہاز ۴۲ ہزار ٹن وزن کا تیار کیا جو فرانس اور امریکہ کے درمیان چلتا ہے۔ ایک اور کمپنی نے ۴۶ ہزار ٹن کا جہاز بنایا جو جرمنی اور نیویارک کے درمیان سفر کرتا ہے، ہر چند یہ دونوں جہاز انگریزی جہاز مجسٹک اور برنگاریا کو نہیں پہونچتے جو ۵۶ ہزار اور ۵۲ ہزار ٹن کے ہیں لیکن یہ دونوں جہاز برطانیہ کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جرمنی کے ہیں جن پر برطانیہ قابض ہو گیا ہے۔

کونارڈ کمپنی نے اب ایک اور جہاز بنانا شروع کیا ہے جس کا وزن ۶۰ ہزار ٹن کا ہوگا اور اس کی لمبائی ... انٹ ہوگی اس میں ۵ ہزار مسافر آ سکیں گے۔ ایک اور جہاز طیار ہو رہا ہے جو مجسٹک جہاز سے زیادہ شاندار اور تیز رفتار ہوگا ان دونوں جہازوں کی لاگت کا اندازہ گیارہ ملین گنی (تقریباً پندرہ کرور روپیہ) کیا جاتا ہے۔

سوانح عمری
سوانح عمرو عیار

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی
- سکینہ بنت حسین ۶ر
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح مفتوح
- بابک خرمی
- الفانسو
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومتہ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن
- بدر النساء کی مصیبت ۳ر
- خونناک محبت
- میوۂ تلخ ۸ر
- نیکی کا پھل

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

- نیل کا سانپ
- رام پیاری
- عبرت
- حسن سرور
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانہ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زندانی ۶ر
- اصلاح زبان ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- 〃 دوسری کتاب
- 〃 تیسری ۸ر
- 〃 چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی۔اے

- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- نمکدان فصاحت
- بادۂ ناب

ظفر عمر بی۔اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری

بہرام کی گرفتاری

مولوی عبدالماجد بی۔اے

- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- زود پشیمان ۸ر
- فلسفیانہ مضامین

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ
- خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

- اسوۂ صحابہ دو جلد
- سیرۃ عمر بن العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین
- فقرائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند دو جلد

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول
- 〃 دوم
- سیر الصحابیات

مولوی عبدالباری ندوی

- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی عبدالرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی و یورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

سید سجاد حیدر بی۔اے

- زہرا ۱۳ر
- جلال الدین خوارزم شاہ
- خیالستان
- ثالث بالخیر
- حکایات و احتساسات

مولوی راشد الخیری

- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- منازل السائرہ
- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوب خداوند
- سودہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- مقدمہ شعر و شاعری
- دیوان حالی

تاریخی و جاسوسی ناول دلچسپ

- سراب فلسطین ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۸ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس
- شیخ چلی
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور
- زر پرست

قواعد رسالہ نگار
۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
نرخنامہ اجرت اشتہارات
نگار بک ایجنسی لکھنؤ
مرزا غالب
مولانا شبلی
امیر مینائی

جلد ۱۴ - شمار ۴

چندہ نمبر ۱۰۴

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۸ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۴	اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء	جلد ۱۴

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں سب سے زیادہ اہمیت جس واقعہ کو میں نے دی تھی وہ لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع تھا جس نے نہرو کمیٹی رپورٹ پر غور کرکے ایک ایسی صورت پیش کردی تھی کہ اس پر اعتماد کرکے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق اچھی توقعات قائم ہوسکتی تھیں، لیکن اس اجتماع کا متفرق ہونا تھا کہ مخالفت کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور غالباً مولانا شوکت علی کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے اس سے اختلاف کیا اور اختلاف بھی اس قدر اہمیت و اشتداد کے ساتھ کہ نوبت ذاتیات تک پہونچ گئی۔ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کی تحریریں جو سوال و جواب کی صورت میں شائع ہو رہی ہیں وہ ناظرین نگار کی نگاہوں سے گزر چکی ہونگی اور اس لئے امر مابہ النزاع کو متعین کرنا ان کے لئے بھی دشوار نہ ہوگا —— سب سے زیادہ قوت اختلاف اس امر پر صرف کی جارہی ہے کہ پنجاب میں باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے، کیوں نشستوں کی تعیین نہیں کی گئی اور مخلوط انتخاب کیوں روا رکھا گیا۔

مولانا شوکت علی کا پنجاب کے مسئلہ میں اس قدر قوتِ مخالفت صرف کرنا جبکہ خود اہل پنجاب کی کثیر جماعت اس کو تسلیم کر چکی ہے، اگر اس وجہ سے نہیں کہ ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کے ساتھ کچھ ذاتی رنجشیں اور شکایتیں بھی ہیں تو سخت حیرت کا مقام ہے کہ مولانا شوکت علی ایسا شخص جو اپنے آپ کو نہایت ہی غیر خاطی متبع اسلام سمجھتا ہے وہ عہد اسلام کے ان واقعات کو فراموش کردے جب ایک اور سو

کی نسبت سے بھی مسلمان خائف نہ ہوتا تھا اور آج پنجاب کے مسئلہ میں باوجود ہندوؤں کی اقلیت کے ان سے اس درجہ خائف نظر آئے کہ وقار قومی کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ ہم اس سے قبل کبھی یقین نہ کرتے اگر کوئی شخص یہ خبر دیتا کہ مولانا شوکت علی کے اتنے بڑے تن و توش کے اندر بہت ہی چھوٹا دل ودیعت کیا گیا ہے۔

ایک قوم یا جماعت کی ترقی کا اصلی راز اس کے اندر سعی و جستجو، کاوش و مسابقت کے جذبات پیدا کر دینا ہے۔ اگر آج کوئی جماعت یہ یقین کرلے کہ وہ اپنے مدعا کو حاصل کر چکی ہے، منزل مقصود تک پہونچ گئی ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کل سررشتۂ مدعا اسکے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا ہے اور منزل مقصود سے پیچھے ہٹ آنا یقینی ہے۔ اگر آج پنجاب اور سندھ کے مسلمان (اس مخصوص مسئلہ میں) مطمئن ہو جائیں گے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اپنے اندر کوئی اہلیت نہ پیدا کر سکیں گے اور ان کی وہ نااہلیت جو باوجود انکی کثرت کے، ہندوؤں کی قلیل جماعت کے مقابلہ میں اُن کو پنجاب میں رعشہ براندام بنائے ہوئے ہے بدستور قائم رہیگی اور ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اُن پر بند ہو جائیگا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پنجاب و سندھ میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے ہندو اپنی قابلیت و وجاہت، اپنی ثروت و دولت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر آبادی پر بھاری ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی اقلیت کے ساتھ ان کی یہ گراں اہلیت مل کر پلہ کو جھکا دے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آج وہاں مخلوط انتخاب کو ہٹا کر بلحاظ آبادی نشستوں کا تعین کر دیا جائے تو کیا اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے مسلمان بدستور اسی گری ہوئی حالت میں رہیں اور پھر اس کے مقابلہ میں دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جہاں وہ نہ صرف آبادی بلکہ علم و ثروت کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے کم ہیں

ہمارے نزدیک مولانا شوکت علی کی یہ مخالفت بالکل قرین صواب نہیں ہے اور اپنی بے مایگی و تباہی پر ایک مہر دوام ثبت کر دینا ہے جس طرح ہندو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ وہ مسلمانوں کی موجودگی میں ایک خالص ہندو حکومت ہندوستان میں قائم کر لیں اسیطرح مسلمانوں کی یہ تمنا کہ وہ اپنی اقلیت کو سپر بنا کر ہندوؤں سے تمام اپنے مفید مطلب خواہشات کو تسلیم کرا لیں، ناممکن ہے، اگر ہندو ترقی کر رہے ہیں، اگر وہ علم و دولت، فہم و فراست، کے لحاظ سے آگے بڑھے جا رہے ہیں تو مقابلہ کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ ان کا دامن پکڑ کر کھینچئے یا کسی اور سے فریاد کیجئے کہ خدا کے لئے انہیں روکو آگے نہ بڑھنے دو، بلکہ اس کا واحد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ خود جست کر کے ان تک پہونچئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی سعی کیجئے اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے جب مسابقت کے لئے محرکات فراہم رہیں، ورنہ مسلمانوں کی اس نیند کا موت میں تبدیل ہو جانا یقینی ہے۔

خود پنجاب میں اس کے متعلق دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں باہم جس انداز سے مخالفت ہو رہی ہے وہ اس درجہ شرمناک ہے کہ اس کا ذکر کرنا بھی خلاف انسانیت ہے جسکو تحقیق کا شوق ہو وہ زمیندار اور انقلاب کے حال کے پرچوں کو دیکھے۔

مسلمان اخباروں میں دہلی کے ہمدرد نے اپنی روش یقیناً قابل تقلید رکھی اور اگر اس ایک افتتاحیہ کو علیحدہ کر دیا جائے جو عبدالماجد صاحب دریابادی کے فشار دماغ کا نتیجہ تھا تو ہم اس کے طریق عمل کو بہت صاف و سلجھا ہوا پاتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب

دریابادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب وغریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر "تاریخ تنقید" میں کہیں مل سکے آپ فرماتے ہیں کہ۔

"نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں۔ رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب......... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو و مسلمان اطمینان سے اپنے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونک کر فرماتے ہیں کہ:۔

"لیکن اس ۵۰ا صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آنے پایا ہے مادیت کی اس نقارخانہ میں قوم کی روحانی واخلاقی زندگی کی کہیں بھنک تک نہیں پڑنے پائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد تمام تر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے نہ کہ زمین پر خلافت الٰہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں، خدا کا نام، روحانی واخلاقی زندگی خلافت الٰہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پاکر چیں بجبیں ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن تک میں یہ جستجو کر سکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج، کھدر، چرخا، کونسل، اسمبلی، اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر اخیر میں مایوس ہوکر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کاش کہ عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اُسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کر لیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بٹلر پیلس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر انھوں نے جس جلن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک ہمیشہ سے "طالبہا کلاب" میں داخل ہیں، اور ایک دولتمند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک وحسد اسی طرح کیا کرتا ہے سچ ہے۔

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

حکومت ہند کے سب سے بڑے ایوان کا اجتماع گزشتہ سشن میں قومی نقطۂ نظر سے کافی کامیاب رہا۔ قانون تحفظ عوام (PUBLIC SAFETY BILL) جناب صدر آنریبل پٹیل کے فیصلہ کن ووٹ سے ناکامیاب رہا۔ اگر جناب پٹیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید وہ اس قدر جسارت سے کام نہ لیتا اور یہ قانون منظور ہوکر ایک نیا دروازہ دار و گیر کا کھول دیتا ایک قانون اہل مطابع وصحافت کو شکنجہ میں کسنے کے لئے پیش ہونے والا تھا، لیکن وہ پیش ہی نہ ہوسکا اور اس طرح یہ بلا پھر چند روز کے لئے ٹل گئی اور اعتبارات سے بھی یہ سشن کامیاب رہا، کیونکہ صدر اور حکومت کے درمیان جو شکر رنجی پیدا ہوگئی تھی اس پر حکومت نے

اظہار معذرت کرکے اس قضیہ کو ختم کردیا۔ ڈیلی ٹیلی گراف لندن، اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نامہ نگار نے صدر کی غیر جانبداری کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر انکی نیت پر بھی حملہ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر نے ان نامہ نگاروں کو پریس گیلری سے علحدہ کردیا رائٹر کے نمائندہ نے جس کو اسمبلی کی کارروائیوں کے متعلق ۱۴ سال کا تجربہ ہے، اول الذکر دونوں نمائندوں کی اس نازیبا حرکت کو بہت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حکومت نے بھی اس باب میں اسمبلی کے صدر سے اتفاق کیا۔

یوپی کونسل کے اجلاس نینی تال کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کی قرارداد آخر کار منظور کرا ہی لی گئی اور سات آدمیوں کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی جسمیں ۴ ہندو، ایک اینگلو انڈین اور ۲ مسلمان ممبر ہیں، مسلمانوں کے دو ممبر خان بہادر حافظ ہدایت حسین اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان ہیں۔

اس قرارداد کی منظوری کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب تک تمام قومی جماعتیں پہلے ایوان کونسل سے احتجاجاً باہر نکل نہیں آئیں اوس وقت تک یہ تجویز منظور نہ ہوسکی۔ راجہ جگنا تھ بخش سنگھ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور جو بڑی حد تک اس تحریک کی منظوری کا باعث ہوا اس کا انتقام اس طرح لے لیا گیا کہ راجہ صاحب موصوف پر بے اعتمادی کا نوٹس دیدیا گیا اور وزیر مذکور کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

ممکن ہے کہ یوپی کی حکومت اور اس کی معاون جماعتیں اپنی اس کامیابی پر مسرور ہوں کہ سائمن کمیشن کا "یوسف گم گشتہ" اس طرح پھر ہاتھ آگیا۔ لیکن اہل نظر اس نوع کی کامیابی کو جس میں حقیقتاً وقار انسانی کو قربان کرنا پڑتا ہے، بدترین شکست سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

گزشتہ ماہ میں ہم نے میثاق کیلاگ کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے مستقبل کے لئے فال نیک بتایا تھا اور خیال تھا کہ شاید اب دنیا چین سے بیٹھ سکے گی، لیکن جب مزید اطلاعات موصول ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حد درجہ ناقص "تعبیر امن" ہے۔ ایک طرف اہل مغرب اس کا عہد بھی کرتے ہیں کہ جنگ نہیں کریں گے اور دوسری طرف اسلحہ سازی کو بھی ترقی دیتے جاتے ہیں۔ اگر حقیقتاً جنگ کا محو کردینا منظور ہوتا تو سب سے پہلے آلات حرب کو دریا برد کرنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ اس میثاق میں برطانیہ و فرانس نے یہ عجیب و غریب شرط رکھی ہے کہ وہ اپنے مستعمرات اور زیر اثر علاقوں کو محفوظ اور محکوم رکھنے کے لئے ہر طرح کی دفاعی جنگ کا حق رکھیں گے اور روس پر بھی حملہ کرسکیں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ لندن، پیرس کا مقابلہ تو کبھی نہ ہوگا لیکن انگلستان اور فرانس میں باہم جنگ ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مستعمرات رکھتے ہیں اور مستعمرات کی حفاظت کا حق انھیں حاصل ہی ہے، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہندوستان کو ڈومینین ہوم رول مل جائے تو بھی وہ "استخوان جنگ" بننے کے حدود سے باہر نہیں ہوتا، یہ ہے ہندوستان کی اہمیت کہ اس وقت دنیا کا کوئی سیاسی معاہدہ ایسا نہیں ہوتا جسمیں ہندوستان کے پوزیشن کو فراموش کردیا جاتا ہو۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

افغانستان کا جواں بخت فرمانروا یوں تو ابتدا ءِ جلوس ہی سے اپنی روشن خیالی اور حریت فکر و ضمیر کا ثبوت دے رہا تھا، لیکن اب سفر یورپ کے بعد سے جو تیزی اصلاح و ترقی میں صرف ہو رہی ہے اُس نے اس وقت تمام یورپ کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً بہت فکرمند بنا رکھا ہے۔

قومی جرگہ یا (NATIONAL ASSEMBLY) کا قیام، ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم کا لازم کر دینا، ملک کو مسلح کرنے کے لئے ہر متنفس پر تین افغانی (کابلی سکہ) کا ٹیکس عاید کرنا، حکام کے القاب موقوف کر دینا یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی صرف الفاظ "جناب من" (MY DEAR SIR) سے مخاطب کرنا، قدیم افغانی لباس کو مغربی صورت میں تبدیل کرنا تعداد ازدواج کو ممنوع قرار دینا، پردہ کو اُٹھا دینا، ریلوے لائن کا افتتاح، اسلحہ کی خریداری و طیاری، ہوائی جہازوں کی تعمیر، مولویوں اور مذہبی علماء کا اخراج ——— یہ سب وہ روشن علامات ہیں جو بیک وقت افغانستان میں ظاہر ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ جو ایک خاص بات ان سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ کابل میں اس وقت جتنا اثر ماسکو اور بالشویک حکومت کا ہے اتنا لندن اور دہلی کا نہیں۔

برطانیہ نے ہندوستان کی طرح کبھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ مصر میں بھی جمہوریت کے جراثیم پیدا ہو جائیں چنانچہ مرحوم سعد زغلول پاشا جب تک زندہ رہے، برطانیہ کے پہلو میں خار ہی کی طرح کھٹکتے رہے کیونکہ ان کی وطن پرستی زیادہ خطرناک حدود تک پہونچ گئی تھی، ان کے بعد جب مصطفیٰ نحاس پاشا وزیر ہوئے تو بھی وہی خلش باقی رہی اور آخر کار ملک فواد مجبور ہوئے کہ ان کو معزول کر دیں اور محمود پاشا کو رئیس الوزراء مقرر کریں۔

انھوں نے عنان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی، پارلیمنٹ کو توڑ دیا، قواعد انتخاب منسوخ کر دئے اور ایک کامل شخصی و استبدادی دور حکومت مصر میں شروع ہو گیا لیکن برطانیہ اور ملک فواد کو غالباً زیادہ عرصہ تک اس حالت پر مسرور رہنے کا موقعہ نہ ملیگا، کیونکہ اب اہل مصر میں کافی احساس قومی خودداری کا ہوچکا ہے اور یہ طلسم استبداد بغیر ٹوٹے رہ نہیں سکتا۔

غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور ہوا۔ یعنی احمد زغوبے جو سکندر ثالث کے لقب سے مملکت البانیہ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔ ہرچند جمہوریت البانیہ کا مملکت البانیہ میں تبدیل ہو جانا کوئی دل خوش کن خبر نہیں ہے، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اب جبکہ ساری دنیا سے سلطنت شخصی کا اقتدار اُٹھتا جا رہا ہے البانیہ کے اس دور حکمرانی کی عمر زیادہ طویل نہیں ہو سکتی اور احمد زغوبے جلد صدر کے درجہ پر پہونچ جائیں گے جو یقیناً سلطان سے زیادہ معزز ہے

کسی قوم کی بیداری کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وسعت نظر اور رواداری ہے، اس لئے اگر ایران کی بیداری کی خبریں

آرہی ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہاں کی موجودہ حالت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو وہی رواداری اور وسعت نظر ہے، ایران ایک زمانہ تک اپنی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے بدنام رہ چکا ہے اور وہاں کی مذہبیت بہت کچھ ترقی کی حائل رہی ہے، مگر اب وہاں بھی نیا دور شروع ہو رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کا یہ کہنا کہ "اس باغ فدک پر نہ لڑو جو موجود نہیں بلکہ سرزمین ایران کی ترقی کی طرف متوجہ ہو کہ ہمارا باغ فدک یہی ہے" ثابت کرتا ہے کہ مولویوں کا اثر وہاں سے بھی اُٹھ گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن مولویوں کا وہ گروہ ہے جنھوں نے مذہب کا مفہوم صرف اپنی شکم پُری قرار دے رہا ہے۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس بھی مغربی ہوتا جا رہا ہے اور پردہ اُٹھا دیا گیا۔

ٹرکی کی نہایت تازہ اصلاح جو اس نے اپنے علم و ادب میں کی ہے وہ بجائے عربی حروف کے لاطینی حروف کا اجراء ہے یعنی ترکی زبان لاطینی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام خطوط و نقوش سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور اس پر لاطینی و ترکی، عربی و فارسی چینی و جاپانی کسی خط کا بھی اثر نہیں پڑ سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں بظاہر اس امر کا محرک صرف یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد قدیم کی کوئی چیز باقی رکھنا نہیں چاہتے اور اصول ارتقاء کے اس مسئلہ پر عمل کر رہے ہیں کہ تجدید کیلئے پہلے بالکل صفحۂ سادہ ہو جانا ضروری ہے، بہرحال سبب یہ ہو یا کوئی اور، ہمارے نزدیک یہ تغیر کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا اگر کوئی قوم اپنی قومیت کی خصوصیت کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتی تو اس کو دوسری قوم بنکر ترقی کرنے پہ کوئی فخر و ناز بھی نہ ہونا چاہئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سے جمہوریت البانیہ نے احمد زوغو کو اپنا فرمانروا تسلیم کیا ہے اس وقت سے مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی بھی اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور شاید وہ بھی اپنی قیصریت کا اعلان کر دیں کیونکہ ان کے پاس بہت سی درخواستیں ایسی پہونچی ہیں جنمیں خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ سلطنت ترکی کو جمہوریت سے نکال کر شخصی سلطنت بنا دیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس خبر کا صحیح ہونا ویسا ہی مشکوک ہے جیسے اور بہت سی خبریں ترکی کے متعلق غلط نکلتی ہیں۔ کیونکہ باوجود صدر ہونے کے بھی مصطفیٰ کمال پاشا حقیقتاً ترکی کے سلطان ہی ہیں اور ان کو بالکل وہی اختیارات حاصل ہیں جو ایک فرمانروا کو ہوا کرتے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے بعد وہ اپنے اختیارات میں کوئی اور اضافہ نہیں کر سکتے۔ رہا یہ امر کہ اس طرح وہ اپنے خاندان میں حکومت کو منتقل کرنا چاہتے ہیں، سو یہ امر مصطفیٰ کمال ایسے روشن دماغ انسان سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی یا کسی اور مستبد حکمراں کی یہ خواہش کس حد تک پوری ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ کا سیلاب بڑی سی بڑی مستبد سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کئے ڈالتا ہے۔ بہرحال اگر مصطفیٰ کمال نے اس خیال کو عملی صورت دی تو حکومت ترکی کا اقتدار بہت گھٹ جائیگا اور ان سلطنتوں کی حمایت وہ ہاتھ سے کھو بیٹھے گا جن کا اندیشہ ترکی کی دشمن حکومتوں کو دست آزدراز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دہلی کے روزنامہ ہمدرد کا جدید دور نہ صرف ترتیب و ضخامت بلکہ فراہمی مضامین و اخبار کے لحاظ سے بھی بہت اُمید افزا ہے (دس صفحات کا مواد جس میں علاوہ تازہ ترین خبروں کے مختصر و دلچسپ تنقید مسائل حاضرہ اور مضامین خاصہ بھی ہوتے ہیں)

علی الخصوص ایسی صورت میں کہ مولانا محمد علی اس کو بہت ہی سقیم حالت میں چھوڑ گئے تھے، یقیناً جدید کارکنان ہمدرد کی قابلیت نظم و اہتمام کا کافی ثبوت ہے۔ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کا کوئی اردو روزنامہ ہمدرد سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہے اور اس وقت جبکہ نہ صرف پنجاب بلکہ دہلی میں بھی صحافت کا مقصود صرف غیر شریفانہ انداز تحریر سمجھ لیا گیا ہے، ہمدرد کی یہ متین روش بے انتہا قابل داد ہے۔

معاصر مدینہ کی ادارت میں بھی کچھ تغیر ہوا ہے یعنی اب ہمارے عزیز دوست مولوی نور الرحمٰن بی اے اڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل جناب بدر جلالی کے زمانہ میں مدینہ نے کافی ترقی کی اور انشا کے لحاظ سے اس نے اچھی شہرت پیدا کی، لیکن سب سے بڑا نقص اس میں یہ تھا کہ وہ صرف مولانا محمد علی اور ہمدرد کی زبان و حلقوم بنا ہوا تھا اور خود اپنی کوئی رائے نہ رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ مولوی نور الرحمٰن صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس نقص کو دور کیا اور اب معلوم ہونے لگا کہ مدینہ بھی اپنی حیثیت، اپنی رائے، اپنا وجود و معیار علٰحدہ رکھتا ہے اور اس کا مدعا صرف "خاک از تودۂ کلاں بردار" نہیں ہے۔

نگار شین پریس میں ایک اور نیا رسالہ "العراق" چھپنا شروع ہوا ہے جو لار (گورکھپور) سے شائع ہوتا ہے اس کے اڈیٹر ابو المعانی علی احمد ثقفی ہیں، جنھیں تاریخ و انساب اور بخصوصیت کے ساتھ اپنی عراقی قوم کی تاریخ پر کافی عبور ہے۔ اس رسالہ کا نام یقیناً یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف عراقی جماعت کے لئے مخصوص ہوگا، لیکن اس کی ترتیب میں ہر طبقہ و جماعت کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ میری نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مضامین پر ایک نگاہ میں بھی ڈال لیتا ہوں۔ ورنہ اس کی ملکیت یا اشاعت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے نمونہ غالباً مفت ملتا ہے جو حضرات دیکھنا چاہیں وہ منیجر العراق، لار (گورکھپور) سے طلب کریں۔

میں اپنے ان احباب سے حد درجہ محجوب ہوں جن کی کتابوں کا ریویو اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ میں اپنا فرض تو پورا کر چکا ہوں یعنی ریویو لکھ کر بکس میں محفوظ کر لیا ہے، لیکن چونکہ نگار کے صفحات (باوجودیکہ وہ ۹۶ صفحات پر شائع ہوتا ہے) مجھے ہمیشہ کم نظر آتے ہیں یہاں تک کہ ہر ماہ بعض اہم مضامین روک لینا پڑتے ہیں اس لئے ابتک ریویو کے لئے جگہ نہ نکال سکا۔ آئندہ ماہ میں تمام کتابوں کا تبصرہ شائع کر دینا چاہتا ہوں اور وہ اس طرح کہ کچھ صفحات رسالہ میں بڑھا دوں۔ امید ہے کہ یہ عذر برہمی میں کچھ تخفیف پیدا کر دیگا

مجھے فروری ۱۹۲۸ء اور جولائی ۱۹۲۸ء کے نگار کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب جدا کرنا چاہیں تو منیجر نگار کو لکھیں اور قیمت طے فرمالیں ممنون ہوں گا

نیاز

من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۵)

انسان دیوتا نہیں ہے۔ کمزوریوں اور خامیوں نے اُسکو انسان بنایا ہے۔ اگر الوہیت اور ملکوتیت کے مقابلہ میں انسانیت قابلِ احترام ہے تو یہ کمزوریاں اور خامیاں بھی قابلِ احترام ہیں۔ احمد مالتی کو فراموش کر چلا تھا۔ بہتیرے اُسکو اخلاقی گناہ کہدیں گے۔ لیکن محبت اخلاقیات کی بندشوں سے عموماً آزاد ہوتی ہے۔ سنائی نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کلیہ قائم کیا ہے ؂

عشق دابستۂ خرد نہ بود علتِ عشق نیک و بد نہ بود

عشق کی ابتدا انفرادیت سے ہوتی ہے اور شاید تمام ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی یہ انفرادیت باقی رہتی ہے۔ جبتک عشق کا نشہ آپ پر چھا نہیں جاتا۔ جبتک عقل و ہوش کا غلبہ ہے جبتک آپ دیر و حرم کا پرچار کیجئے۔ مذہب کی تبلیغ کیجئے۔ اخلاقیات کی اشاعت کیجئے۔ فلسفہ اور تصوف کی حمایت کیجئے یا اور جو کچھ چاہئے کہئے اور کیجئے۔ مگر جہاں آپ نے عشق کی دنیا میں قدم رکھا آپ کو جو کچھ اب تک کہتے یا کرتے آئے ہیں اُس سے خجل ہونا پڑتا ہے اور آپ "برکہ بادۂ ما تلخ تر از ہیں ہند است" کہکر سب کو حرفِ غلط سمجھنے لگتے ہیں۔ احمد نے مالتی کو نظر انداز کر دیا۔ اس میں اس کے ارادہ کو ہرگز دخل نہ تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اس کو بدورا کیساتھ ابتدا سے جو قلبی ارتباط تھا وہ یوں بھی اس کو مجبور رکھنے کے لئے کافی تھا۔ بدورا کی تازہ سحر آفرینیوں نے اُس کے نئے پیمانِ محبت نے اس کو بیدست وپا کر کے رکھدیا۔ بدورا اس مستقل مزاجی کے ساتھ اسکا تعاقب کرتی رہی کہ آخر کار احمد رام ہو گیا۔ جو چنگاریاں احمد کے دل میں دبی ہوئی پڑی تھیں۔ بدورا نے ان کو بھڑکانا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ پھر شعلہ زن ہو گئی تھیں۔ مالتی کے لئے یہ کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بدورا کا جن احمد کے سر سے کبھی اترا ہی نہیں۔ اس نے بھی اپنی بیقراریوں کو دبا لیا اور احمد کی بے نیازی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے بیٹھ رہی۔

بدورا کو یقین تھا کہ اسکی تیرہ روزگاری کا دور ختم ہو رہا ہے۔ دھندلی اور غبار آلود فضا بتدریج ایک خوش منظر اور پُرکیف مطلع کو جگہ دے رہی تھی۔ بدورا ابوالخیر کو بھول گئی ہوتی اگر طلاقنامہ آگیا ہوتا لیکن ابوالخیر نے اس اطلاعی خط کے بعد نہ بدورا کی خبر لی تھی اور نہ اپنی خبر دی تھی۔ کسی کو اُس کا پتہ بھی نہ معلوم تھا۔ بدورا اور قربان علی بے صبری کے ساتھ ابوالخیر کے خط کی راہ دیکھ رہے تھے۔ قربان علی ادھر تین چار مہینے سے بیمار تھے اور اس بیماری کو وہ موت کا پیغام سمجھ رہے تھے۔ کئی مہینہ سے وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ بستر سے ہل سکیں۔ انکی عمر ساٹھ ستر کے درمیان تھی۔ اس عمر میں بیٹی کی مصیبتوں نے اُن کی رہی سہی قوت کو سلب کر لیا تھا۔ سب سے زیادہ قربان علی کو اس کی فکر تھی کہ زندگی میں اپنی بیٹی کو آلام و مصائب سے آزاد دیکھ لیں۔ انھوں نے بڑی

کوششوں کے بعد رسول آباد والوں سے بیگم کا پتہ دریافت کیا اور ابو الخیر کو لکھا کہ جلد سے جلد بدورا کو طلاق دیدے۔

ابو الخیر کو بمبئی گئے ہوئے چار مہینے ہوگئے تھے عائشہ کے مرا ہوا لڑکا پیدا ہوا تھا اور وہ اسی سلسلہ میں بیمار پڑ گئی تھی۔ اسکو بخار رہنے لگا تھا جس وقت قربان علی کی تحریر ابو الخیر کو ملی ہے عائشہ کو بخار آتے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ ابو الخیر کو اُس کی حالت خطرناک اور مایوس کن معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر بڑے غور و خوض کرنے کے بعد بدورا کو لکھدیا "میں طلاق دینا نہیں چاہتا اس وقت میں مصروف ہوں مفصل پھر کبھی لکھوں گا"۔

قربان علی کا دل بیٹھ گیا۔ بدورا پر ایک بجلی گری۔ احمد کی ساری آگ پھر ٹھنڈی ہوگئی۔ اب اس کی بیدلی کا پھر وہی عالم تھا اور اُس نے بدورا سے ملنا پھر کم کرتے کرتے آخر کار یکقلم ترک کردیا تھا۔ قربان علی اس نازک حالت میں ایسے صدمے سے جانبر نہ ہوسکے اور ایک مہینہ کے اندر اس پر آشوب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرتے وقت انھوں نے بدورا کو بیٹا کر کہا تھا "بیٹی میں نے اپنی غلطی سے تم کو بھاڑ میں جھونکا اور بھاڑ میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ دیکھو میری روح پر کیا گزرتی ہے۔ بدورا کا اب کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا احمد اُس سے دستکش ہوگیا تھا۔ ابو الخیر کے خیال سے اُس کو نفرت تھی۔ اگر وہ آکر اس کی دستگیری کرنا بھی چاہتا تو بدورا ردادا نہ ہوتی اب وہ جس بھنور میں پڑی تھی اسی میں پڑا رہنا چاہتی تھی

احمد کے مرض کا پھر دورہ شروع ہوگیا۔ اب کی بار اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ پہلے کبھی کبھی منہ سے خون آتا تھا۔ اب روز آنے لگا تھا۔ وہ اب کوئی کام نہ کرسکتا تھا۔ زیادہ تر اپنے مکان کے اندر پڑا رہتا تھا۔ یا جب کبھی طبیعت بحال ہوتی تھی تو دو چار قدم اِدھر اُدھر ٹہل لیا کرتا تھا۔ مالتی نے پھر اس کی دیکھ بھال شروع کردی تھی۔ احمد اس کی صورت دیکھتا تھا تو اس کے اندر ایک محشر برپا ہوجاتا تھا مگر اب وہ زبان سے کچھ نہ کہتا تھا اور مالتی بھی خاموش ہی رہتی تھی۔

(۱۶)

بیساکھ کا موسم تھا۔ تمام دن آگ برس چکی تھی۔ رات کے ساتھ ہوا میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہوچلی تھی۔ بدورا صحن میں لیٹی ہوئی اختر شماری کررہی تھی وہ نہ جانے کس دنیا کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اتنے میں ماما ہاتھ میں ایک رقعہ لئے ہوئے آئی اور بدورا کو دیکر بولی "یہ لیجئے۔ نصیر کوٹ سے ایک خدمتگار لے کر آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آج آگئے ہیں اور وہیں اُترے ہیں"۔ بدورا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اس نے خط ہاتھ سے لے لیا اور ایک عجیب بیچارگی کے عالم میں پڑھنے لگی:۔

پیاری بدورا ۔

میں آج شام کی گاڑی سے آیا ہوں۔ ذرا سفر کی ماندگی و خستگی دور ہوئے تو تم سے ملنے آؤں اطلاع دیدیتا ہوں تاکہ تم دو گھنٹے میں میری ملاقات کے لئے تیار رہو۔ گزشتہ آٹھ دس مہینوں میں جو واقعات درپیش ہوتے رہے انکی مختصر روداد یہ ہے:۔

میں عائشہ کو لیکر بمبئی چلا گیا اور وہاں اس کے ساتھ عیش و عشرت کیساتھ رہنے لگا۔ ارادہ تھا

کہ تم کو آزاد کردونگا مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ عائشہ کے بیس سے لڑکا ہونے والا تھا بمبئی
جانے کے کوئی تین مہینے بعد مرا بچہ پیدا ہوا اور اس کو بخار رہنے لگا جسوقت میر صاحب کا خط
مجھکو ملا ہے اس وقت اُس کا مرض جڑ پکڑ چکا تھا۔ میں نے تم کو لکھدیا کہ میں طلاق دینا نہیں
چاہتا۔ آخر کار اس کے مرض میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ وہ وقت سے پہلے مرگئی
اس کو مرے ہوئے ایک مہینہ ہوا۔ مرنے سے چند دن پہلے اُس نے اپنی کل جائداد میرے نام
لکھدی تھی۔ تم مجھکو بدذات کہوگی لیکن میرا مصمم ارادہ تھا کہ تم کو طلاق دیکر عائشہ سے شادی کرونگا
مقدر میں یہ نہ تھا۔ عائشہ کی موت کا باعث میں نہیں ہوا۔ وہ میرے ساتھ نہایت ہنسی خوشی کیساتھ
بسر کر رہی تھی۔ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو ظلم و تشدد میں نے
تم پر کیا ہے اس کو معاف کردو۔ بدورا تم میری ہو اور اب کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ ہم
قانوناً ایک دوسرے کے ہوچکے ہیں۔ میں نے عہد کرلیا کہ اب تم کو کسی معمولی شکایت کا بھی موقع
نہیں دونگا اور ہر طرح تمہاری دلجوئی کرونگا۔ تم مجھکو اس عہد پر ثابت قدم پاؤگی۔ گزشتہ سال
کے اندر مجھکو جو تجربات ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میری عمر میں دس سال کا
اضافہ کردیا ہے۔ میں اب جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں خلوص ہے۔ میں تم کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔
یہ عمر بیوی کو چھوڑ کر خانہ بدوش پھرنے کی نہیں ہے۔ میں دو گھنٹے کے بعد تم سے آکر گفتگو کرونگا۔
کل کسیوقت تم اپنا سامان "نصیر کوٹ" میں منتقل کرادینا۔ میں اسی مکان میں تمہارے ساتھ
سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔

"تمہارا ابوالخیر"

بدورا پر تھوڑی دیر تک ایک جمود کی سی کیفیت طاری رہی۔ عائشہ کی موت کے خیال سے اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں
وہ ابوالخیر کو ایک بلا سمجھ رہی تھی۔ اس سے اپنا پیچھا کیونکر چھڑائے؟ تقریباً آدھ گھنٹہ سوچتی رہی۔ یکایک اس کو ایک خیال آیا اور
اس نے فیصلہ کرلیا۔ اس سے پیشتر بھی وہ یہ ارادہ کرکے رہ گئی تھی کہ احمد کے پاس جائے اور وہیں رہے۔ لیکن اُس کی ہمت نہیں
پڑتی تھی۔ آج بدورا کو اس کی بھی ہمت ہوگئی۔ خیال آتے دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ بدورا نے اپنے ضروری سامان کی ایک گٹھری
لیکر اور جلدی جلدی ہر کوٹھری اور ہر صندوق میں تالا دے کر پیچھے کے دروازہ سے نکل گئی۔

احمد کو دو تین روز سے حرارت بہت خفیف سی تھی اور نسبتاً بحال تھا۔ وہ ابھی باہر سے اُٹھکر اندر آیا تھا اور چارپائی
پر بیٹھا ہوا تھا۔ مالتی اپنے گھر جاچکی تھی۔ بستر پر پڑے ہوئے کوئی آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ باہر اس کو کسی کے قدموں کی آہٹ ملی۔ اسکو
تعجب ہوا کہ مالتی خلاف معمول پھر کیوں آئی۔ وہ مالتی کا نام لیکر پکارنے والا ہی تھا کہ بدورا اسکی چارپائی کے پاس کھڑی تھی۔ بدورا

یہ کیا! تم کہاں! خیریت تو ہے!" احمد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

بدورا اس کے جواب میں رونے لگی۔ احمد کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے پھر پوچھا "کچھ بتاؤ تو۔ ہوا کیا؟ خواہ مخواہ پریشان نہ کرو تم خواہ مخواہ پریشان نہیں کرتی"۔ بدورا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا اور واقعہ بیان کر دیا۔ احمد نے غور کر کے جواب دیا "تو ہرج کیا ہے۔ اب ڈاکٹر کے ہوش ٹھکانے ہو گئے ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ اپنی سرد مہری ہوئی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ تم اُن سے بھاگتی کیوں ہو؟ بدورا ان کو تم پر وہ حق حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں ہے"۔ احمد کے لب ولہجہ میں سرد مہری تھی۔

بدورا نے بیزار ہو کر کہا "تم ہی کہتے ہو؟ اچھا تو میں جاتی ہوں"۔ یہ کہکر اُس نے اپنی گٹھری سنبھالی اور دروازہ کی طرف چلی احمد نے دوڑ کر اس کو روک لیا اور کہا "بدورا اس کے آخر معنے کیا ہیں"۔ بدورا نے کہا "میں تمہارے ساتھ پناہ گزیں ہونے آئی تھی میں ڈاکٹر کے ساتھ رہنے کی تاب اپنے میں نہیں پاتی۔ تم میری پذیرائی نہیں کرتے تو میں جاتی ہوں۔ میں لکھنؤ چلی جاؤنگی۔ وہاں لڑکیوں کو پڑھاؤنگی اور اگر ڈاکٹر اس پر بھی میرا پیچھا کریں گے تو میں بذریعۂ عدالت اُن سے پیچھا چھڑا دونگی۔ رسوائی ہوگی تو ہوا کرے۔ مجھکو اس کی پروا نہیں رہی"۔

احمد نے بدورا کے ہاتھ سے گٹھری لے کر چارپائی پر رکھدی اور کہا "تو یہ یہاں بھی ممکن ہے۔ اپنے مکان میں رہ کر بھی یہی ہو سکتا ہے خیر تم میرے ہاں رہنا چاہتی ہو تو اس سے زیادہ راحت میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم رہو۔ میں باہر کے حصہ میں رہونگا۔ بلکہ کہو تو ایک چھوٹی سی اپنی جھونپڑی ہے اسمیں جا کر رہوں تاکہ دنیا کا جو جی چاہے کہے لیکن ہمارے ضمیر مجرم نہ رہیں۔ مگر تم جو یہ درِ عدالت پر دستک دینا چاہتی ہو یہ ایک فعل عبث ہے۔ اتنی مختصر زندگی میں بیکار شورشیں نہ پیدا کرو۔ زندگی یونہی کچھ کم پر شور نہیں ہے"۔

بدورا بیٹھ گئی۔ احمد بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بدورا نے کہا۔ اس وقت نہ جانے کتنی دعائیں نکل رہی ہیں۔ ہاں میں تمہارے ساتھ رہونگی۔ لیکن تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ مالتی سے بھی نہیں۔ اور تم کو جھونپڑی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں رہو ہم ایک دوسرے کی رفاقت کریں۔ میں تمہارے لئے کھانا پکاؤنگی۔ تمہارے گھر کا کام کرونگی۔ تم میری محافظت کرنا"۔

احمد نے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے کہا "اچھا تو میں باہر رہونگا"۔

احمد نے بدورا کی تسکین کے لئے اُس سے اتفاق کر لیا تھا۔ لیکن وہ دن کا بیشتر حصہ اسی جھونپڑی میں گزارتا تھا جو اُسکے دروازہ پر تھی اور جسمیں اس کے گائے بیل رہتے تھے۔ رات کو وہ اسی کے سامنے میدان میں سوتا تھا۔ بدورا کو اس کی خبر نہ تھی۔ احمد اُس سے دن میں دو تین بار مل آتا تھا اور دلجوئی کی باتیں کر کے اس کو تسلی دے آیا کرتا تھا۔ مالتی سے یہ بات چھپ نہ سکی۔ اس نے پھر اپنی پرانی روش اختیار کر لی تھی اور اب صرف کبھی کبھی احمد کا حال دریافت کر جایا کرتی تھی۔

ابو الحسن نے بدورا کی تلاش میں بہت سر مارا۔ لیکن کوئی پتہ نہ لگا۔ گاؤں والے انگشت بدنداں تھے۔ مالتی کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ بدورا کہاں گئی۔ کوئی کہتا تھا کہ کہیں بھاگ گئی۔ کسی کا خیال تھا کہ کہیں جا کر خودکشی کر لی

(۱۷)

احمد نے اپنی اصل حالت بدورا سے چھپا رکھی تھی۔ اس کی بیماری نے جو خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اس سے بدورا ناواقف تھی۔ احمد دن میں کئی بار اندر آتا تھا۔ کم از کم ناشتے اور کھانے کے وقت تو ضرور آتا تھا۔ لیکن دیر تک نہ بیٹھتا تھا۔ کسی نہ کسی کام کا بہانہ کرکے چلا جاتا تھا۔ بدورا اس کے معنے سمجھ رہی تھی۔ ابوالخیر کے ہوتے ہوئے وہ اس پر اپنا کوئی حق نہ سمجھتا تھا اور بلا کسی حق کے اس کے ساتھ بے تکلفی سے اٹھنا بیٹھنا اس کی نگاہ میں معیوب تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کے دل میں وہ تپش نہ تھی۔ اس کی رگوں میں وہ حرارت نہ تھی۔ بدورا اس کی اس مردہ دلی کی تنہا ذمہ دار اپنے کو خیال کرتی تھی اس لئے کوئی شکوہ زبان پر نہ لاتی تھی۔

بدورا کو احمد کے مکان میں رہتے ہوئے پندرہ روز ہوئے تھے۔ احمد جب اندر قدم رکھتا تھا تو اپنے چہرہ پر ایک مصنوعی شگفتگی پیدا کرلیتا تھا۔ بدورا اس کو محسوس کرکے تجاہل کرجاتی تھی لیکن اسطرف پانچ چھ روز سے احمد کے چہرہ پر معمول سے زیادہ پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ باوجود اپنی تمام کوشش اپنے کو ہنس مکھ نہ ظاہر کرپاتا تھا۔ اس کی آواز کی نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے قدم سست پڑنے لگے تھے۔ بدورا نے کئی مرتبہ پوچھا بھی کہ "کیوں احمد آج کل کچھ زیادہ بیمار رہتے ہو؟"۔ احمد نے جواب دیا "نہیں کوئی خاص شکایت نہیں ہے جسکے لئے تشویش ہو"۔ مگر آخرکار احمد کا راز فاش ہوگیا۔ احمد اندنوں بدورا سے زیادہ دور ہٹکر بیٹھنے لگا۔ بدورا نے دو تین دن اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ ایک دن جبکہ احمد کی آنکھوں میں ضعف کے آثار غیر معمولی طور پر نمایاں تھے اور اس کی صورت پر ایک دہشت انگیز مردنی طاری تھی بدورا نے اسکا ماتھا اپنے ہاتھ سے چھوا تو "اف!" کرکے رہگئی احمد کو شدید تپ چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا جسم انگارہ کی طرح جل رہا تھا۔ بدورا نے کہا "احمد تم کو تو بخار ہے۔ تم مجھ سے چھپا رہے تھے یہ کب سے اس طرح جھلس رہے ہو؟"۔ احمد نے کہا "یقین مانو مجھکو بخار آج ہی آیا ہے"۔ اس نے جھوٹ کہا تھا۔ اس کو ایک ہفتہ سے اسی طرح تپ چڑھی ہوئی تھی اور خون بھی منہ سے آرہا تھا۔ وہ بدورا سے اپنی حالت چھپائے ہوئے تھا۔ بدورا فکرمند ہوگئی۔ اس کو احمد کی حالت اندیشہ ناک معلوم ہورہی تھی۔ اس دن احمد چلا گیا رات کو بدورا دیکھنے گئی۔ احمد میدان میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بدورا سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور کہا بدورا بیکار پریشان نہو میں اچھا ہوں۔ شاید موسم کے اثر سے بخار آگیا ہے۔ بدورا کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے دردمندانہ لہجہ میں کہا۔ مگر ایسی نازک حالت میں موسم کا اثر ہوجانا کچھ کم گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ احمد نے ادھر ادھر کی باتیں کرکے کہا۔ آج نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو پیار کروں۔ بدورا کے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے جنکو اس نے چھپا کر کہا "تو کرلو۔ اس میں ہرج کونسا ہے؟" اس نے اپنا سر احمد کی طرف جھکا دیا۔ احمد نے کہا "نہیں مگر مجھکو حق نہیں"۔ بدورا اس زندگی سے اکتا چکی تھی جسمیں حقوق و فرائض کو بیجا اہمیت دیکر خوامخواہ کی تلخیاں پیدا کرلی جاتی ہیں۔ احمد نے عرصہ کے بعد ایک تمنا کا اظہار کیا تھا۔ بدورا اس کو پوری کرنے پر تل گئی۔ اس نے کہا "اگر تم میرا پیار نہیں کرتے تو میں تمہارا پیار کرتی ہوں" اس نے احمد کو لپٹا لیا اور منہ چومنے لگی۔ احمد سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے بھی بدورا کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ ایک عمر کے بعد احمد کا یہ پہلا بوسہ تھا۔ بدورا کو اس میں ایک عجیب لذت محسوس ہوئی۔ احمد کے منہ سے بخار کی جو بھاپ آتی تھی۔ بدورا کے لئے

اس میں بھی ایک کیفیت تھی۔ اس کے بعد احمد نے بدورا کو "شب بخیر" کہکر رخصت کر دیا۔ بدورا رات بھر اس بوسہ کی یاد میں جاگتی رہی اور احمد کے حسرت بھرے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے بدورا کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن وہ ایک گھنٹہ بھی نہ سونے پائی تھی کہ ایک دلنشین آواز سے اس کی نیند اچٹ گئی ایک شیاما جو روز صبح آکر صحن میں مہندی کے درخت پر بیٹھکر اپنے ترانے سنا جایا کرتی تھی۔ آج بھی فضا کو لطیف نواسنجیوں سے معمور کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک جذب ہوتا تھا۔ جو بدورا کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا بدورا محویت کے ساتھ اُس کے نغمے سنا کرتی تھی۔ مگر آج اس کی لے میں معمولی سوز گداز کے علاوہ ایک اور بات تھی جو غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔ بدورا نے اس کو محسوس کیا لیکن اس کی تشریح نہ کر سکی۔ آخر کار اپنے واہمہ کا ایک کرشمہ سمجھکر اس خیال کو اپنے دل سے نکالدیا۔ شیاما اپنا کام پورا کرکے اُڑ گئی۔ بدورا احمد کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ دہوپ نکل آئی احمد نہیں آیا۔ بدورا کو تعجب ہوا۔ احمد روز طلوع آفتاب سے بہت پہلے آیا کرتا تھا۔ بدورا نے سمجھا کہ کل کے بخار سے ممکن ہے ضعف زیادہ ہو اور سویرے نہ اٹھ سکا ہو۔ وہ ناشتہ لئے بیٹھی رہی سورج سر پر چڑھ آیا۔ ہوا کی تپش تیز ہو گئی۔ ہر طرف خاک اڑنے لگی۔ کھانے کا وقت آرہا تھا اور احمد نہیں آیا بدورا کی پریشانی بڑہنے لگی۔ وہ احمد کی خبر لینا چاہتی تھی۔ اس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں اس کی حالت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو اس کی بیچینی بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ کر نہ سکتی تھی۔ خود دن دوپہر نکل نہ سکتی تھی اور احمد کے مکان میں سوا مالتی کے کوئی آتا نہ تھا۔ سو اب مالتی بھی نہیں آتی تھی سارا دن گزر گیا۔ شام ہو گئی احمد نہیں آیا۔ بدورا بیتابی کے ساتھ رات کی تاریکی کا انتظار کر رہی تھی۔

رات کو نو بجے بدورا آہستہ سے نکلی اور احمد کی جھونپڑی کی طرف چلی۔ ہر طرف سے سیاروں اور الوؤں کی بھیانک آوازیں آرہی تھیں بدورا آج ان کو سُن سن کر سہم رہی تھی۔ گھبراہٹ میں وہ پاؤں رکھتی کہیں تھی اور پڑتے کہیں تھے۔ یہ رات اور راتوں کی سی نہ تھی۔

بدورا نے احمد کو میدان میں نہیں پایا۔ اس کی چارپائی بھی وہاں نہ تھی۔ بدورا کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ خود اس کو بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ آگے بڑہی تو اس کے جان میں جان آئی۔ احمد جھونپڑی میں ہوا کے سامنے سویا تھا۔ بدورا دبے پاؤں اس کے بستر کے پاس گئی۔ احمد بے خبر تھا۔ اس نے آہستہ سے نام لیکر پکارا۔ احمد نے جنبش نہ کی بدورا نے اس کا شانہ ہلایا احمد نے کروٹ نہ لی۔ بدورا کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ بخار کی غفلت ہے۔ احمد کا بخار کل سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ بدورا اسر تھام کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چراغ لاکر دیکھا تو احمد کا چہرہ لالہ کی طرح سُرخ تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں خون جما ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بدورا کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ احمد سے لپٹ کر رونے لگی۔ احمد پر اس کا بھی کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سانس لے رہا تھا مگر گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ بدورا اس کے رخساروں پر اپنے رخسار رکھکر کہنے لگی "احمد! میرے احمد! اب میں کیا کروں یہ تم کو کیا ہوا ہے؟ تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا تم اپنی بدورا کو نہیں پہچانتے؟ یہ میں نے کیا کہا؟ احمد! احمد!"

لیکن پھر وہ چپ ہو کر اور اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ وہ اس کو مکان کے اندر لیجانا چاہتی

تھی مگر یہ تنہا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ مجبوراً بیٹھی سوچتی رہی۔ یکایک اس کو خیال آیا کہ اگر کسی طرح ابوالخیر اس وقت یہاں آ سکتا تو ممکن ہو کچھ کیا جا سکتا ابوالخیر کو کیسے بلایا جائے؟ خود اس کا جانا نامناسب تھا۔ بدورا اسی مسئلہ پر غور کر رہی تھی کہ مالتی داخل ہوئی اور بدورا کو دیکھکر رک گئی۔ بدورا نے مالتی کو پہچان کر کہا "مالتی کیوں رکتی ہو؟ کیا میرا یہاں رہنا تم کو گوارا نہیں؟ تم مجھکو اپنی راہ کا کانٹا نہ سمجھو۔ میں یہاں بدبختی کا کھیل دیکھنے آئی ہوں۔ احمد کا حال آؤ تم بھی دیکھ لو۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کب سے اس طرح پڑے ہوئے ہیں۔"

مالتی نے کہا "صبح ہی سے یہ حالت ہے۔"

بدورا نے کہا "کیا؟ تمکو معلوم تھا؟ اور تم نے مجھکو خبر نہ کی؟"

مالتی نے اس کا جواب نہ دیا اور کہا "میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے گئی تھی۔ وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کا سامنا نہ کرنا چاہتی ہوں تو مکان کے اندر رہئے۔" بدورا مالتی کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ مالتی سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا تم سے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کس نے کہا تھا؟" مالتی نے چین بجبیں ہو کر کہا "کہتا کون؟ شام کے وقت خود مجھے خیال آیا اور میں بلانے چلی گئی۔ یہ بدقسمتی تھی کہ اس سے پہلے مجھکو یہ یاد نہ آیا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر بھی ہیں۔ لیکن اب وہ آتے ہوں گے اب گھر میں چلی جائیے۔"

بدورا نے کہا "اب مجھکو چھپنے کی فکر نہیں رہی۔ آتے ہیں تو آنے دو۔ وہ میرا اب کچھ نہیں کر سکتے میں یہیں رہونگی۔" مالتی چپ ہو کر احمد کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اتنے میں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں ابوالخیر جھونپڑی کے سامنے تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے مالتی کے علاوہ ایک اور عورت کو دیکھا۔ اور اس کے منہ سے نکل گیا "بدورا! تم یہاں ہو!" بدورا نے ہمت کر کے جواب دیا "ہاں۔ مگر اس وقت یہ پوچھنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ جلد سے جلد معائنہ کر کے بتائیں کہ مریض کی حالت کیسی ہے" یہ کہکر بدورا نے پکارنا شروع کیا "احمد! میرے جانباز احمد!" اور رونے لگی۔

اتنی دیر میں ابوالخیر کی حیرت دور ہو چکی تھی۔ اس کو اطمینان ہو گیا کہ بدورا کا پتہ تو چلا۔ بدورا کو ایسے ہیجان و ہذیان میں اس نے اپنے حال پر چھوڑ دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ بدورا کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فطرت میں ضد اور ہٹ کس قدر ہے۔ وہ سرکش تھی۔ ابوالخیر نے اس وقت بے موقع اس کو چھیڑ کر آمادۂ بغاوت کرنا نہ چاہا۔ بدورا کے لہجہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کھلم کھلا بغاوت پر تُل جائیگی اور دنیا میں کسی کی پروا نہ کرے گی۔ ابوالخیر احمد کے قریب گیا اور غور سے اسکو دیکھنے لگا۔

مالتی اور بدورا دونوں ابوالخیر پر مضطربانہ نگاہیں ڈال رہی تھیں۔ بڑی دیر تک احمد کو ادھر سے ادھر پھیر پھیر کر دیکھتا رہا۔ جب اچھی طرح دیکھ چکا تو پوچھا "کب سے یہ حال ہے؟ بدورا نے مالتی کو ایک نظر دیکھا۔ مالتی نے کہا ان پر بخار کا دورہ اکثر پڑ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی منہ سے خون آ جاتا تھا۔ ادھر کوئی سات آٹھ دن سے ان کو بہت تیز بخار تھا۔ اور آج صبح سے یہ حالت ہے۔ ابوالخیر نے کہا "ہاں معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ سے سل کا عارضہ ہے۔ لیکن یہ بخار سل کا نہیں ہے بلکہ موسم کے اثر سے اُن کو ٹائفایڈ ہو گیا

ہے جو ایک زہریلا بخار ہے۔ وقت پر طبی مدد نہ پہنچنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انکا دماغ ماؤف ہو گیا ہے اور اب صورت مہلک ہے۔ افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مریض زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹہ کا مہمان ہے"

مالتی ساکت رہگئی۔ بدورا پر اس تشخیص نے ایسا اثر کیا کہ وہ احمد سے لپٹ گئی اور اس کے منہ کو چوم چوم کر کہنے لگی آہ! احمد! تم پر یہ سب آفتیں گزرتی ہیں اور تم نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ تم خون تھوکتے رہے اور مجھکو کچھ خبر نہ تھی۔ تم نے جان اور مال دونوں میرے پیچھے لٹا دیا۔ احمد میں عاقبت میں کیا منہ دکھاؤنگی۔ ابوالخیر کو اس سماں سے جو تکلیف ہوئی ہو۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا اور بدورا سے پوچھا "تم اس طرح ان کو کب سے چومتی رہی ہو؟"

بدورا نے بیباکی سے جواب دیا "یہ پوچھنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ میں برابر اسی طرح چومتی رہی ہوں۔ اب احمد ہی میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میری دنیا یہی ہیں۔ میری آخرت یہی ہیں"

ابوالخیر نے ان ہذیانات کی پروانہ کی اور پھر پوچھا "اور اسی طرح ہونٹوں کو چومتی رہی ہو؟"

"جی ہاں" یہ کہکر بدورا نے احمد کے ہونٹ پھر چوم لئے۔

"تو میں ابھی ایک دوا بھیجتا ہوں" ابوالخیر نے کہا "تم اس کو پی لینا۔ یہ مرض سخت متعدی ہے اگر اس دوا کو نہ پیوگی تو تمہاری جان بھی خطرہ میں پڑ جائے گی"

بدورا نے ترش ہو کر جواب دیا "آپ اس کی پروانہ کیجئے۔ میں دوا پی کر کیا کرونگی۔ مجھے جان عزیز نہیں۔ کاش آج احمد کے پہلو بہ پہلو میں بھی مرتی ہوتی!"

ابوالخیر نے کہا "خیر پینا نہ پینا تمہارا کام ہے۔ میں دوا بھیجدونگا" چلتے چلتے اس نے پوچھا "تم یہاں کب تک رہوگی؟ میں پوچھنے کا حق رکھتا ہوں۔ اس لئے پوچھتا ہوں"

بدورا نے اسی بے پروائی اور بیباکی سے جواب دیا "اب ہمیشہ اسی مکان میں رہونگی۔ اب میرا پیچھا چھوڑ دیجئے" ابوالخیر بغیر کچھ کہے ہوئے چلا گیا۔

(۱۸)

مالتی کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بدورا اپنے جذبات کے ہنگامہ سے ایسا بے قابو تھی کہ اس کو خیال بھی نہیں ہوا کہ اس کے سوا احمد کا کوئی اور بھی چاہنے والا ہے۔ مالتی کے قلب و جگر میں جو ٹیس اٹھ رہی تھی اس کو وہ راز کی طرح چھپائے ہوئے تھی۔ بدورا سے اب بھی اجنبیت محسوس کرتی تھی اور اس کے سامنے بے نقاب ہو کر اور جی کھول کر احمد کے ساتھ اپنے ان خون شدہ حسرتوں کو سیراب نہ کر سکتی تھی جن کو عمر بھر نکیلے کانٹوں کی طرح اپنے دل میں چھپائے رہی۔ بدورا نے اس کو پہلے نہیں محسوس کیا لیکن پھر خیال آیا اور وہ نادم ہو کر رہ گئی۔ اس نے انداز سے پالیا تھا کہ مالتی اس کے روبرو احمد پر ایک آنسو بھی نہ گرائے گی۔ اس لئے وہ رہ رہ کر احمد کے پاس سے ہٹ جاتی تھی اور مکان کے اندر چلی جاتی تھی۔ مالتی اس درمیان میں اپنے

دل کی ایک ایک تہ کو کھول کر رکھ دیتی تھی۔ اور احمد کے چلتے ہوئے گالوں کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیتی تھی۔

ابوالخیر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ صبح ہوتے ہوتے احمد کا دم اکھڑ چلا۔ اب رونے دھونے اور سر پیٹنے کا وقت نہ تھا۔ صبر و استقلال کے ساتھ سانس گننے کا وقت تھا۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے احمد زندگی کی صعوبتوں سے نجات پا گیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ احمد کو مٹی دینے والوں کے سپرد کر دیا جائے۔ بدورا نے اس کی پیشانی پر آخری بار بوسہ دیا اور مالتی سے کہا "تم بھی رخصت ہو لو"۔ مالتی سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بیتاب ہو کر احمد سے لپٹ گئی اور دیر تک اس کے منہ پر اپنا منہ رکھے آنسو بہاتی رہی۔

شام سے پہلے تجہیز و تکفین کے مرحلے بھی ختم ہو گئے اور اب کچھ کرنا نہ تھا۔ احمد نے مالتی سے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اسی ڈھاک کے جنگل میں اپنا مدفن بنانا چاہتا ہے جہاں وہ اکثر زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام پر غور کرتا تھا۔ اس کی وصیت کی تعمیل کی گئی۔

رات کو مالتی اپنے گھر جانے لگی تو بدورا نے اس کو روکا اور ہاتھ جوڑ کر کہا "مالتی اب خدا کے لئے مجھ سے کدورت نہ رکھو میں مانتی ہوں کہ احمد میری ہی بدولت تمہارا نہ ہو سکا لیکن اس میں کسی کا قصور نہ تھا۔ میں اگر کسی کی گنہگار ہوں تو احمد کی۔ تمہاری نہیں میں نے اُسکو تم سے نہیں چھڑایا۔ اس کو البتہ زندگی کی سیر سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور پھر تم اگر اس کو واقعی چاہتی رہی ہو تو وہ جتنا تمہارا تھا اتنا کسی کا نہ تھا۔ اسی طرح احمد بھی مجھکو اپنا بنائے تھا۔ اب مالتی آؤ ہم دونوں ساتھ اس کا ماتم کریں"۔

مالتی نے کہا "اب وہ کسی کے نہیں ہیں۔ شاید ہم دونوں کے یکساں ہیں۔ زندگی میں تو وہ آپ کو چھوڑ کر کسی کے نہیں ہوئے آپ کا سودا ان کے سر میں کچھ اس طرح سمایا کہ پھر کبھی نہیں نکلا میری شاید ان کو کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ اس لئے کہ میں خوبصورتی میں آپ کی پاسنگ نہیں ہوں۔ لیکن مرنے کے بعد آدمی کے لئے خوبصورتی اور بدصورتی برابر ہو جاتی ہے۔ خیر۔ اب آپ اگر چاہتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں تو مجھکو کوئی عذر نہیں"۔

بدورا نے کہا "ہاں مالتی میں تین چار روز اس مکان میں رہونگی۔ تم میرے پاس رہو۔ رات کو ہم دونوں اس کی قبر پر جایا کریں گے اور اس کے بعد میں اپنے مکان میں چلی جاؤنگی اور تم یہاں رہنا۔ یہ مکان اب تمہارا ہے۔ لیکن روزانہ رات کے وقت میرے پاس آنا اور میرے ہمراہ اس جنگل میں آنا جہاں احمد ہم لوگوں کو دنیا کی آفتوں میں چھوڑ کر میٹھی نیند سوتا ہے.... مالتی میری اس خواہش کو رد نہ کرو"۔ مالتی نے بدورا کی خواہش کو رد نہیں کیا۔

(۱۹)

احمد کو مرے ہوئے ایک ہفتہ سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ بدورا روز رات کو مالتی کے ساتھ احمد کے مزار کی زیارت کرنے جاتی تھی مالتی جنگل کے ایک ایک پتہ میں محو ہو جاتی تھی۔ بدورا اس کے خضوع و خشوع سے متاثر تھی۔ ایک مرتبہ مالتی نے گویا بغیر کسی کو مخاطب کئے ہوئے کہا "میرے لئے اب یہ جنگل سارے سنسار سے بڑھ گیا ہے۔ اس میں میری محبت دفن ہے۔ اسمیں تم رہتے ہو۔ اس کے ایک ایک پھول میں تمہارا رنگ اور تمہاری مہک ہے۔ یہاں کے ذرہ ذرہ میں تمہاری روح ہے میں تم کو دیکھتی ہوں

اپنے سے قریب محسوس کرتی ہوں" بدورا دم بخود رہگئی۔ اس وقت وہ آپ اپنی نگاہ میں حقیر ہوگئی تھی اب تک وہ ان جذبات کو شاعرانہ تخیل سے زیادہ قابل اعتنا نہ سمجھتی تھی۔ وہ صائب کے اس شعر کو پڑھ پڑھ کر وجد کیا کرتی تھی:-

"یادگارِ جگرِ سوختۂ مجنون است		لالۂ چند کہ از دامن صحرا برخاست"

لیکن اس کو خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ یہ واقعی کسی کا دین دایمان ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایک ایسی جاہل بے پڑھی لکھی دہقانی عورت کے منہ سے ایسے لطیف محسوسات کا اظہار اس کی خود فریبی کو دور کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنے کو مہذب اور لطیف الخیال سمجھتی تھی۔ اس کو دھوکہ تھا کہ وہ محبت کے اسرار و نکات سے واقف ہے آج اس کو معلوم ہوا کہ اس کی تمام تہذیب و تعلیم اس کو وہ نہ سکھا سکی جو مالتی کو محبت نے سکھا دیا۔ مالتی کی محبت کیسی بے لاگ تھی۔ اس کی محبت کی گہرائی کیسی بے تھاہ تھی! بدورا اپنے کو بھول گئی۔ اس نے مالتی سے کہا" مالتی آج مجھکو معلوم ہوا کہ تم کیا ہو۔ تم اُن عورتوں میں سے ہو جو صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ احمد نے غلطی کی جو تمہاری محبت کو قبول نہیں کیا وہ میرے عشق میں دنیا سے منہ موڑے ہوئے تھا۔ میں جو ہرگز اسکی محبت کی حقدار نہ تھی۔ وہ تمہارے ساتھ اپنی بگڑی ہوئی زندگی بنا سکتا تھا۔ تم دونوں کے مزاج میں کیسی موافقت تھی تم دونوں کے خیالات وجذبات کتنے ملتے جلتے ہیں مجھکو پہلے اس کا علم تھا"

مالتی نے کہا" میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ انھوں نے میری محبت قبول کی یا نہیں۔ وہ انوکھی طبیعت کے آدمی تھے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ سے محروم ہوکر وہ چین سے ایک گھڑی نہ گزار سکے" یہ کہکر مالتی پھر اپنے خیالات میں کھوگئی بدورا بھی خاموش ہوگئی اس کا دل اُمڈنے لگا تھا۔

کوئی دس دن بعد کا ذکر ہے کہ مالتی حسب دستور بدورا کو لینے آئی تو اُس کو معلوم ہوا کہ بدورا کو صبح سے تپ چڑھی ہوئی ہے۔ مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر نے اُس دن کہہ دیا تھا کہ "اگر تم دوا نہ پیوگی تو تمہاری جان بھی خطرہ میں ہے" بدورا نے دوا نہیں پی تھی اور شاید وہ وقت آگیا تھا جس سے ڈاکٹر ڈر رہا تھا۔ مالتی کو یاد آگیا کہ دوا کی شیشی اب تک امیر نگر کے مکان میں رکھی ہوئی ہے وہ بلا کچھ کہے سنے واپس گئی اور دوا لاکر بدورا سے کہنے لگی" اس کو پی لیجئے۔ بیکار اپنے کو ہلاک کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ کو اسی روز پی لینا چاہئے تھا"

بدورا نے مسکراکر کہا" مالتی کیا دراصل تمہارا اعتقاد ہے کہ انسان کی زندگی اور موت پر دوا قابو پا سکتی ہے؟" مالتی نے جواب دیا انسان غیب کا حال نہیں جانتا۔ اور آپ کے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم جان بوجھ کر اپنے کو موت کے منہ میں دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ میرا کہنا مانئے اور آپ اس دوا کو پی لیجئے" بدورا نے کہا "اچھا لاؤ" اور دوا پی لی۔

دوسرے دن اس کا بخار اور تیز تھا۔ بدورا کو یقین ہوگیا کہ یہ موت کا پیغام ہے۔ لیکن وہ ہراساں نہ تھی۔ موت کا ڈر اس کے دل سے دور ہو چکا تھا موت کو اب وہ ایک خواب راحت سمجھنے لگی تھی۔ ابوالخیر کو بدورا کی بیماری کی خبر مل گئی وہ ابتک دور ہی دور سے بدورا کا حال دریافت کیا کرتا تھا۔ آج وہ کنک پور آیا۔ بدورا پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ گھبرائی ہی

نہیں - ابوالخیر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - بدورا کو دہی تپ محرقہ تھی - ابوالخیر دشمن کے ساتھ علاج کرنا شروع کیا - وہ بدورا کی تیمار داری میں دن رات رہنے لگا - ایک ہفتہ بعد بدورا کو اسہال شروع ہوگیا - ابوالخیر مایوس ہوگیا - ٹائیفائڈ کی یہ صورت نہایت خطرناک ہوتی ہے - بدورا کی آنتوں میں زخم ہوگئے تھے - ابوالخیر اس کی زندگی سے بالکل ناامید ہوگیا تھا لیکن علاج اور مریض کی دیکھ بھال میں اسی سرگرمی کے ساتھ مصروف رہا جیسا کہ ڈاکٹروں کا قاعدہ ہے۔

قدرت کی مصلحت اور انسان کی مصلحت میں کوئی نسبت نہیں ہوتی - بدورا اس خیال سے مطمئن تھی کہ اب بہت جلد دنیا کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائیگی - مگر یہ ہوا نہیں - اس کا اسہال بند ہوگیا اور اکیسویں دن بخار بھی اتر گیا - ابوالخیر نے سمجھا کہ غیب سے اس کی مدد ہوئی اور بدورا پھر سے پیدا ہوئی - اس کو یہ ڈر ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں تپ پھر عود نہ کر آئے اس ڈر سے اُس نے بدورا کو پندرہ دن تک بستر سے ہلنے نہیں دیا -

مالتی بدورا کی عیادت کو برابر آتی رہی صحتیاب ہونیکے بیسویں دن بدورا مالتی کے ساتھ احمد کی قبر پر گئی اور بے اختیار رو دی مالتی کو بھی اس پر ترس آگیا - بدورا نے کہا مالتی احمد سچ کہا کرتا تھا قدرت بڑی بیدردی ہے - احمد نے زندگی میں مجھکو نہیں پایا مجھے امید تھی کہ مرکر میں اس کو پا لونگی اور وہ مجھکو - یہ بھی آس ٹوٹ چکی" - ان الفاظ میں کچھ اور بھی معنے تھے جس کو سادہ لوح مالتی نہ سمجھ سکی - گزشتہ آٹھ دس دن سے ابوالخیر بدورا کو رام کرنے کی کوششیں کر رہا تھا - اُس نے ایک دن بہت صاف صاف کہا تھا :-

"بدورا مجھکو تم پر جو حق اور جو اختیار حاصل ہے اس سے دنیا انکار نہیں کر سکتی - مگر میں اس سے بیجا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا میں تم پر جبر و تشدد نہیں کر سکتا - تم کو سمجھانا چاہتا ہوں - تم سوچو اور سمجھو جس طرح تم اس وقت زندگی بسر کر رہی ہو تمام عمر بسر کرنا ممکن نہیں ایسی حالت میں جبکہ میں زندہ ہوں اور یہاں موجود ہوں - میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ بے انصافی نہیں بے رحمی کا برتاؤ کیا مگر اب میرے ہوش بجا ہوگئے ہیں - میں خلوص دل اور صدق نیت سے اپنی اور تمہاری زندگی کو پرسکون بنانا چاہتا ہوں - تم نادان نہیں ہو - تم نے بھی دنیا میں بہت کچھ نشیب و فراز دیکھ لیا ہے - اب زندگی کے باقی ماندہ دن کو سکون میں گزارنا ہے - مجھکو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم موت کے منہ سے اسی لئے بچی ہو - میں تم کو رسول آباد دیکھنا چاہتا ہوں"

بدورا کے دل میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ابوالخیر سے بغاوت کرتی - اور اب احمد بھی نہ تھا - پھر کس کے برتے پر بغاوت کرتی - ابوطالب کلیم کا یہ کہنا غلط نہیں ہے -

طبع ہم رساں کہ بسازی بعالمے یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

بدورا میں اب وہ ہمت نہ تھی کہ واقعات کی دنیا کا مقابلہ کر سکتی - اس لئے دنیا سازی پر مجبور ہوگئی - وہ مذہباً اور قانوناً ابوالخیر کی تھی - اس سنگین حقیقت کے سامنے اس نے اپنا سر جھکا دیا دوسرے دن اس کو اپنا سارا اثاث البیت لیکر "نصیر کوٹ" چلا جانا پڑا اس دن رات کو مالتی احمد کی قبر پر تنہا تھی - اُس نے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو جو ایک دن پہلے بدورا بکھیر گئی تھی قبر سے

درحپہ جیبا لم و نبالکہ ادپانی

لگ کر دیا اور کہنے لگی "اب تم بہ ... ب اعتبار ... رے ہو اور صرف میرے ہو۔ تمہاری بدورا تم کو بھول گئی۔ اگرچہ تم نے اپنی جان اسی پر نچھاور
پھر تمہارے نام کی مالا جپونگی ... ں میری دعا یہ ہے کہ تم کو بھولنے سے پہلے میں دنیا کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بھول جاؤں اپنی زندگی کو بھول
نہیں میرے ... بھولنے والے میں تم کو کبھی نہیں بھولونگی۔ مگر یہ میں نے کیا کہا! تم بھی ممکن ہے مجھکو کبھی نہ بھولے ہو۔ تمہاری
زندگی تمہارے لئے ایک الجھاوا تھی۔ میں تم کو الزام نہیں دے سکتی۔ تمہاری طبیعت شریف تھی۔ تم لوگوں کے دکھ درد میں شریک
ہوتے تھے تمہارا دل پریم رس سے بھرا ہوا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے بھول جاؤ۔ میں تو تم کو اتنا چاہتی تھی"

(۲۰)

ابوالخیر اپنی دیرینہ آرزو میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بچپن کی مراد بر آئی۔ وہ اب اگر اپنے باپ دادا کی کل جائداد پر قابض نہیں ہے تو اس کا نصف اس کے تصرف میں ضرور ہے۔ قربان علی اور بیگم کے پاس جو کچھ تھا وہ اب ابوالخیر کی ملکیت ہے وہ اپنی تمام بے عنوانیوں سے متنفر ہو چکا ہے اور بدورا کی دلدہی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔

بدورا نے بھی اپنے کو زمانہ کی رفتار پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی زندگی کو پر کیف اور طربناک تو نہیں کہہ سکتے لیکن ہموار اور شورشوں سے مامون ضرور ہے۔ قدرت نے دل بہلانے کے لئے اس کو ایک کھلونا بھی دیدیا ہے اس کی گود میں سال بھر کا ایک لڑکا بھی ہے جس کے ساتھ وہ مصروف رہتی ہے۔ گزرا ہوا زمانہ اگر اس کو بھولا نہیں ہے تو ہر وقت پیش نظر رہکر اب اس کو بےچین بھی نہیں کرتا۔ ممکن ہے اب اس میں بےچین ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

نالتی بڑے دل و دماغ کی عورت ہے۔ وہ اسی طرح احمد کی قبر پر مجاوری کیا کرتی ہے۔ وہ احمد کے مکان میں رہتی ہے اور جو جائداد وہ اسکے سپرد کر گیا ہے اس کا انتظام کرتی ہے۔ لیکن اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کو اپنی دال روٹی کا صرف نکال کر احمد کے نام پر خیرات کر دیتی ہے۔ وہ دن اور رات کا زیادہ حصہ اُسی جنگل میں کاٹتی ہے جہاں اس نے پہلی بار اپنی تمنا کا اظہار کیا تھا اور جہاں آخرکار اس نے اپنے احمد کو پالیا۔

مومن ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست۔

مجنوں

فلسفۂ مذہب

مذہب اور معاد حیات بعد الممات کا عقیدہ دنیا میں ایسا عام ہی کہ بعض وحشی اقوام جو کہ مذہب سے بالکل عاری سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک ملتی ہی قبل اس کے کہ ہم اس عقیدے پر مورخانہ اور ناقدانہ نظر ڈالیں ہمکو روح کی اصلیت اور اس کے وجود پر بحث کرنا ہی کیونکہ بغیر اس کے حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھنا مشکل امر ہے۔

روح یا نفس ناطقہ یا ادراک انسانی کیا ہی۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان میں ایک حاسہ ہو جس سے وہ اشیاء کا ادراک کرتا ہی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ خود جسم کا ایک خاصہ ہی یا اس سے ایک جدا چیز ہے۔ ہم اپنی خودی یا ہستی کو اپنے جسم سے ایک علحدہ چیز تصور کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ہاتھ ہی۔ یہ ہمارا پیر ہی۔ یہ ہمارا بدن ہی۔ گویا کہ انسان کی خودی اس کے جسم سے علحدہ ہستی رکھتی ہی۔ اب دیکھو انسان کے جسم میں عمر کے ساتھ ساتھ کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مگر باوجود اس تبدیلی کے ہم اپنی ہستی میں کوئی تغیر نہیں پاتے — جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم جسم کے پابند نہیں رہتے بلکہ جسم ہمارا پابند ہوتا ہی اور حقیقت یہ ہی کہ خود ہمارے خیالات ہم کو مجبوراً اپنی ہستی کو اپنے جسم سے علحدہ رکھنے پر مائل کرتے ہیں بہرحال یہ بات علانیہ نظر آتی ہی کہ ہمارے تمام اجزائے جسمانی بطور آلات کے ہیں اور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرے کے لئے کام کر رہے ہیں اور ان سب پر کوئی اور چیز حاکم ہی جو ان سب سے کام لیتی ہی۔ ہاتھ جو کچھ چھوتا ہی۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ کان جو کچھ سنتے ہیں۔ یہ احساسات خود آنکھ اور کان کے کام نہیں آتے بلکہ ایک اور قوت ہی جو ان کے نتائج سے متمتع ہوتی ہی۔ اعضا صرف شہادت مہیا کرتے ہیں۔ لیکن ان شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنا ایک دوسری قوت کا کام ہے یہ امر اس موقع پر واضح ہو جاتا ہی جہاں خود حواس غلطی کرتے ہیں مثلاً ایک چیز دور ہونے کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہے آنکھ نے اس سے کو چھوٹا ہی سمجھا ہی۔ لیکن انسان فیصلہ کرتا ہی کہ آنکھ نے غلطی کی ہی اور اس کی شہادت اس موقع پر اعتبار کے قابل نہیں۔

اب سوال یہ ہی کہ ان تمام اجزاء، اعضا، حاسۂ ظاہری اور باطنی سے کام لینے والی کیا چیز ہے۔ مادئین کہتے ہیں کہ دماغ ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دماغ کے متعدد اور مختلف حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ ایک خاص قوت کا مرجع ہے۔ دماغ میں اس عام قوت کا کوئی مقام ثابت نہیں ہوتا۔ جو تمام خاص خاص قوتوں پر حکمراں ہو اور جس کے لئے یہ تمام قوتیں آلات کے طور پر کام دے رہی ہوں تجربہ نے قطعائیہ ثابت کر دیا ہی کہ جو چیز جسمانی ہے اور جسم کا حصہ ہی اس کی حیثیت آلے سے بڑھکر نہیں ہے اس لئے وہ چیز جو ان تمام اعضا و حواس اور قویٰ سے کام لیتی ہی ضرور ہی کہ ان سب سے بالاتر ہو اور جسمانی نہ ہو کیونکہ اگر جسمانی ہو تو وہ بھی آلہ ہوگی اور اس کا ایک خاص اور محدود کام ہوگا۔ یہی عام قوت اور سب سے کام لینے والی قوت روح اور

نفس ناطقہ ہے۔ مگر وہ ہے کیا چیز۔ ممکن ہے کہ جوہر نہ ہو بلکہ جسم کی ساخت اور ترکیب کی ایک کیفیت ہو یعنی عرض ہو۔ ابن مسکویہ نے اس احتمال کو اس طرح سے باطل کیا ہے۔ (دیکھو کتاب الکلام علامہ شبلی)

(۱) جو چیز مختلف صورتوں اور کیفیتوں کو قبول کرتی ہے وہ خود ان صورتوں اور کیفیتوں کا کوئی فرد نہیں ہوتی۔ مثلاً جسم جو مختلف رنگوں کو قبول کرتا ہے اور سفید، سیاہ اور سرخ ہو سکتا ہے ضرور ہے کہ مرتبۂ ذات میں خود بالکل سادہ ہو اور کوئی رنگ نہ رکھتا ہو ورنہ دوسرے مختلف رنگوں کو قبول نہ کریگا اور چونکہ روح تمام اشیاء کا تصور کر سکتی ہے اور اس میں ہر صورت کے ادراک اور قبول کی قابلیت ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ عرض نہ ہو ورنہ عرض کے نہ گانہ اقسام یعنی کم و کیف وغیرہ میں سے کسی قسم کے تحت میں داخل ہوگی۔

(۲) عرض ایک ایسی چیز ہے جو جسم کے پیدا ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے۔ اور اس کا مرتبہ کم ہوتا ہے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ جو چیز تمام اعضاء۔ اجزاء۔ قوائے حواس ظاہری و باطنی پر حکومت کرتی ہے۔ خود ایک عارضی ناپائدار اور غیر مستقل چیز ہو۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ روح جوہر ہے اور جسمانی نہیں ہے تو خود ثابت ہوگیا کہ وہ فانی نہیں کیونکہ فانی ہونا اجسام کا خاصہ ہے جو چیز جسمانیات سے بالکل بری ہے وہ کیونکر فنا ہو سکتی ہے۔ یہ دعویٰ موجودہ تحقیقات کے موافق نہایت آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے۔ تحقیقات جدیدہ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شے فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی صرف ہیئت ترکیبی بدل جاتی ہے اور اس کے اجزا الگ الگ ہو کر کوئی اور صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام دنیا اگر ملکر چاہے تو ایک ذرے کو اس طرح فنا نہیں کر سکتی کہ وہ بالکل معدوم محض ہو جائے اور چونکہ یہ ثابت ہو چکا کہ روح مرکب نہیں بلکہ بسیط ہے تو نہ اس کی تحلیل ہو سکتی ہے نہ اس کے اجزا بدل سکتے ہیں اس لئے اُس کا فنا ہونا غیر ممکن ہے۔

مگر انسان کو خود اس کی اپنی زندگی میں بعض اوقات ایسے حادثات سے سابقہ پڑتا ہے۔ کہ اس کا یہ حاسہ بالکل معطل ہو جاتا ہے مثلاً بیہوشی کی حالت میں جبکہ دماغ پر کوئی صدمہ پہونچے تو اس وقت آدمی اپنی خودی بالکل گم کر دیتا ہے یا ایک حد تک عالم خواب میں جبکہ اس کے دماغی اعضاء معطل ہو جاتے ہیں۔ پس اگر روح جسم سے علیحدہ ایک چیز ہے تو اعضا اور جوارح کے صدمات اور حادثات سے اس کا معطل ہو جانا کیا معنی ہے۔ ضرور ہے کہ ان دونوں میں کوئی ایسا تعلق ہو کہ بغیر حواس و دماغ و عضو انسانی کی مدد کے روح اپنا کام کرنے سے قاصر رہے۔ حشر اجساد کا جو عقیدہ اسلام میں پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اعضاء انسانی کے تعطل کے بعد روح کا احساس ویسا باقی نہیں رہتا جیسا کہ ہم روزمرہ کے مشاہدہ میں پاتے ہیں اور اس لئے انسانی موت درحقیقت ایک قسم کی گہری نیند یا بے ہوشی ہے جس میں آپ کو کوئی ادراک و احساس نہیں ہو سکتا جب تک روح کے عمل کے لئے پھر ویسی ہی آلات دماغ بہم نہ پہونچائے جائیں۔ اور جسوقت یہ دونوں وابستہ ہوں گے اور روح پھر اپنا عمل کریگی تو وہ حالت بالکل اس حالت سے مشابہ ہوگی جب کہ انسان ایک غفلت کی نیند یا بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتا ہے اور اس وقت جب انسان اُٹھیگا تو اُس کو یہی معلوم ہوگا کہ وہ ابھی ابھی ایک گہری نیند سے اُٹھا ہے۔ قرآن بھی اسی کی تائید میں ہے

اور علم نفسیات پر جن اصحاب نے عبور کیا ہے وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ علم سائیکالوجی کے رو سے روح کا عمل احساس اعضائے انسانی کے وجود پر موقوف ہے۔

قرآن شریف میں ہے:-

(۱) اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا فیمسک التی قضی علیہا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون ۝

(۲) ونفخ فی الصور فاذا ہم من الاجداث الی ربہم ینسلون ۝ قالوا یویلنا من بعثنا من مرقدنا ہذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون ۝

روح کی ماہیت سمجھنے کے لئے سب سے بہتر تمثیل عالم طبعیات میں قوت برق سے دیجا سکتی ہے جسطرح برقی رو کا اندازہ بغیر معمول کے ممکن نہیں اور نہ اس کی ماہیت و تعریف ہو سکتی ہے۔ اسیطرح سائیکالوجی کے رو سے روح کا تعلق جسم سے بالکل برقی رو کی طرح ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ وہ ایسی چیز نہیں ہے جو ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہوجایا کرے اسکا لگاؤ جسم و دماغ کے ساتھ ایسا ہے کہ مثلاً ہم اگر روح کو بذات خود جسم سے ایک علٰحدہ جوہر تسلیم کریں اور اس کا اجسام سے منتقل ہونا فرض کریں تو ایک روح جو انسان کے جسم سے نکل کر کتے کے جسم میں داخل ہوجائیگی تو کتا انسان نہ بن جائیگا۔ بلکہ روح کتے میں منتقل ہوکر کتے کی روح بن جائیگی۔ روح کی بدولت انسان کو اپنی ہستی کا علم اسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اس کے جسم سے ملی رہے روح اور جسم کو دو لازم ملزوم چیز سمجھنا ایک نہایت پرانا خیال ہے۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ روح خدا کا جزء ہے جس کے لئے جسم فانی میں اس کا محدود ہونا بمنزلہ اس کے مقید ہونے کے ہے۔ پنڈار (Pindar) کے ایک قول کو جسے ڈبلو۔ ڈونالڈسن (J. W. Donaldson) نے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکیم کے نزدیک صرف جسم کو موت آتی ہے۔ مگر زندگی یا روح مثل ایک سایہ کے باقی رہجاتی ہے۔ اور اس چیز کا تعلق براہ راست خدا سے ہے۔ اس کا قول ہے کہ جب ہمارے اعضا کام کرتے ہیں تو یہ چیز سوتی رہتی ہے۔ اور جب ہمارے اعضا سوتے ہیں تو یہ روح ہوشیار ہوکر ہم کو آئندہ کے حالات و واقعات کی اکثر اطلاعیں دیا کرتی ہے۔ سقراط کا جو قول افلاطون کی کتاب فیڈو (PHAEDS) میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط جسم کو محض روح کا ایک لباس تصور کرتا تھا۔ اس کے اترنے کے بعد روح دائمی راحت کی طرف سفر اختیار کرتی ہے۔ افلاطون کے اس قول پر کہ روح فانی نہیں ہے اس کی دلیلیں ذرا سطحی ڈھونڈی سی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ بیماریاں جسم کو فنا کر دیتی ہیں مگر وہ بیماریاں جو روح کی ہوتی ہیں مثلاً بدی وہ اس کو فنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں یا معاد کے بارے میں اس کا یہ عجیب قول ہے کہ اس کا ماننا اس لئے ضروری ہے کہ ارباب قانون و شریعت نے اپنی قانون کی بنیاد اس کے ماننے پر موقوف رکھی ہے۔ یعنی معاد و سزا و جزا کا ماننا ہی دراصل قانون و شریعت کی اجرا کا سبب دنیا میں ہوا ہے یا فیڈرس (Phaedrus) میں اسکی یہ دلیل کہ روح چونکہ خود بخود حرکت کرتی ہے اس لئے وہ ابدی

و غیر فانی ہو۔ افلاطون کی ساری دلائل کا خلاصہ یہ ہو کہ روح سے زندگی کا احساس ہوتا ہو۔

ارسطو کا خیال تھا کہ عقل ازلی ہی ابدی ولازوال شے ہے۔ اور روح اسیکا ایک شمہ ہو مارکس اریلیس (Marcus Aurelius) کا خیال تھا کہ ممکن ہو کہ روح موت کے بعد تھوڑے عرصے تک قایم رہو مگر اس کے بعد وہ نظام عالم میں جذب ہوجاتی ہو۔ اپی کورین (Epicureans) کا قول تھا کہ عقلمند آدمی کو موت سے نہ ڈرنا چاہئے کیونکہ جب تک ہم ہیں وہ نہیں ہو اور جب وہ ہو تو ہم نہیں ہیں۔ اسپائنوزا (Spinoza) اپنے عقیدہ وحدت الوجود کی مناسبت سے انسانی روح کے غیر فانی ہونے کا منکر تھا۔ لیکن باوجود اس بات کے وہ اس کو مانتا تھا کہ انسانی دماغ جسم کے فنا ہونے کے ساتھ بالکل فنا نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اس کے بعض اجزا ایسے ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ یہ دلیل دیتا ہو کہ یہ چیز یعنی روح چونکہ دماغ کا جوہر اصلی ہو اس لئے وہ خود جوہر اصل یعنی خدا سے ایک ازلی و ابدی وناگزیر تعلق رکھتا ہو۔

لیبنز (Leibnitz) کا خیال تھا کہ جسم و دماغ ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں بلکہ وہ دونوں علٰحدہ رہتے ہیں اور زندگی میں ان دونوں کا اتحاد ایک ازلین قانون فطرت کے مطابق ہو۔ روح بحیثیت ایک علٰحدہ شے کے غیر فانی ہو اور اسواسطے ابدی ہو۔ موت سے دونوں ہستیوں میں علٰحدگی ہوجاتی ہو اور روح اپنی پہلی حالت میں واپس ہوجاتی ہو۔ اگر انسانی روح ایک قسم کی قوت یا عنصر یا جوہر بسیط ہے توجسطرح عناصر فنا نہیں ہوسکتے اسی طرح ہم روح کے فنا ہونے کا تصور نہیں کرسکتے بداہتاً انسانی روح اس زندگی میں حواس ظاہری کے ذریعے سے ہماری زندگی کو قایم رکھتی ہو اور اسیطرح وہ ہماری عقل وفکر اور ان کے نتائج کے ساتھ ملی ہوتی ہو جو آخر میں ہم کو خدا اور ابدیت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں

کانٹ (Kant) کہتا ہے کہ اگرچہ ہم روح کے لئے ایک معین مقدار یا اس کا مرکب ہونا نہ مانیں تاہم اس کی حقیقت اور اس کے اندرونی تاثرات سے انکار نہیں کرسکتے۔ ممکن ہو کہ روح جسم کے ساتھ منتشر نہ ہوجائے لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں ہو کہ اسکی وہ قوت وماہیت بھی باقی نہ رہی جو جسم کے ملنے پر تھی۔ مگر کانٹ نے جہاں عملی عقل کے نکات (Critique of Practical Reason) پر بحث کی ہو وہاں وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہو کہ روح کا غیر فانی ہونا ایک مسلمہ امر ہو۔ قوت ارادی کا قانون اخلاق کے ساتھ ہمنوا ہونا یا بالفاظ دیگر پرہیزگاری وتقا کے لئے ضرور ہے کہ ہم ترقی کے ناتمام ہونے والے مدارج کو مانیں اور یہ اسیوقت ممکن ہو جبکہ ہم اپنی ہستی وجود کو غیر مختتم زمانے کے لئے تسلیم کریں۔ اسی بات کو بشپ بٹلر (Bishop Butler) نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہو کہ معاد کا ماننا اس واسطے ضروری ہو کہ ہماری آئندہ خوشیوں کا دارومدار ہمارے موجودہ اعمال پر ہو اور اسواسطے ہمارے اعمال کے لئے ضروری ہو کہ اس کا نتیجہ ہماری آنے والی ہستیوں میں ظاہر ہو۔ آدم فرگوسن (ADAM FERGUSSON) کا قول ہو کہ غیر فانی ہونے کی خواہش انسان کا فطری احساس ہو اور اس لئے ظاہر ہوتا ہو کہ جس چیز نے انسان میں یہ خیال پیدا کیا ہو وہ اس کے ماننے پر بالکل

مستعد بھی ہے۔

مادئین کی طرف سے جو اعتراضات انسان کے غیر فانی ہونے کے خلاف کئے جاتے ہیں انکی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ انسان کی روح کو محض دماغ کا ایک فعل طبعی جانتے ہیں۔ گویا روح صرف دماغی حالت کا خلاصہ ہے اور جب دماغ جسم کے ساتھ موت کے بعد باقی نہیں رہتا تو انسان کا وجود بھی باقی نہ رہیگا۔ اس کا جواب روح کی بحث میں دیا جاچکا ہے۔ دوسرا اعتراض طبیعین یا نیچرلوں کی طرف سے یہ ہے کہ انسان کا وجود محض چند قوانین فطرت (مفرد ضد) پر موقوف ہے اور اس عظیم الشان عالم فطرت میں انسانی حیثیت ایسی ادنیٰ ہے کہ یہ باور نہیں ہوتا کہ خود عالم فطرت پر زوال اور ارتقار کا اندیشہ کیا جائے اور اس ذرۂ ناچیز کو بقا کا درجہ دیا جائے۔ مگر ان لوگوں نے انسان کے تخیلات (Idealism) کو کوئی وقعت نہیں دی ہے جو اس عالم فطرت کو اپنے مٹھی میں رکھ کر عالم مابعد الطبیعات اور خدا کے عرش تک ٹکرا سکتا ہے۔ یقیناً جو دماغ و روح ایسے تصورات کا منبع ہو وہ اس عالم فطرت سے ———— کمتر نہیں ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والے انسان کی علیحدہ ہستی کو بعد موت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا یا فطرت کی ذات میں روح جذب ہو کر مفقود ہو گئی۔ اس فنائیت کی طرف عام انسانی فطرت کا رجحان ہی نہیں ہے۔ اور انسان کی ہستی یہی چاہتی ہے کہ وہ خدا سے علیحدہ رہکر اس کو قایم و بزرگ مانے۔ سب سے آخر میں اور سب سے لچر اعتراض ان لوگون کا ہے جو زندگی کو تمام برائیوں کا منبع جانکر اس کے بالکل ختم ہو جانے کو سب سے بڑی کامیابی جانتے ہیں اور زندگی کے دوبارہ قائم ہونے کو خرابیوں کا اعادہ سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے لوگوں کا جواب فطرت یا عقل انسانی سے ممکن ہے اور نہ ایسے خیال پر دنیا کا نظام معاشرت قایم رہ سکتا ہے۔

پس جہانتک عقل سلیم نے مذہب کے اندر یا اس سے علیحدہ ہو کر غور کیا اس نے موت کے بعد زندگی کے قیام کی نہ صرف آرزو کی بلکہ اس کو ناگزیر سمجھا۔ البتہ مذہبی خیالات میں الہامی خیالات و اوہامی خیالات کے متصادم ہونے سے جو صورت پیدا ہوگئی ہے اس نے مذہبی دنیا کے اندر دو مختلف و متضاد خیالات پیدا کر دئے ہیں بعض مذاہب وہ ہیں جو حشر و نشر و قیامت بہشت و دوزخ کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور بعض مذاہب جو تناسخ کے قائل ہیں۔ تو ہم سب سے پہلے مسئلہ تناسخ پر غور کرینگے۔ جو مذہب ہنود و بودھ کا طرۂ امتیاز ہے اور اگر یہ مسئلہ فطرت انسانی کو قبول نہ ہوا تو ہم اُس کے متعلق یہی فتویٰ دیں گے کہ وہ محض وہم ہے اور الہام سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں۔ اس کے بعد حشر و نشر و بہشت و دوزخ و قیامت پر بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ یہ خیالات کس درجہ فطرت انسانی کے لئے قابل قبول ہیں۔

تناسخ کے معنی یہ ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی روح حسب مراتب عمل جزا یا سزا کے لئے کمتر یا اعلیٰ انسان یا جانور یا نباتات میں چکر لگایا کرتی ہے۔ اس کے بنیادی اصول انسانی دور جہالت و وحشت کے اولین خیالات پر مبنی ہیں اول یہ کہ انسان کے اندر ایک چیز سانس یا ہوا کی طرح ہے جو اس کے جسم سے زندگی کے پہلے اکثر اور عموماً خواب میں اور مستقل طور سے موت کے بعد علیحدہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیا کے موالید ثلاثہ میں بھی اسی قسم کی سانس یا ہوا ہے اور اسی کے

ذریعہ سے وہ بھی انسان کی طرح ادراک اور خواہشات رکھتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ چیز ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اکثر اقوام وحشیہ وہ نیم میں خصوصاً اہل تبت میں یہ عقیدہ عام طور سے پایا جاتا ہے کہ ایک بچہ نوزائیدہ میں مرنے والے کی روح منتقل ہو کر آجاتی ہے۔ چنانچہ جب تبت کا ڈلائی لامہ مرتا ہے تو اس کے مرنے کے نو مہینے کے بعد ایک بچہ مخصوص علامات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس میں وہی ڈلائی لامہ کی روح حلول کر جاتی ہے۔

انسانی روح کا کسی جانور میں حلول کر جانا وحشیوں کے خیالات طوطم کے سلسلے میں ایک مسلمات میں سے ہے۔ طوطم (Totemism) ایک اصطلاح ہے جو امریکہ کے وحشی قوموں کے زبان سے لی گئی ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ کے وحشیوں میں یہ خیال راسخ ہے۔ کہ ان کے آباؤ اجداد کسی جانور سے وجود میں آئے ہیں۔ جیسے ہمارے ہندوستان میں بعض راجہ اپنے کو ناگ بنشی (سانپ کی اولاد) یا چندر بنشی یا سورج بنشی کا گمان کر کے فخر کرتے ہیں۔ یا رومیوں اور ترکوں میں یہ خیال ہے کہ اُن کے مورث اعلیٰ کو بھیڑیئے نے پرورش کیا تھا۔ بالکل اسی طرح عرب کے بعض قبائل کا نام بنی کلب، بنی ذئب یا بنی نملۃ وغیرہ ہے۔ اور ایران کی قدیم روایتوں میں بھی زال پدر رستم کی پرورش ایک سیمرغ سے بتائی جاتی ہے۔ تو مرنے کے بعد وحشی قوموں کا خیال تھا کہ ان کی روح اس جانور میں پائی جاتی ہے جس سے ان کی نسل کی ابتدا ہوئی اور اقوام[1] وحشیہ اسی خیال سے ان جانوروں کے گوشت کو مذہباً ممنوع جانتے تھے جن کا تعلق ان کی نسل سے ہے۔ جب تک مصر کے موجودہ آثار کی تحقیقات نہیں ہوئی تھی لوگ ہیروڈوٹس کے بیان کو صحیح مان کر قدیم مصریوں کو بھی تناسخ کا قائل سمجھتے

---

[1] میں نے مذہب و عبادات کے عنوان میں طہارت کے ذیل میں ماکولات پر ایک نظر ڈالی ہے۔ علمائے یورپ کا خیال ہے کہ یہودیوں میں جانوروں کے گوشت کے حلال و حرام ہونے کی بنیاد بھی انہیں خیالات طوطم کی وجہ سے ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ سورہ انعام میں باوجود اس کے کہ حلال و حرام گوشت میں کسی قسم کی فہرست مسلمانوں کو نہیں دی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہودیوں پر ان کی روزی تنگ کرنے کے خیال سے تمام پنجے والے جانور ان پر حرام کر دئے گئے تھے لیکن مسلمانوں نے فقہ اور یہود کی صحبت بد کی اثر سے بالکل ویسی ہی حلال و حرام کی فہرست مسلمانوں کے لئے بنا ڈالی ہے یعنی مسلمان اپنے عمل سے اب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب اسلام کے احکامات بھی ادہامی ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے معدہ پر ہمارے دین و ایمان و اخلاق کا انحصار ہوتا۔ الا بجز اس صورت کے کہ اس قسم کے کھانے ہماری صحت و اخلاق پر طبی اصول سے مضر ہوں مثلاً شراب۔ سڑا اور مسموم کھانا یا مردار یا خون وغیرہ ایک لغو اور مضحکہ خیز بات ہے۔ سور کے گوشت کے حرام ہونے میں محض عربوں کی معاشرت اور عادات کا لحاظ رکھا گیا ہے اگر قرآن ہندوستان میں اترتا تو غالباً گائے کا گوشت یہاں بھی منع کر دیا جاتا اور اس کی مصلحت جہاں تک میرے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ سور ہمیشہ غلیظ جگہ کو پسند کرتے ہیں اور ان کے حلال ہونے اور پالنے کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا کہ اصول حفظان صحت میں خصوصاً جبکہ عرب کے دیہات پہلے ہی سے غلیظ و کثیف ہوتے ہیں اور خرابیاں پڑ جاتیں ورنہ قرآن کا یہ شرطیہ امر کہ جہاں اس کے کھائے بغیر چارہ نہ ہو وہاں کھایا جاسکتا ہے۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ گوشت کی اقسام اور ان کے جواز و عدم جواز میں مذہب کا کوئی بڑا تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ خود انسانی فطرت بعض قسم کے گوشت سے طبعاً متنفر ہے۔ اور بعض قسم کے گوشت سے اس کو طبعاً رغبت ہے۔ اگر کسی کی فطرت ہی ایسی ہو تو اس کی پاداش میں اس پر مذہب کی طرف سے عتاب ہونا یہ بات دل کو نہیں لگتی۔

تھے مگر موجودہ تحقیقات کی رو سے مصریوں میں تناسخ کا کوئی خیال نہیں پایا جاتا ان کا خیال تھا کہ بعض ارواح مرنے کے بعد عالم ارواح میں اپنی خوشی سے جو صورت چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں البتہ یہ خیالات سب سے زیادہ رسوخ کے ساتھ ہندوستان کی قوموں میں ملتے ہیں۔ اگرچہ وید میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے مگر اپنشاد (Upanishads) وگیتا میں تناسخ کا پورا اگیت گایا گیا ہے اور تناسخ کے اولین وقدیم خیالات میں جو بعض اقوام وحشیہ میں پائے گئے ہیں ان پر فلسفہ ہند نے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ بالآخر وہ مذہب ہنود کا ایک عظیم اعتقادی مسئلہ ہو گیا بلکہ سزا وجزا میں بھی اسی مسئلہ سے مدد لی گئی ہے مثلاً بقول منوجی کے ایک پاپی جو ایک برہمن کو قتل کرتا ہے۔ وہ کئی خوفناک دوزخ طے کرنے کے بعد کتے، سور یا گدھے یا اونٹ کی صورت میں دوبارہ دنیا میں جنم لیتا ہے۔ روح کا ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں جانا یہاں تک تو وحشی اقوام کے خیالات طوطم کا نتیجہ تھا مگر اس پر سزا اور جزا کے فلسفہ کا اضافہ کرنا یہ ان خیالات سے بہت ارفع تھا جو وحشیوں میں ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے تناسخ کے بارے میں ابتدائی خیالات اور آریاؤں کی الہامی وفلسفی خیالات دونوں کے امتزاج سے اس عقیدہ کی جو اپنی موجودہ نوعیت میں یونانیوں کے خیالات سے بالکل جداگانہ ہے تشکیل ہوئی ہو۔ چنانچہ جب فلسفہ و مذہب ہند پر جمود کا دور طاری ہوا تو تناسخ کے خیالات عجیب لغو پیرائے میں عوام کا عقیدہ بن گئے حتیٰ کہ خود مذہب براہمہ نے اس عقیدے کی تائید کی کہ ہر روح کے لئے کم سے کم چوراسی لاکھ جون طے کرنا مقدر ہے۔ تب جا کر وہ خدا کی روح میں جذب ہو کر نروان یا فنائیت کو پہونچے گی۔ بودھ مذہب نے اس عقیدے میں بہت کچھ فروعی ترمیم کی مگر چونکہ وہ مذہب نہ خدا کو مانتا ہے نہ روح کو اس واسطے اس کے لئے تناسخ کا ماننا بھی ضروری نہ تھا۔ بودھ مذہب نے اس مسئلے سے صرف اس قدر اختیار کیا ہے کہ ایک انسان کا "کرم" دوسرے نئے انسان میں پیدا ہو جاتا ہے اور جب "کرم" بالکل ایک پاک وجود میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ روح نروان یا فنا ہو جاتی ہے۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ قدیم یونانیوں میں تناسخ کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ ایام وحشت وجہالت کے خیالات جو تقریباً تمام عالم میں یکساں تھے اور جن کے کچھ نہ کچھ آثار مثلاً قربانی چڑھانا دو مذہب کے دور ارتقا داخل ہو گئے انھوں نے تناسخ کے خیالات کو ایک خاص شکل میں مذہبی عقیدہ بنا دیا ہو۔ ارفک (Orphic) مذاہب جس نے سب سے پہلے یونان میں اس خیال کی ابتدا کی ہے وہ سب سے پہلے تھریس (Thrace) کی نیم وحشی قوموں میں پھیلا تھا۔ اس مذہب کے مفروضہ بانی ارفیس (Orpheus) کے نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا مذہب یہ تھا کہ روح وجسم ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ روح ایک ازلی اور خدائی چیز ہے اور جسم سے آزاد ہونے کی ہر وقت کوشش کرتی ہے۔ مگر جسم نے اس کو ایک زنجیر سے قید کر رکھا ہے۔ موت روح کو آزاد کر دیتی ہے۔ مگر یہ آزادی تھوڑے دنوں کے لئے ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر اس کو کوئی نیا جسم پکڑ کر اپنے قید خانہ میں ڈال لیتا ہے۔ از بسکہ پیدائش کی چرخی جاری ہے سو روح

ایک جسم سے نکل کر تھوڑے وقفہ کے بعد پھر ایک دوسرے جسم کے قید خانہ میں پڑ جاتی ہے۔ ان بدقسمت روحوں کو زندان جسم سے رہائی دلانا افلیس کا مشن تھا۔ یہاں تک کہ انسان اپنے اخلاقی اعمال سے رفتہ رفتہ اچھے قید خانوں سے گزرتے ہوئے خدا تک پہونچ جائے۔ (باقی ——— باقی)

سید مقبول احمد

مارخیم

(فسانہ)

"ہاں، ہمارے ہاں مختلف قسم کے بردے ہیں۔ بعض خریدار ناواقف ہوتے ہیں تو میں اس وقت اُن سے اپنے اس نادر علم کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اور بعض مشتبہ ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے دوکاندار نے موم بتی کو اس طرح اوپر اٹھایا کہ جس کی تمام روشنی گاہک کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تو اس وقت میں اپنی اس پہچان کا نفع حاصل کرتا ہوں۔"

مارخیم ابھی ابھی دن کی روشنی میں گلی سے آیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ابھی تک پوری طرح دوکان کی تاریکی سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ اس لئے ان چبھتے ہوئے الفاظ پر جبکہ موم بتی کا شعلہ اس کی آنکھوں کے قریب آگیا اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا دوکاندار ایک نہایت مکروہ اور خوفناک ہنسی ہنسا "تم میرے پاس کرسمس کے دن آئے ہو" اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ "اس دن جبکہ تم جانتے ہو۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ دوکان میں نے بند کر رکھی ہے۔ اور یہ اصول بنا رکھا ہے۔ کہ آج کوئی کام نہ ہوگا اس لئے تمہیں اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تمہیں میرے اس وقت کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو میں نے آج حساب کی پڑتال کے لئے مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تمہیں اس طرز عمل کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر ہوں اور تم سے کوئی استفسار نہ کرونگا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب کوئی خریدار مجھ سے آنکھیں نہیں ملاتا تو اُسے اس کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔" دوکاندار نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر اسی کاروباری لہجہ میں مگر طنزاً کہنے لگا "تم حسب معمول پھر بیان کر سکتے ہو۔ کہ تم نے مال کہاں سے پایا۔ کیا اب کی بھی یہ تمہارے مرحوم چچا مرحوم کی الماری سے نکلا ہے؟ اس کو چیزوں جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔"

یہ کہکر پستہ قد، گول مول اور زرد رو دوکاندار پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے سنہری چشمہ کے فریم کے اوپر سے مارخیم کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرہ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

"اس دفعہ تم غلطی پر ہو" مارخیم نے کہا "میں بیچنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے پاس اب فروخت کرنے کے لئے نادرات روزگار ختم ہو چکے ہیں۔ اور میرے چچا کی الماری میں چوکھٹا تک باقی نہیں رہا۔ اس دفعہ میرا مدعا صرف ایک دوشیزہ کے لئے کرسمس کا تحفہ خریدنا ہے۔ اور واقعی میں تمہارے اوقات میں ——— حارج ہوا ہوں جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیونکہ کل غفلت سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اور آج دوپہر کے کھانے پر مجھے یہ تحفہ پیش کرنا ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے۔"

ایک سکوت طاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوکاندار اس بیان کی صداقت پر غور کر رہا ہے۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک اور گاڑیوں کا نرم شور جو قریب کی شاہراہ سے گزر رہی تھیں۔ اس سکوت کے وقفہ کو پُر کر رہا تھا۔

آخر دوکاندار بولا "بہتر ہے جناب، آپ میرے پرانے گاہک ہیں۔ اور اگر آپ کے لئے واقعی اچھی شادی کرنے کا موقع ہے تو میں اس میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتا، یہ لیجئے۔ یہ خاتون کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہے۔ یہ دستی آئینہ، پندرہویں صدی کا ہے اور ایک اچھے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ خریداروں کے واسطے دینے والے کا نام محفوظ رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی آپ کی طرح شریف آدمی ہے۔ جو اپنے چچا کی جائداد کا مالک بنا تھا"

دوکاندار یہ کہتا ہوا آئینہ کو الماری سے نکالنے کے لئے جھکا۔ اور مارخیم کے بدن میں برقی رو کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہوگئے۔ اور ہنگامہ خیز جذبات اس کے چہرہ پر آگئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے آئینہ کو پکڑ لیا۔

"آئینہ؟" اس نے کھانستے ہوئے کہا کیونکہ اس کی آواز گلے میں آکر رک گئی تھی۔ "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ ہرگز نہیں"

دوکاندار نے استفسار کیا "اور کیوں نہیں؟"

مارخیم نے ناقابل بیان انداز میں دوکاندار کو دیکھا اور کہا "تم مجھ سے پوچھتے ہو کیوں نہیں؟ ذرا اس کو دیکھو اس میں دیکھو اپنے آپ کو دیکھو۔ کیا تم اس کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نہ میں اور نہ کوئی اور آدمی پسند کریگا"

دوکاندار نے چونک کر اس طنز کا جواب دیا تو میرے خیال میں آپ کے تحفہ کے لئے میری دوکان میں کوئی چیز نہ ملیگی"

مارخیم بولا "میں تحفہ کے لئے کوئی معقول چیز طلب کرتا ہوں اور تم مجھے یہ دیتے ہو۔ یہ صدیوں کی یادگار۔ گناہوں اور جرموں کی یادگار"

دوکاندار نے گاہک کو بغور ملاحظہ کیا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی۔ کہ مارخیم مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا

دوکاندار بولا "مگر اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا "یہ کہ نہ تم کسی سے محبت کرتے ہو نہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟ تم صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہو اور کچھ نہیں"

دوکاندار نے ذرا ترشروئی سے جواب دیا "میں تمہیں بتاؤنگا کہ کیا جانتا ہوں" مگر پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر قہقہہ لگایا اور کہا "دیکھو یہ تمہاری شادی کا معاملہ ہے اور یقیناً اس دوشیزہ کا جام صحت پیتے رہے ہوگے"

مارخیم نے اسے روکتے ہوئے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا "کیا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟ مجھے اس کے متعلق بتاؤ"

دوکاندار نے جواب دیا "میں نے؟ کسی سے محبت کی ہے؟ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا۔ اور نہ ان خرافات کے لئے آج میرے پاس وقت ہے۔ تم آئینہ لوگے یا نہیں؟"

مارخیم نے جواب دیا "مگر اس میں جلدی کونسی ہے۔ یہاں کھڑے ہوکر باتیں کرنا نہایت دلخوش کن ہے اور زندگی اتنی قلیل اور محدود ہے کہ میں کسی خوشی کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ہمیں چاہئے کہ جو کچھ حاصل ہوسکے وہ حاصل کریں اس لئے گپ میں وقت صرف کرنا سب سے بہتر ہے آؤ ہم ایک دوسرے کے متعلق باتیں کریں۔ اور دوئی کا پردہ اٹھادیں اور اپنے راز کو کھول دیں۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں دوست بن جائیں؟"

دوکاندار نے کہا "میں صرف یہ کہوں گا۔ کہ یا تو سودا خرید دیا دکان سے باہر چلے جاؤ"
مارخیم نے جواب دیا" بالکل درست تو اچھا مجھے کچھ اور دکھاؤ"
دوکاندار ایک دفعہ پھر آئینہ کو دیکھنے کے لئے جھکا۔ مارخیم اس کے قریب ہوگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور ایک گہرا سانس لیا اس وقت مختلف قسم کے جذبات اس کے چہرہ سے ظاہر ہو رہے تھے۔
"غالباً یہ تمہارے لئے اچھا رہیگا" دوکاندار بولا۔ لیکن جب وہ کھڑا ہو رہا تھا تو مارخیم اپنے شکار پر جھپٹا۔ خنجر ہوا میں چمکا اور دوکاندار کی پشت میں پیوست ہوگیا۔ دوکاندار لڑکھڑا کر گرا۔ تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہوکر رہ گیا۔
مارخیم نعش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے پر ایک خاموشی طاری تھی۔ موم بتی جل رہی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا" یہ نعش اس وقت تک یہاں رہیگی۔ جب تک کوئی اس کو ڈھونڈ نہ نکالے۔ ڈھونڈھ لی جائیگی؟ اور پھر تو کیا یہ مردہ گوشت کا ڈھیر کوئی ایسی آواز پیدا کریگا۔ جو تمام انگلستان میں گونج اٹھیگی؛ اور دنیا کو تعاقب کی صداؤں سے پر کردیگی۔"
یہ خیالات ابھی اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ کہ پہلے ایک۔ پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر اسی طرح مختلف گھڑیوں نے مختلف رفتار اور آوازسے دن کے تین بجائے۔ اس سنسان کمرہ میں ان آوازوں نے اس کو گھبرا دیا اور اس نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کردیا اس نے کمرے کے آئینوں میں بہت سے عکس دیکھے جو اسے گھور رہے تھے اس کی آنکھیں ان عکسوں کو دیکھتیں اور دل کا راز معلوم کرتیں۔ اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑتی اور اسے بری معلوم ہوتی۔
اور اسی طرح جب وہ ٹہل رہا تھا۔ تو اس کو اپنے طریقۂ عمل میں ہزاروں نقص نظر آنے لگے۔ اس کو چاہئے تھا۔ کہ اس سے زیادہ خاموش وقت اس کام کے لئے منتخب کرتا۔ اس کو چاہئے تھا کہ جائے واردات سے عدم موجودگی کی شہادت بنالیتا اسے خنجر اس کام کے لئے نہیں استعمال کرنا تھا۔ بلکہ دوکاندار کا گلا گھونٹ کر مار دینا تھا۔ اس کو ذرا زیادہ دلیر ہونا چاہئے تھا۔ اور نوکر کو بھی قتل کردینا چاہئے تھا۔ غرضکہ اس کو تمام انتظام دوسرے طریقہ پر کرنا چاہئے تھا۔ اس اثنا میں زیادہ خوفناک خیال اس کے دماغ میں اس طرح چکر لگانے لگے۔ جس طرح کسی ویران جگہ میں چوہے دوڑتے ہیں۔ سپاہی کے ہاتھ اسکے کندھے پر پڑیں گے اور اس کا تمام بدن ان کے مس سے پکڑی ہوئی مچھلی کی طرح مرتعش ہوگا۔ عدالت کا کٹہرا۔ قید کی کوٹھری پھانسی کا تختہ وغیرہ یہ تمام چیزیں سرعت کے ساتھ اس کے دماغ سے گزرنے لگیں۔ اور گلی کے لوگوں کا خوف فوج کی طرح اسے محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انھوں نے اس لڑائی کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ اور وہ اب بھی اسطرف کان لگائے ہوں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ تمام دنیا بجائے کرسمس منانے کے میزوں کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی وہ رسا بن رہی ہوگی جس سے اس کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ وہ آواز پیدا کئے بغیر نہیں چل سکتا اور وہ ٹھہر جاتا۔ کبھی گھڑیوں کی ٹک ٹک اسے اتنی بلند معلوم ہوتی کہ وہ کانوں کو بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ کبھی کمرے کی خاموشی اسپر گراں گزرنے لگتی اور وہ زور زور سے اس طرح چلنے لگتا۔ گویا کہ ایک کاروباری آدمی اپنے کام میں مصروف ہے۔

یکایک باہر گلی میں سے ایک پُر مذاق آدمی نے ڈنڈے سے دوکان کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار کا نام لیکر پکارا۔ مارخیم کا خون اس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اس نے مردہ کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ وہ بالکل چپ تھا اور تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے تھے۔ وہ خاموشی کے بحر بے پایاں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکا تھا۔ اور اس کا جو نام کسی وقت پکارے جانے پر اس کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ اب اس کے لئے ایک بے معنی حقیقت رکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اس آدمی نے کھٹکھٹانا بند کر دیا اور چلا گیا۔

اب اس کے لئے کام کو ختم کرنے کا موقع تھا۔ اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس نعش سے دور بھاگ جائے لندن کی بیشمار آبادی میں گم ہو جائے۔ ایک آدمی آ چکا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دوسرے کے آنے کا امکان تھا۔ علاوہ اسکے کام کر چکنے کے بعد اس سے فائدہ نہ اُٹھانا محض حماقت پر مبنی تھا۔ اب اس کو دولت کی ضرورت تھی جو اس کا منتہائے مدعا تھا اور چابیوں کی جو دولت کا وسیلہ تھیں۔

اُس نے نیم وا دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے روشنی اور راہرووں کے سائے سنیما کی فلم کی طرح گزر کر سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے اور پھر اُس نے ایک حرکت کی اور مقتول کے نزدیک پہنچ گیا۔ زندگی کی روح جسم سے مفقود تھی بازو زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن دوہری ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی مارخیم اس کو چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے شانے پکڑ کر لاش کو اُٹھایا پیٹھ کے بل لٹا دیا۔ لاش بالکل ہلکی اور نرم تھی۔ بازو اس طرح زمین پر پڑے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ سے اندرونی جذبہ کی کوئی علامت ہویدا نہ تھی مگر موم کی طرح زرد تھا۔ اور داہنی کنپٹی خون سے لتھڑی ہوئی تھی جو مارخیم کے لئے اذیت دہ تھی۔ وہ ایک لمحہ کیلئے لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جرم کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہی ڈھانچہ ہر ایک جذبہ کا حامل تھا اور اب اس کی زندگی کی مشین اسی طرح قایم کر دیگئی تھی جس طرح کہ ایک گھڑی ساز گھڑی کو انگلی سے بند کر دیتا ہے۔

آخر کار ان خیالات کو دماغ سے نکال کر اس نے چابیوں کو تلاش کیا۔ اور دوکان کے کھلے دروازہ کیطرف بڑھا باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور جب مارخیم دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پھر ارادہ کو مضبوط کرکے دروازہ کھول دیا۔

مدہم اور دھندلی روشنی فرش پر پڑنے لگی۔ بارش کا شور اتنا زیادہ تھا۔ کہ مارخیم کو اس میں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قدموں کی چاپ، فاصلہ پر سپاہیوں کا چلنا۔ روپیہ کے گننے کی آواز مینہ کے گرنے کے ساتھ اسکو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہ وہ مکان اکیلا نہیں۔ ہر طرف سے اسیر موجودات کا رعب چھایا ہوا تھا۔ وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر بہت سے لوگوں کو چلتے سن رہا تھا۔ اور جب وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو اسکے آگے اور قدم بھی نہایت خاموشی سے چڑھ رہے تھے۔ اور پیچھے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بہرا ہوتا اور اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہتا۔ اس کا سر اس کی گردن پر ہر طرف بار بار حرکت کرتا اور آنکھیں ہر سمت

جلدی جلدی پھرتیں۔ سیڑھی کے چوبیں زینے اس کے لئے چوبیں عذاب تھے۔

پہلی منزل پر تین دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جو اس کو تین توپوں کے دہانے نظر آرہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اپنے گھر کی دیواروں میں محصور ہوتا۔ اور بستر کے اندر تمام کائنات سے علٰحدہ ہو کر چھپ جاتا۔ وہ قدرت کے انتقام سے خائف تھا کہ مبادا اس کے جرم کے لئے کوئی شہادت مہیا کردے یعنی ہوسکتا ہے کہ ٹھوس دیواریں منور اور شفاف بن کر اس کے جرم کو فاش کردیں۔ ہوسکتا ہے۔ کہ مضبوط تختے اس کے پاؤں تلے سے نکل جائیں اور اس کو گرفتار کرلیں ان توہمات سے وہ خائف تھا۔ اور درحقیقت یہی اوہام خدا کا انتقام کہلاتا ہے۔ مگر وہ خدا کی طرف سے مطمئن تھا۔ کیونکہ اس کے عذر ایسے تھے جو خدا جانتا تھا اور جو انصاف پر مبنی تھے۔

جب وہ گول کمرہ میں بحفاظت پہنچ گیا۔ اور دروازہ بند کرچکا۔ تو سابق خطرات کے خیال نے اس کو پھر گھیر لیا کمرہ سامان آرائش سے خالی تھا۔ فرش کوئی نہ تھا۔ تصویریں جو کھونٹوں کے بغیر دیوار پر الٹی لٹک رہی تھیں مختلف بوسیدہ الماریاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ مارخیم نے الماری میں ایک ایک کنجی لگانا شروع کی۔ یہ نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور ہوسکتا تھا کہ الماری خالی ہو۔ مگر اس کی مصروفیت نے اس کو مطمئن رکھا۔ باہر گلی میں مینہ کی آواز اب اسے غیر معمولی معلوم نہ ہورہی تھی۔ ایک طرف سے پیانو کی سریلی اور دلکش آواز آرہی تھی، بچے گلی میں دوڑ رہے تھے اور گرجا سے پادری کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

الغرض وہ یوں مصروف بیٹھا ہوا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ یکایک گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کا خون رگوں میں منجمد ہوگیا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ کھٹ سے دروازہ کی چٹخنی کھلی اور پٹ کھل گئے خوف سے مارخیم کا دم خشک ہورہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ کہ آنے والا کون ہے۔ کیا اسی مردہ نے چلنا شروع کردیا ہے یا پولیس کے آدمی ہیں۔ یا کوئی اتفاقی گواہ ہے۔ جو اس کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے آرہا ہے۔ مگر جب ایک آدمی دروازے کے اندر داخل ہوکر دوستانہ انداز میں ہنسا۔ اور اندر داخل ہوکر اس نے دروازہ بند کردیا تو مارخیم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اسکی طرف متوجہ ہوا

"کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے"؛ اس نے نہایت دلخوش کن لہجہ میں سوال کیا

مارخیم کھڑا ہوگیا۔ اور تعجب آمیز انداز میں اس کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی آنکھیں اس کو دھوکا دے رہی تھیں مگر نہیں وہ پوری جسامت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بعض دفعہ اس کو شک ہونے لگتا کہ وہ کوئی ارضی ہستی نہیں معلوم ہوتی مگر پھر وہ عام آدمیوں کی طرح اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اور اس نے پھر عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کیا "کیا آپ دولت تلاش کررہے ہیں؟"

مارخیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں مطلع کرتا ہوں۔ کہ مالک مکان کی ملازمہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے، اور جلدی یہاں پہنچ جائیگی۔ اگر تم یہاں پائے گئے تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے"

"تو کیا تم مجھے جانتے ہو؟" قاتل نے سوال کیا

آنے والے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "آپ مجھے مدت سے عزیز ہیں، اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی مدد کروں"

مارخیم چلایا "تم کون ہو؟ .... شیطان؟"

دوسرے نے جواب دیا "میری شخصیت اس خدمت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ جو میں آپ کے لئے انجام دینے والا ہوں"

مارخیم نے جواب دیا "ڈال سکتی ہے ڈالتی ہے۔ کیا میں تم سے مدد لوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تم سے [illegible]یں۔ تم مجھے نہیں جانتے خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔"

آنے والے نے جواب دیا "میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہیں باطن تک جانتا ہوں"

مارخیم چلایا "مجھے جانتے ہو؟ ایسا کون ہو سکتا ہے میری زندگی خود مجھ پر عیاں نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی فطرت کو دھوکا دیتا رہا ہوں تمام آدمی ایسا کرتے ہیں۔ تمام آدمی اس پردے سے بہتر ہوتے ہیں جس میں وہ بظاہر لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں انہیں زندگی ہر طرف کھینچے پھرتی ہے۔ اگر ان کو اپنے آپ پر قابو ہو۔ اور اگر تم ان کے چہرے دیکھ سکو تو تم ان کو مختلف پاؤگے اور وہ تمام پیغمبر نبی اور قائد ہوں گے۔ میں گناہوں سے لدا ہوا ہوں لیکن میری پاس اُن کے لئے نہیں جنکو خدا جانتا ہے، پھر اگر مجھے موقع ملے تو میں سب کچھ ظاہر کر دوں"

"مجھ پر؟" آنے والے نے استفسار کیا۔

قاتل نے جواب دیا "میرا خیال تھا۔ تم نہایت طباع ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ چونکہ تم یہاں موجود ہو اس لئے میرے دل کا راز سمجھ لوگے۔ مگر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگانا چاہتے ہو! ۔ خیال کرو کہ میرے اعمال کیا ہو سکتے ہیں۔ میں دیوؤں میں پیدا ہوا۔ اور دیوؤں میں زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ حالات کے دیوؤں میں اور پھر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگاتے ہو؟ کیا تم میرا باطن نہیں دیکھ سکتے؟ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجھے گناہ سے نفرت ہے؟ کیا تم میرے صاف ضمیر کو نہیں دیکھ سکتے جس پر گناہ کی سیاہی کا کوئی دھبہ نہیں؟"

جواب ملا "تم نے اپنے جذبات نہایت اچھی طرح بیان کئے ہیں مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یہ نکات میری عقل سے بالاتر ہیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ کہ تم نے کن حالات کے زیر اثر کیا کیا۔ بہرحال تم راہ راست سے بھٹک رہے ہو مگر وقت گزر رہا ہے۔ اور ماما نے دیر لگا دی ہے۔ مگر وہ قریب آ رہی ہے اور اس کا قریب آنا تمہارے لئے پھانسی کا قریب آنا ہے۔ کیا میں تمہاری مدد کروں! تمہیں بتاؤں کہ دولت کہاں رکھی ہے؟"

مارخیم نے سوال کیا "اس کا عوض کیا ہوگا"

دوسرے نے جواب دیا "میں اپنی خدمت کرسمس کے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں"

مارخیم بولا" نہیں میں تمہاری مدد بالکل نہ لونگا۔ خواہ میں پیاس سے مرجاؤں۔ میں اس جام سے پانی نہیں پیونگا جسکو تمہارے ہاتھ میرے لبوں کیساتھ لگائیں۔ میں انکار کرنے کی ہمت کو برقرار رکھونگا۔ خواہ تم اس کا یقین نہ کرو۔ مگر میں کہے دیتا ہوں کہ میں گناہ نہیں کرونگا؟"

آنے والے نے طنزاً کہا" قریب الموت آدمی کا اپنے گناہ پر افسوس کرنا کوئی بات نہیں"

مارخیم نے جواب دیا" کیونکہ تم اس کے اثر کا یقین نہیں رکھتے"

دوسرے نے کہا" میں اسکو اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یعنی جب زندگی ختم ہوجاتی ہی تو میرا کام ختم ہوجاتا ہی۔ آدمی میری خدمت کرنے کے لئے زندہ رہتا ہی۔ مذہب کو خراب کرنے کے لئے اور گیہوں کے کھیت میں کانس بونے کے لئے۔ مگر جب وہ مرنے لگتا ہی تو صرف ایک کام کر سکتا ہی یعنی اپنے گناہوں پر افسوس اور اس طرح مسرور ہونا چاہتا ہی۔ میں جابر نہیں ہوں۔ مجھے آزماؤ میری مدد قبول کرو۔ اور اپنی زندگی کے باقی لمحات اچھی طرح گزارو۔ میں ابھی ایک مرنے والے کے پاس سے آرہا ہوں۔ اس کا کمرہ دوستوں سے پُر تھا۔ جو اس کے آخری الفاظ سُن رہے تھے۔ مگر جب میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا جو رحم کے خلاف چقماق کی طرح سخت تھا۔ تو وہ ہنس رہا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی مرتے وقت خدا سے صلح کرلی تھی"۔

مارخیم نے کہا" اور کیا تم مجھے بھی ویسا ہی سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہی کہ میرے دل میں گناہ کرنے کے سوا اور کوئی جذبات نہیں؟ میرا دل اس خیال پر اچھل رہا ہی۔ کیا فطرتِ انسانی کے متعلق تجربہ نے تمہیں یہی سکھایا ہی؟ اور کیا قتل کا عمل اتنا بُرا ہے کہ نیکی کو اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کہہ دیا جائے؟"

دوسرے نے جواب دیا" قتل میرے لئے کوئی مخصوص گناہ نہیں۔ تمام گناہ اسیطرح قتل کے برابر ہیں۔ لیکن میں گناہ کا تعاقب کرتا ہوں اور اس کی تکمیل کے بعد تک اس کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نیکی کا بھی تعاقب کرتا ہوں اور یہ حقیقت مجھے اب معلوم ہوئی ہی۔ کہ گناہ اور نیکی میں میں ناخن بھر کا فرق نہیں۔ ہر ایک موت کے فرشتہ کے لئے درانتی ہے۔ گناہ جس کے لئے میں زندہ ہوں۔ اعمال میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ضمیر میں۔ مجھے گنہگار آدمی عزیز ہی نہ کہ گناہ کا عمل جس کے نتائج بعض اوقات کسی پیغمبر کے عمل سے بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔ اور میں تمہاری مدد اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے دوکاندار کو قتل کیا ہی۔ بلکہ تم مارخیم ہو"

مارخیم نے جواب دیا" میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھدونگا۔ یہ جرم جو تم نے دیکھا ہی میرا آخری جرم ہے اس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے ہیں یعنی یہ کہ میں نے جو کام کیا ہی وہ مجھے نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس جرم کا سبب میری غربت تھی۔ بعض انسانوں میں ایسے صفات ہوتے ہیں۔ جو اُن کو ایسا کام نہیں کرنے دیتیں مگر وہ مجھ میں نہ تھیں میں خوشی کا بھوکا تھا۔ اور اس لئے میں نے یہ کام کیا۔ مگر آج اس جرم کے بعد مجھ میں اور حوصلہ کی طاقت عود کر آئی ہی جو مجھے پھر مارخیم بنا دیگی۔ میں پھر آزاد آدمی ہوں۔ میں اپنے آپ کو تبدیل کیا ہوا پاتا ہوں۔ اب یہ ہاتھ صرف نیکی کے لئے استعمال ہوں گے اور اس دل میں صرف نیکی کا خیال ہوگا"

آنے والے نے کہا "تو تم یہ روپیہ اسٹاک ایکسچینج پر استعمال کروگے۔ جہاں تم قبل ازیں کئی ہزار روپیہ ضائع کر چکے ہو"

مارخیم نے کہا "مگر اس دفعہ منافع یقینی ہے"

دوسرے نے کہا "مگر اس دفعہ تم پھر ضائع کردوگے"

مارخیم بولا "مگر نصف میں اپنے پاس رکھونگا"

جواب ملا "تم وہ بھی ضائع کردوگے"

مارخیم کی پیشانی پر پسینہ کے سفید سفید قطرات چمکنے لگے "تو پھر کیا ہوا" وہ بولا "فرض کردیں سب کچھ ضائع کردونگا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ میں پھر پنجۂ افلاس میں گرفتار ہو جاؤنگا اور دوبارہ پھر یہی کوشش ہوگی حتیٰ کہ میں بہتر ہوجاؤنگا مجھ میں نیکی اور بدی دونوں کا مادہ موجود ہے۔ جو کہ مجھے دونوں طرف کشاں کشاں لئے پھرتا ہے۔ میں ایک چیز کی محبت نہیں کرتا بلکہ سب کی، میں غریب پر ترس کھاتا ہوں اور کسی امیر کی مخلصانہ ہنسی کو روا رکھتا ہوں۔ اور اس کو دل سے چاہتا ہوں کیا تمہارا خیال ہے کہ میری زندگی کی تلخیاں صرف میری بدطینتی ہے؟ اور کیا میری صفات حسنہ ہمیشہ خوابیدہ رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں"۔

آنے والے نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "مگر تم کو دنیا میں آئے ہوئے چھتیس سال ہو چکے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ تم دن بدن گر رہے ہو پندرہ سال ہوئے۔ جب تم چوری کے نام سے گھبراتے تھے۔ تین سال ہوئے تم قتل کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب کوئی ایسا جرم یا کوئی ایسا کمینہ فعل ہے جس سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہو؟ تم دن بدن نیچے اور نیچے کی طرف جا رہے ہو اور تمہاری اس رجعت کو موت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا"۔

مارخیم بولا "یہ بالکل صحیح۔ میں نے کسی حد تک بدی کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر ایک انسان ایسا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اچھے آدمی ماحول کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں"۔

دوسرے نے روکتے ہوئے کہا "میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کے جواب پر میں تمہارے اخلاق کی کیفیت بتاؤنگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کسی گناہ میں کامیاب ہو کر اپنے آپ کو سدھار سکے ہو؟"

"کسی گناہ میں!" مارخیم نے مضطرب لہجہ میں دہرایا "نہیں میں ہر دفعہ نیچے ہی نیچے جاتا رہا ہوں"۔

دوسرے نے جواب دیا "تو پھر تسلی رکھو۔ تم کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اور تمہارے خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتے"

مارخیم دیر تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ آنے والے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تو پھر کیا" مارخیم بولا "اور عزت؟"

دوسرے نے جواب دیا "کیا تم اس کو بارہا پہلے نہیں آزما چکے؟ تین سال گزرے جبکہ میں نے تم کو گرجا میں اقرار گناہ کرتے ہوئے تلافی کے لئے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ کیا یہی تمہاری آواز سب سے زیادہ بلند نہیں تھی؟"

اس موقعہ پر دروازہ کی گھنٹی بجی اور آنے والے نے فوراً ناصحانہ انداز بدلتے ہوئے یہ کہنا شروع کردیا " ماما دیپہا آگئی ہی - جیساکہ میں نے تمہیں پہلے اطلاع دی تھی - کہ وہ آنے والی ہی - اب تمہارے لئے ایک اور راستہ کھلا ہی - اور وہ یہ کہ تم ماما کو اندر داخل کرلو - اور کہو کہ اس کا مالک بیمار ہی - دیکھو کسی طرح کا خوف یا اضطراب تمہارے چہرہ سے ظاہر نہ ہونے پائے - اور جب لڑکی اندر داخل ہوجائے - تو پھر اس کے ساتھ اسی مہارت تامہ کے ساتھ وہی سلوک کرو - جو اس کے مالک کے ساتھ کیا گیا ہی - اور اس طرح سے تمہارا آخری خطرہ ختم ہوجائیگا - اس کے بعد تم اپنی خوشی سے دوکان لوٹ سکتے ہو - یہ خطرہ کے پردہ میں تمہارے لئے مدد ہے - جلدی کرو " وہ چلایا " دوست جلدی کرو - تمہاری زندگی اس وقت ترازو کے پلڑوں میں تل رہی ہی - جلدی کرو اور اسپر عمل کرو "

مارخیم نے نہایت نرمی سے جواب دیا " اگر میری قسمت میں بُرے کام کرنا ہی لکھے ہیں تو کوئی کام نہ کرونگا گو جیسا کہ تم کہتے ہو - کبھی میں چھوٹے سے چھوٹا رزیل کام کرنے کے لئے طیار ہوجاتا تھا - مگر اب ان سب سے مخلصی پانے کے لئے میں کچھ نہ کرونگا - مجھ میں گو نیکی کی محبت فنا ہوچکی ہی مگر ابھی تک بدی کی نفرت زائل نہیں ہوئی "

آنے والے کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی - اس کے نقوش مدہم پڑگئے - اور آہستہ آہستہ وہ غائب ہوگیا - مگر مارخیم نے اسے دیکھنے یا اسپر سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کیونکہ وہ کچھ سوچتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا - جہاں نعش کے قریب موم بتی جل رہی تھی - دوکان پر ایک ہیبت ناک سکوت طاری تھا - وہ رکا اور مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے - اتنے میں پھر گھنٹی بڑے زور سے بجی -

اس نے ہنستے ہوئے ماما کا خیر مقدم کیا اور بولا " بہتر ہوگا - کہ تم پولس کو بلالاؤ کیونکہ میں نے تمہارے مالک کو قتل کردیا ہی "

ملک محمد باقر

(اسٹیونس)

"غالب بے نقاب" کے حجابات

اور

جناب "آرگس" کے تنقیدی مغالطات

بست بہ خندہ مرامی کشد چہ بد بختم
کہ داد خوے اجل بخت من مسیحا را

لب یار کی جنبش میں مسیحائی، تبسم میں دلربائی، ادب لطیف کی یہ نازک خیالیاں سنا کرتا تھا لیکن درد دل رکھنے والے خندۂ یار میں جسکی مسیحائی کے وہ معترف بھی ہیں، اجل کا سامان پا رہے ہیں، نہیں معلوم یہ خندہ، خندۂ استہزا ہے، یا خندۂ طنز، جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں شاعر کے لئے ہلاکت اور بربادی کا سامان ضرور موجود ہے'۔

شیراز کا ایک نوجوان ملکہ جوانامرگ، دسویں صدی میں یہ تخیل عالم کے سامنے پیش کرتا ہے، دو سو برس گزرنے کے بعد، غالب نے عرفی کی اس نزاکت ذوق پر، توجہ کی ہو یا نہ ہو، لیکن، چودہویں صدی میں یہ شعر غالب کی طرف سے ایک فریاد کی صورت میں ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیوں اور کیسے؟ سطور ذیل اس کا جواب ہیں۔

جناب آرگس کی طبعی لطافت، آپ کی کثرت مطالعہ، آپ کا ذوق کاوش "نگار" کے ارباب مطالعہ سے مزید تعارف کا محتاج نہیں، ساتھ ہی یہ بھی اعتراف ہے کہ جناب ممدوح، کسی نہ کسی انقلاب انگیز تنقیدی نظریہ پر اپنی علمی کوششوں کی بھینٹ چڑھانے کی جدوجہد کیا کرتے ہیں، اس شورش میں ملک وطن کا کوئی طبقہ، مدح وتحسین کا ہدیہ پیش کرتا ہے اور کوئی سب وشتم کا، میں ان دونوں سے جدا گوشۂ عزلت میں بیٹھا جناب آرگس کی اس ہنگامہ رائی کا بعض اوقات سرور آفریں، لیکن اکثر "نظارۂ ملال آگیں" کرتا ہوں، آج بے اختیار غالب کا یہ شعر ورد زبان ہے، ؎

خون ہے دل خاک میں احوال بتان پر یعنی　　　　ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

افسوس جو فیاض عاشق، ناخن یار کی محتاجی حنا پر، گوشہ لحد میں خون بہانے کی تمنا رکھتا ہو، اب زمانہ کی شورش، یا ارباب علم کی مخالفانہ تنقید پر جسے "ناخن حنا شدہ" سے زیادہ تعبیر نہیں کر سکتے، قبر کے اندر خون بہائے یا نہ بہائے، لیکن اس کے جذبۂ دل کی سحر آفرینی قلوب پر اثر کر چکی، اور ارباب نظر وفکر جانتے ہیں کہ مرزا کی ہستی، اس الزام سے کس قدر پاک تھی'

جناب آرگس کا مضمون "غالب بے نقاب" جو فروری ۲۹ء کے نگار میں شایع ہوا ہے، اور جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے کہ غالب نے متقدمین کے کلام سے اکثر سرقہ کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ ارباب علم وادب کی نگاہ سے گزر چکا ہے اور اور بعض حضرات نے اس پر تنقید بھی کی ہے، لیکن جس طرح جناب آرگس کا مضمون عصبیت سے خالی نہ تھا اسی طرح اس کا جواب بھی معقول نہیں لکھا گیا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں جناب آرگس کے خیالات پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے۔ لیکن چونکہ تنقیدی مضامین، اکثر ناخوشگوارانہ تعلق کا باعث ہوجایا کرتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے جناب آرگس سے اپنی ناموزونیت طبع کے چند نشتر زنی کی معافی چاہونگا، میں ایک طالب علم ہوں، اور مجھے اپنی علمی زندگی کے مرحلۂ اولین ہی میں تنقیدی خیالات کی ترجمانی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ جان اسٹوارٹ بلیکی، جو اڈنبرا یونیورسٹی میں یونانی زبان کا پروفیسر تھا، اپنی عالمانہ تصنیف "تربیت نفسی" (سلف کلچر) میں لکھتا ہے "سب سے بڑی چیز جو ایک نوجوان کے لئے "زینۂ تربیت میں ہوسکتی ہے" وہ اس کا ذوق تنقید ہے یہ مسئلہ ایک تجربہ کار ضعیف العمر شخص کے لئے موزوں ہے، لیکن ایک وابستۂ امید نوجوان سے اس کا وقوع بالکل بے محل ہے" تاہم میں یہ ناروا جسارت کرتا ہوں۔ اور "چشم عفو میدارم"

جناب آرگس ایک جگہ فرماتے ہیں "مگر تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب دیکھنے والا دیکھتا ہے، کہ اس دریا کے اکثر چشمے، مستعار، اور اس بحر ناپید اکنار کے بہت سے موتی حاصل دریوزہ گری ہیں" دوسری جگہ فرماتے ہیں "میری تمہید مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ میں غالب کے شعروں کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں میرا مقصود یہ نہیں ہے" تیسری جگہ لکھتے ہیں "یہ دیکھکر کہ غالب کے یہاں بہت سے مضامین دوسروں کے یہاں سے لئے گئے ہیں ایک مبصر کی نظر سب سے پہلے سرقہ اور توارد کی بحث پر جاتی ہے؟"

میں نہیں کہہ سکتا کہ سطور بالا میں کس حد تک مغالطۂ منطقی سے کام لیا گیا ہے جو چیز "حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار ہو" اور دریوزہ گر، اور مستعیر نے اسے اپنی جائز حاصل کردہ ملکیت بتائی ہو، تو اسے صریح سرقہ نہیں کہینگے تو اور کیا کہیں گے؟ اب فاضل مضمون نگار کی یہ نکتہ سنجی کہ "میں حد سرقہ میں لانا نہیں چاہتا" بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، بس میں یونان کے مشہور خطیب سو فقاس کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ "اگر کلام غالب حاصل دریوزہ گری، او "مستعار" ہے تو شاعر پر الزام سرقہ صحیح، اور اگر سرقہ نہیں ہے (جیسا کہ فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں) تو اس کے لئے حاصل دریوزہ گری" او "مستعار" کے ناموزوں مصطلحات بھی فضول ہیں۔ ارباب فکر "حاصل دریوزہ گری" مستعار اور سرقہ کے ترادف سے انکار نہیں کر سکتے، جناب آرگس نے توارد اور سرقہ کی نامکمل بحث پیدا کرکے، غالب پر مخفی طور سے الزام سرقہ لگانے میں جس ناکام کوشش سے کام لیا ہے اس کا علم با دنی تامل ہر شخص کو ہوسکتا ہے، کیونکہ خود انہیں کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں توارد زیادہ ہے اور یہ کوئی عیب نہیں ہے، سامنے نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی الحسنی، کے "مجمع الصنائع" کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو بلاغت شاعری کے متعلق فارسی زبان میں گیارہویں صدی کی مستند تصنیف ہے، اس نے توارد، اور سرقہ کے متعلق مکمل اور تشفی بخش بحث کی ہے، توارد کے متعلق لکھتے ہیں، "حکم بہ اخذ سرقہ نہ باید نمود، تا معلوم نہ بود کہ شاعر دوم از شاعر اول بردہ، وور ہنگام انشا، شعر اور ا بہ خاطر داشتہ، والا می

توارد آنکہ از قبیل توارد خاطرہا باشد، یعنی بہ ذہن شاعر اول خطور کند، بہ حسب اتفاق بہ ذہن این ہم خطور کردہ باشد" اس کے بعد مصنف نے توارد کی مختلف مثالیں پیش کی ہیں، جن کے متعلق بعد میں تفصیل سے بحث کرونگا،

بحث سرقہ | سب سے پہلے مجھے بتانا ہے کہ سرقہ کی کتنی قسمیں ہیں، اور یہ کہ جب کلام غالب کو توارد کے احاطہ میں نہیں لایا جاتا، تو حاصل دریوزہ گری کہنا، الزام سرقہ لگانے کے بالکل برابر ہے

سرقۂ شعری یہ ہے کہ کوئی شاعر دوسرے شاعر کے شعر یا مضمون کو اپنی طرف منسوب کرے، اگر دو شاعروں کا کلام عام معنی میں متوارد ہو۔ مثلاً خد کی تشبیہ گل سے، اور قد کی تشبیہ سرو سے، تو یہ سرقہ نہیں، مصطلحات شاعری میں سرقہ جسے کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، سرقۂ ظاہر، اور سرقۂ غیر ظاہر، اور ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں،

سرقہ ظاہری کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی کا شعر اس طرح اپنی طرف منسوب کر لیا جائے، کہ نہ تو اس میں لفظی و معنوی تغیر ہو، نہ ترتیبی، سرقہ کے اس طریق کو نسخ اور انتحال سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع لکھتے ہیں " در سنہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری، .... کمترین با پدر بزرگوار در رکاب بادشاہزادہ عالی مقدار مراد بخش جہان و جہانیان بودیم، شبے در بلخ بہ مجلس مذکور شعری شد، مولانا عبداللہ نام جوانے، این دو بیت حسن رفیع را بے ہیچ تغیرے بنام خود خواند ؎

سبزہ از مژگان من سر مشق شادابی گرفت ۔۔۔ نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود ۔۔۔ گرد او گردم کہ باج از مردم آبی گرفت

سرقۂ ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کا شعر تمام و کمال لے لیا جائے، یا اس کے بعض الفاظ لئے جائیں اور بعض الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ لے آئے جائیں :-

میر معزی کہتے ہیں ؎

مردم بہ شہر خویش ندارد بسے خطر ۔۔۔ گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا

حکیم انوری کہتے ہیں ؎

بہ شہر خویش درون بے خطر بود مردم ۔۔۔ بکان خویش درون بے بہا بود گوہر

سرقۂ ظاہری کی تیسری قسم یہ ہے کہ شعر کا مفہوم لے لیا جائے، اور الفاظ بالکل بدل دئے جائیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

من نگویم کہ ابر مانندی ۔۔۔ کہ نہ نیک آید از خردمندی
او ہمی بخشد و ہمی گرید ۔۔۔ تو ہمی بخشی و ہمی خندی

مولانا محمود خوارزمی کہتے ہیں ؎

گفتن کہ دست تست بہ وقت سخا سحاب ۔۔۔ حیست در نہایت ایجاز و اختصار

او گرید و بہ ضعف دہد چند قطرۂ ۔۔۔ تو خندی و بہ لطف کنی بذل بیشمار

سرقۂ ظاہر کے اسی اخیر طریق کو "اغارہ" اور مسخ" سے تعبیر کرتے ہیں،

سرقہ غیر ظاہر کی پہلی قسم یہ ہو کہ مضمون شعر مشابہ ہو، چنانچہ عربی میں حریر کہتا ہے ؎

فلا یمنعك ارباب بحاجھم — سوای ذوالعمائم والخمار

ابی طیب کہتے ہیں ؎

ومن فی کفہ منھم قناۃ — لمن فی کفہ منھم خطابٌ

اسیطرح فارسی میں رودکی کا یہ شعر ہے ؎

ہر کہ با محنت گزشت از روزگار — ہیچ ناموزد ز ہیچ آموزگار

ابوشکور کہتا ہے ؎

گر بپیش، بپیش آیدت روزگار — کہ بہ زد نیابی تو آموزگار

سرقۂ غیر ظاہر کی دوسری قسم یہ ہو کہ کسی کے شعر کا مضمون لیکر اسے دوسرے معنی اور لباس میں پیش کیا جائے مختاری کہتا ہے

کجا خدا آن زقبائے دریدہ دوختہ چستر — کنو بباید چہ ترش دریدہ دوخت قبا

رضی نیشاپوری نے اسی کو مدحیہ لباس میں یوں پیش کیا ؎

بہ عزم خدمت درگاہ تو بہ ہر طرفے — بسا ملوک کہ از تاج می زنند کمر

سرقہ غیر ظاہر کی تیسری قسم یہ ہو، کہ شاعر کسی شعر کے معنی کو الٹ دے، اور اس کے خلاف ظاہر کرے، چنانچہ امیر معزی کہتے ہیں ؎

آن زلف مشکبار بران روئے چون بہار — گر کوتہ است کوتہی از وے عجب مدار
شب در بہار میل کند سوئے کوتہی — آن زلف چون شب آمد و آن روئے چون بہار

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

اوست نور وزمن و چوں تنش جعد بہ پائے — راست باروز برابر شدن شب نگرید

ارباب بلاغت کے نزدیک سرقہ غیر ظاہر کی اکثر قسمیں مقبول ہیں، اور سرقہ کے جمیع اقسام میں اگر دوسرا شعر، عذوبت، اور حسن ترکیب میں پہلے شعر سے بڑھا ہو تو متقدمین کے تخئیل اور حسن بیان پر یہ معنی آفرینی علم بلاغت کے نزدیک بجائے خود مقبول و احسن ہو، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع فرماتے ہیں "ودرجمیع اقسام سرقہ اگر شعر دوم بہتر باشد از اول در سلاست، عذوبت و حسن ترکیب آن مقبول و احسن می شمارند" چنانچہ اس کی مثال میں مصنف حکیم ارزقی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

صدف زبیم یلاں در شود بہ کام نہنگ — ز خون برنگ یواقیت کردہ لال

لیکن حکیم انوری نے اسی کو ایک غریب اور دلکش اسلوب سے یوں کہا ؎

قہر تو گر طلایہ بدریا بہ در شود — در دانہ صیم حلق صدف دانۂ انار

اور اگر لطافت و پاکیزگی میں دوسرا شعر پہلے شعر کے برابر بھی ہو، جب بھی مذموم نہیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

بہ قد گفتی سرویست در میانہ قبا — بروئے گفتی ماہست بر نہادہ کلاہ

چوں ماہ بود، چوں سرو لیکہ ماہ بود سرو — نگرنہ بند و سرو، دکلہ ندارد ماہ

اسی کے مقابلہ میں رشید وطواط کا یہ قطعہ پیش کیا جاتا ہے ؎

بہ ماہ و سرو از انت نمی کنم تشبیہ — کہ ایں سخن بہر عاقلان خطا باشد

توئی چو ماہ اگر ماہ را کلہ بودے — توئی چو سرو، اگر سرو در قبا باشد

اور اگر کسی کا شعر متقدمین میں سے کسی کے شعر سے نفاست کلام، حسن ادا، اور علو تخیل میں گھٹا ہوا ہو تو یہ بلاغت میں معیوب ہے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ آیا غالب کے اشعار متقدمین کے اشعار سے کم درجہ میں ہیں یا برابر اور بڑھے ہوئے ہیں جناب آرگس نے جتنے اشعار مثال میں پیش کئے ہیں ان میں کوئی شعر متقدمین کے اشعار سے گرا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اگر برابر ہے تو یہ بلاغت میں معیوب نہیں، اور اگر بڑھا ہوا ہے، تو کوئی اعتراض نہیں۔

ایک اور امر قابل گزارش ہے، وہ یہ کہ میری جانکاہی اور کد و کاوش کے بعد بھی، کہیں جناب آرگس ایک مختصر جملہ میں عذر نہ کریں کہ میں نے دعوی ہی نہیں کیا کہ غالب کے اشعار میں سرقہ ہے، میں نے جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوردی مرحوم کے اس نظریہ کی تردید کی تھی کہ "مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے، اور کہیں سے مستعار نہیں" مگر جناب آرگس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا، چونکہ انکو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے بیان پر رد و قدح کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ کلام غالب کو احاطہ توارد سے الگ کرنا اور حاصل "دریوزہ گری" کا الزام لگانا اسلئے جناب آرگس کو کسی طرح گریز کا موقع ہی نہیں، پس اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کلام غالب میں سرقہ ہے، تو کیا انوری، خسرو، رضی، ابوشکور تمامی اکابر شعرائے ایران و ہند کے کلام میں سرقہ ہے؟ آپ کہیں گے ان کے کلام میں سرقہ نہیں توارد ہے۔ میں کہتا ہوں، آپ غالب کے اشعار کو بھی توارد کے احاطہ میں کیوں نہیں لاتے مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں "مستعار" اور "حاصل دریوزہ گری" کا جو الزام آپ نے لگایا ہے، وہ بے معنی ہو جائیگا۔

توارد آپنے توارد کے سلسلۂ بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملیگا، جو دو شاعروں کے یہاں متوارد ہو۔ اور معروف و مشہور نہ ہو"؟ میں کہتا ہوں توارد کے لئے یہ تخصیص کیسی؟ توارد کی مثال میں پچاسوں اشعار ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو مضامین و الفاظ کے اعتبار سے دو شاعروں (بلکہ متعدد شعرا) کے یہاں متوارد ہیں اور پھر بھی معروف نہیں، جناب آرگس کا اول یہ دعوی ہی بے بنیاد ہے چونکہ نہ تو کوئی ایسی جامع کتاب موجود ہے، جس میں تمام شعرا متوارد کلام جمع کر دئے گئے ہوں، اور نہ معروف کہے جانے کے لئے کوئی کلیہ ہے اسلئے اگر "معروف" سے یہی مطلب ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ جانتے ہوں، تو میں سوال کرتا ہوں، امثلۂ بالا میں، انوری، خسرو، رضی وغیرہ کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ فیصدی کتنے عام خواندہ اصحاب کو یاد یا معلوم ہیں، اگر معلوم نہیں ہیں تو انہیں آپ توارد کہینگے یا سرقہ؟ پس یہ بات ثابت

ہوگئی کہ توارد کے لئے معروف و مشہور ہونا لازمی نہیں،

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کا جتنا کلام آپ نے متقدمین کے کلام سے ملتا ہوا قرار دیا ہے، وہ توارد، اور صرف توارد کا نتیجہ ہے۔ کمال الدین اسمٰعیل فرماتے ہیں ؎

مگر توارد خاطر کہ در مجازی آن نہ ممکن است کہ کس معترض شود برو ے

دو راہ رو کہ براہے روند در یک سمت عجب نہ باشد اگر او فتند پے در پے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں، اور ان کے خیال میں ایسا توارد ہوتا ہے، کہ جو مضمون پیدا ہوتا ہے، وہ معنی اور الفاظ دونوں اعتبار سے باہم ملجاتا ہے، چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ خلاصۃ الاخبار میں موجود ہے۔ ایک بار میر نظام الدین نے مرزا سلطان احمد سمرقندی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اور اصلاح کے لئے میر نظام الدین علی شیر کے پاس لائے، موصوف نے کسی قدر غور و فکر کے بعد کہا، کہ جو بیت ممدوح کے نام پر مشتمل ہے اس کے بعد دوسرا بیت چاہیئے تاکہ کلام میں ربط پیدا ہوجائے، میر نظام الدین نے التماس کی کہ آپ ہی کہدیجئے، علی شیر نے جواب دیا تم بھی فکر کرو، میں بھی غور کرتا ہوں دونوں کاغذ، قلم، دوات لیکر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں دونوں نے ایک ایک بیت کہا، اور لکھکر ایک دوسرے کو دیا، دیکھتے ہیں تو دونوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ تھا وہ بیت یہ ہے، ؎

بہار باغ جوانی، نہال گلشن عدل گل ریاض کرم، سرو جو ئبار وفا

صاحب مجمع الصنائع، میر محمد باقر نامی ایک شخص کا بیان نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے، میرے چچا نے ایک غزل کہی تھی، دس سال کے بعد میں نے شیخ فیضی کے دیوان میں اس غزل کا مطلع بعینہ لکھا دیکھا، وہ مطلع یہ ہے ؎

عالم ز آب دیدۂ ما نم گرفتہ است طوفان اشک ماست کہ عالم گرفتہ است

توارد و سرقہ کی نسبت

توارد، اور سرقہ میں امتیاز، خود شاعر کی زندگی کے واقعات سے ہوسکتا ہے، جب ایک عامی شخص ایک شعر کہتا ہے، اگر نفاست اور حسن ادا کے لحاظ سے یہ کسی متقدم شاعر سے مل جاتا ہے، تو اسپر سرقہ کا الزام لگا سکتے ہیں، لیکن ایسا ہی شعر جب حکیم انوری، حکیم ازرقی کے مقابلہ میں، اور خسرو، امیر معزی کے مقابلہ میں کہتے ہیں، تو ارباب بلاغت اسے سرقہ کی بجائے توارد سے تعبیر کرتے ہیں، پس معلوم ہوا سرقہ اور توارد دونوں اعتباری مصطلحات ہیں جنھیں سخن آفرینوں کے واقعات زندگی، ان کے مایۂ علم، اور رتبہ شاعری کے لحاظ سے چسپاں کیا جاسکتا ہے

اب یہاں غالب کی زندگی پر ایک مختصر تبصرہ کی ضرورت ہے، تیرہویں صدی میں ذوق، غالب، مومن ہندوستان کے شعرائے باکمال ہونے کے ساتھ ہی، فضلائے عصر بھی تھے، چنانچہ جب انگریزی حکومت کو کالج کے لئے ایک فارسی دان علامہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ارباب انتخاب کی نظریں غالب اور مومن ہی پر پڑتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، عوام میں غالب کی علمی استعداد متعارف اور مسلمہ تھی۔

غالب بے نقاب کے حجابات

وحدت پسند دل لیکر آیا تھا، کہ ۱۲۴۵ھ میں جب ایک شخص متخلص بہ اسد کا حال سنا، تو فوراً

اسی طرح غالب ایسا غیور، اور دخت یار کیا، سرقہ تو کجا، غالب کو توارد پر بھی طیش آجاتا تھا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ۵

متاع من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است　　　یقین شناس کہ دزد

اسد تخلص ترک کر دیا، اور "غالب" اور

یں رشید نے اس دعویٰ سخن آفرینی پر، نشتر طنز سے کام لیا ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ مرزا کو اپنی طباعی کا احساس تھا۔ وہ متقدمین یا معاصرین سے توارد کے خیال پر بھی مچل جاتے تھے۔ اگر کلام غالب "حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار" ہوتا، تو مرزا کے دماغ سے اس شورش وجدت پسندی کا اظہار نہ ہو سکتا۔ غالب کے تخیل کا علو، بیان کی لطافت، طرز انشا کی بلاغت، اسلوب استدلال کی نفاست، اگر شعرائے متقدمین کے ہاں سے مستعار، اور حاصل دریوزہ گری ہوتی تو ایک لطیف ضمیر سے یہ ناممکن تھا کہ خود توارد وں سے سیراب ہوتا اور انہیں کو "نہاں خانہ ازل" کا چور کہتا یہ زبردست ادعا صاف بتا رہا ہے کہ شاعر کو اپنی ذات، اور دماغ پر کس کمال درجہ کا اعتماد تھا، اس خود اعتمادی سے جو کچھ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ غالب کے خیالات ـــــ حاصل دریوزہ گری نہیں، اگر وہ مضامین دوسروں سے مستعار لیتے، تو، تو ارد متقدمین پر وہ فخر کرتے، اپنا یہ کمال دکھاتے کہ میرا تخیل متقدمین سے مل جاتا ہے، جذبۂ احترام کا اظہار کرتے، "نہاں خانہ ازل" کا چور بتانا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اُس نے مضامین کی بھیک نہیں لی، ایسی حالت میں، کہ وہ دوسروں سے مضامین مستعار لیتے، ان کے اندر اتنی جرأت کہاں کہ اس بے باکی سے متوارد کلام کو اپنا متاع ازلی سمجھتے اور پھر دوسرے شعرا کو "دزد" سے تعبیر کرتے، اس قسم کا تخیل پیش کرنا تو کجا ایسا ایک ہلکا سا خیال بھی انہیں "ایم سی داؤگل"[۵] کے نظریہ نفسیاتی کے مطابق، روح فرسا کیفیات میں مبتلا رکھتا، نفسیاتی تحقیق بھی بتاتی ہے کہ غالب سارق مضامین نہ تھے۔ نہ انھوں نے متقدمین سے بھیک لیکر دعویٔ سخن آفرینی کیا، لیکن اوروں کے یہاں اسی قسم کا تخیل موجود ہونا مرزا کے قابو کی بات نہ تھی،

---

۵ انگلستان کا مشہور نفسی ایم سی داؤگل اپنی مقبول زبان کتاب .... "نفسیات اجتماع" (سوشل سائکالوجی) میں لکھتا ہے "افسوس (Remorse) تعبیر ہے، ایک مرکب جذبی کیفیت سے، جو ایک ترقی یافتہ جذبہ، متعلقہ ذات، خصوصاً جذبہ اخلاقی کا مظہر ہے، کسی فرد میں اس جذبہ کی اس وقت تکوین ہوتی ہے، جب اسے کسی ایسے فعل ماضی کی یاد آتی ہے، جسکے ارتکاب پر وہ گہرے طور سے افسوس کرتا ہے، تاہم جذبات افسوس کی طرح یہ بھی المناک ہے، چونکہ اس کا تہیج یا جذبۂ خواہش کا تعلق مستقبل کی بجائے ماضی سے ہوتا ہے۔ یہ جذبہ افسوس کی دوسری صورتوں سے مختلف ہے، چونکہ جو واقعہ اس جذبہ افسوس کا محرک ہے، اس کے حدوث کا موجب فرد مشکیف کا خود اپنا عمل ہوتا ہے، (اسی معنی میں کسی نے کہا ہے، خود کردہ را علاجے نیست) اس لئے ناخوشگواری طبیعت کے باعث جس جذبہ غضب کی تکوین ہوتی ہے اس کا تعلق افراد کی ذات ہی سے ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں اظہار لعنت و ملامت سے قلب کو سکون نہیں ملا کرتا، (چونکہ یہ رشحہ تلویم و تلعین، بھی افراد مشکیف کی ذات ہی سے وابستہ ہوتا ہے) بلکہ سکون کی بجائے الم انگیزی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

کلام عرفی، اور حافظ وخسرو میں توارد

ایک کھٹکا یہ بھی گزرتا ہے کہ متوارد کلام کی کسی قدر تفصیلی روئداد آپنے ہدیہ ناظرین کی ہو خیال ہوسکتا ہے، تو ارد ہوگا بھی تو چند اشعار میں، یا اس قدر متعدد اشعار میں، میں کہتا ہوں کہ جن میں شعرا کے کلام کو غالب کے تخئیل کا ماخذ بتایا گیا ہے میں انہیں کے کلام سے اسی قدر اشعار پیش کر سکتا ہوں جوان کے معاصرین اور متقدمین سے ملتے جلتے ہیں، عرفی کی معنی آفرینی اور گرمی سخن کا کسے اعتراف نہیں، لیکن جب ان کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کے بہت سے اشعار حافظ اور خسرو کے کلام سے مل جاتے ہیں، ذیل میں اس کی فہرست دی جاتی ہے،

عرفی اگر بسر روی در رہ منزل میں ۔۔۔ رو کہ مدد می کند ہمت شاہ نجف

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان عشق ۔۔۔ بدرقۂ رہت شود ہمت شاہ نجف

مضمون بالکل ایک، الفاظ کی ترکیب بھی ملتی جلتی، حافظ کے ہاں بدرقہ رہت کا استعارہ البتہ زیادہ ہے۔

نظر بحال دل آن پر غرور نکشاید ۔۔۔ کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغما را (عرفی)

غرور حسن اجازت مگر ندادا ے گل ۔۔۔ کہ پرسشے نکنی عندلیب شیدا را (حافظ)

دونوں کلام کی یکرنگی سے انکار نہیں ہوسکتا، حافظ کے یہاں عندلیب شیدا کی دلجوئی نہ کرنیکا استفہام ہے، عرفی نے علت و معلول دونوں بتا دئے، کہ بے التفاتی سیری پر مبنی ہے، البتہ "متاع یغما" کی چستی بڑھی ہوئی ہے، جو حافظ کے یہاں نہیں،

از تیرہ کاری تو بہ خون می طپید دل ۔۔۔ ز نگند غمزۂ تو بہ بار گراں ہنوز (عرفی)

عالم تمام پر ز شہیدان غنتہ گشت ۔۔۔ ترک مرا خدنگ بلا درکماں ہنوز (خسرو)

معنی کے اعتبار سے دونوں شعر یکساں ہیں، صرف دو تین الفاظ کا الٹ پھیر ہے خسرو کے ہاں "خدنگ بلا درکماں" ہے، عرفی نے اسے "غمزہ بہ بارگراں" میں پیش کیا ہے، مفہوم دونوں کا یکساں ہے۔

آبم آتش گشت و خاکم شد بہ خاکستر بدل ۔۔۔ اندریں رہ کس نمی داند سر انجام ہنوز (عرفی)

روز اول رفت دینم در سر زلفین تو ۔۔۔ تا چہ خواہد شد دریں سودا سر انجام ہنوز (حافظ)

دونوں شعر کا دوسرا مصرعہ ہم معنی، الفاظ بھی ملتے جلتے، پہلا مصرعہ حالات کی ابتری کے اعتبار سے قریب قریب مماثل، البتہ عرفی کے ہاں پانی کا آگ ہونا اور مٹی کا گرد و غبار سے بدل جانا، کچھ زیادہ تاثر انگیز ہے۔

تو و بزم عیش عرفی من و کوچہ کہ ہر سو ۔۔۔ سر خونچکاں فتادہ دل ہیو نشستہ (عرفی)

در جہاں حد کوئے خود افتادہ مینی بندہ را ۔۔۔ تن بیکطرف جاں بیکطرف سر بیکطرف پا بیکطرف (خسرو)

عرفی نے صرف اپنی کوچہ گردی اور کوئے معشوق کے خونی نظارہ کی تصویر کھینچی ہے، خسرو خود کوچۂ یار کا خونی منظر بن گئے ہیں خسرو نے اس خونی منظر کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہے، عرفی نے عمومیت پیدا کر دی ہے۔ کوئے معشوق کا خونی نظارہ دونوں نے

عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے، البتہ عرفی کا حسن ادا اور لطافت تخیل قابل داد ہے، خسرو اظہار جذبات میں سبقت لے گئے ہیں، حزیں صفہانی نے کوئے یار کو منظر خونی، تو نہ بتایا، البتہ اسمیں خانماں بربادوں کا ہجوم دکھا دیا، یہ خانماں بربادی صرف انسانوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ طیور پر بھی اس کا اثر پڑا ؎

بہار عارضش گوشہ رابے خانماں دارد ۔۔۔ زدند آتش زرویت عندلیباں آشیانہا را

داغ داغم کرد یاس و طالب کامم ہنوز ۔۔۔ دوزخی در پیرہن مودارم و خامم ہنوز (عرفی)

ساقیا یک جرعہ زاں آب آتشگوں کہ من ۔۔۔ درمیان پختگانِ عشق او خامم ہنوز (حافظ)

"طالب کام" ہونا اور پختگان عشق کے درمیان میں خامی کا احساس اور اس لئے آب آتشگوں کی طلبی، جذبۂ عشق کی ایک ہی شورش کا نتیجہ ہیں۔ عرفی کو بھی خامی کا احساس ہے اور حافظ کو بھی، ان کے یہاں بھی شوق طلب ہے، اور ان کے یہاں بھی، قریب قریب یکساں ہیں اور معنی ہیں، دونوں برابر،

ڈاکٹر نکلسن کی رائے

جناب آرٹس مزید توارد کی مثالیں چاہیں گے تو میں اور بھی عرفی کے کلام سے پیش کر سکتا ہوں عرفی پر کیا منحصر ہے جس شاعر کو جی چاہے لے لیجئے اس کے بہت سے اشعار متقدمین سے ملتے جلتے نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ارباب تمیز کا خیال ہے، خسرو، اور جامی نے نظامی کی شاعری کا گھر برباد کیا، اسی طرح انگلستان کا مشہور مستشرق، ڈاکٹر نکلسن جسکے ذوق فارسی، اور عربی کا طوفان مغرب سے گزر کر مشرق تک امنڈ آیا، اپنی مشہور تالیف "منتخبات دیوان شمس تبریز" کے عالمانہ مقدمہ میں لکھتا ہے، کہ مولانا روم کی شاعری مختلف شعرائے متقدمین اور معاصرین سے متاثر ہوئی، ان میں فریدالدین عطار، حکیم سنائی، سعدی، نظامی اور عمر خیام کی تفصیل ہے، ڈاکٹر موصوف اس تاثر کی بنا تاریخی واقعات پر رکھتے ہیں، چنانچہ فریدالدین عطار کے متعلق لکھتے ہیں کہ مولانا روم بلخ سے چلتے وقت نیشاپور سے گزرے، تو فریدالدین عطار نے انہیں اسرار نامہ دیا، حکیم سنائی کے متعلق ایک غزل میں خود مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت کسے خواجہ سنائی بمرد ۔۔۔ مرگ چنین خواجہ نہ کاریست خرد

اس مصرعہ کی غزل ہے جو سنائی کے ساتھ خاص جذبۂ احترام محبت کا پتہ بتاتی ہے، ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب بہ حوالۂ مثنوی مترجمہ رڈ ہاؤس، افلاکی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ مولانا فرماتے تھے کلمۃ اللہ (قرآن مجید) بمنزلہ شیر ہے اور الٰہی نامہ (حدیقہ حکیم سنائی) اس کا جوہر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے مولانا حکیم سنائی کے اشعار سے واقف تھے، سعدی سے مولانا کی ملاقات کے متعلق رڈ ہاؤس کا قول ترجمۂ مثنوی میں، اور رضا قلی خاں کا قول دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران کے مقدمہ میں موجود ہے مولانا اپنی غزل میں حضرت نظامی گنجوی کے متعلق کہتے ہیں۔

نظیر آن کہ نظامی بہ نظم می گوید ۔۔۔ جفا مکن کہ مرا طاقت جفائے تو نیست

اسی طرح مولانا کا یہ مصرعہ "چون فاختہ او یراں فریاد کناں کو، کو"

عمر خیام کی رباعی کی ایک بیت

دیدیم کہ برکنگرہ اش فاختۂ   آوازہمی داد کہ کوکو کو

سے ملجاتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں مولانا کی شاعری پر سعدی، نظامی اور خیام کا گہرا اثر نہ پڑا، البتہ سنائی اور عطار کے اثرات تمام وکمال آپ کی شاعری میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لئے دیوان شمس تبریز مطبوعۂ کیمرج، کا انگریزی مقدمہ دیکھئے جو ڈاکٹر نکلسن کے ذوق استقرار کا نتیجہ ہے۔

الغرض دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی استفادۂ متقدمین سے گریز نہیں کر سکتا ہاں مستعار اور مستفاد میں فرق ہے، مستعار کی اصطلاح سرقہ کی بحث لاتی ہے، اور استفادہ قانون فطرت ہے مستعار کہنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے عمداً کسی کا مضمون الفاظ کے تغیر یا معنی کے الٹ پھیر کے ساتھ اپنا بنا لیا، مستفاد کہنے سے پتہ چلیگا کہ متقدمین کے تاثرات شاعر میں قدرتی طور پر ہیں تو ضرور، لیکن اس نے ان تاثرات کو اپنا ذاتی تاثر سمجھا، ان کے اظہار کے وقت اس کے ذہن میں یہ کھٹکا بھی نہ تھا کہ خارجی اثرات کو اس کے اظہار فکر و احساس میں کچھ بھی دخل ہے، اس کے افکار میں خارجی اثرات کی یہ آمیزش اس کے شعور و ادراک سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کی وضاحت اور تفصیل فلسفہ کی کتابوں میں کی جاتی ہے اور اس معنی میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا یہ نظریہ کہ غالب کا کلام اسی کا کلام ہے مستعار نہیں صحیح ہے۔

اب یہاں علم وعقل کی روشنی میں یہ پر لطف بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا کوئی شاعر ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے جسکا کلام سراپا اسی کا کلام ہو، متقدمین یا معاصرین سے متاثر اور مستفاد نہ ہو، ذیل میں اسی نظریہ پر بحث ہوگی۔

فلسفہ ڈاکٹر ابرکرامبی

یورپ کا مشہور طبیب اور فلسفی ڈاکٹر ابرکرامبی اپنی کتاب "قوائے عقلیہ" میں لکھتا ہے، قوت مصورہ کو عمل میں لانے کے لئے ہم لوگ حقیقی مناظر، حوادث، اور عادات کے جزوی عناصر کو لیتے ہیں، اور ان کو خود دماغ کے ایک نظام کے ذریعہ سے نئے طریقہ سے ترکیب دیتے ہیں، اس ترکیب سے ایسے مرکبات تیار ہو جاتے ہیں، جن کا وجود فطرت میں نہیں ہوتا، ایک نقاش اس طریقہ سے ایک مقام کی تصویر تیار کرتا ہے اس میں وہ ان تمام خوبیوں، اور دلفریبیوں کو جمع کر دیتا ہے، جو بہت سے حقیقی مقامات میں پائی جاتی ہیں، اور ان کے نقائص سے قطع نظر کر لیتا ہے، ایک شاعر، یا ایک افسانہ نویس اسی طریقہ سے ایک فرضی شخص کی عادت کا ایک مرقع تیار کرتا ہے اور اس میں وہ تمام صفات خصوصی داخل کر دیتا ہے جو اسے اپنے مقصد کے مطابق اس فرضی شخص کی عادت کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ان مرکبات کی حیثیت محض فرضی اور خود رایانہ ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ انفرادی عناصر ایسے ہوں گے، جو حقیقتاً فطرت میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہ ایسا مرکب بالکل اس سے متغایر، اور مختلف نہ ہوگا جو واقعتاً فطرت میں پایا جاتا ہے، جب یہ اصول کسی تصویر یا فسانہ میں ملحوظ نہیں رہتا تو ہم لوگ ایسی چیز کو غیر فطری در خرافات کہینگے

ڈاکٹر صاحب کے مفصلۂ بالا نظریہ سے ہم لوگ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ جب کوئی شے خواہ مادی ہو یا نفسی، غیر مرئی اور تخئیلی حیثیت رکھتی ہو، یا حسی اور بدیہی تو غیر معقولیت اور خرافات کے نقائص سے پاک ہوگی اور اس کے عناصر پہلے سے فطرت میں ضرور موجود ہوں گے؟ پس معلوم ہوا کہ انسانی تصورات اور تخئیلات کی رسائی فطرت سے بالاتر نہیں ہوسکتی پس انسان جو چیز پیش کریگا، تو ضروری ہے کہ اس چیز میں اس کے سابقہ معلومات، تجارب اور مشاہدات کو دخل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ انفرادی معلومات، تجربہ اور مشاہدہ کا کامل نہیں تو بڑا حصہ، اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات، سے بالواسطہ حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی انسان ایسا تخئیل نہیں پیش کر سکتا، جو سراپا اسی کے جودت ذہن اور رسائی فکر کا نتیجہ ہو، لیکن جسطرح سقراط کا عقلی علو، ارسطو کی منطق، بقراط کے طبی اکتشافات، ابن رشد کا فلسفہ، بطلیموس کی ہیئت ذاتی ابن ہیثم کا علم مناظر دنیا میں انفرادی اجتہادات کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، اور احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح غالب بھی اپنے رنگ سخن کے لحاظ سے عزت و احترام کا مستحق ہے، حالانکہ نہ سقراطیات و بقراطیات نئی چیز تھیں اور نہ غالبیات۔

کثرت مشاغل اور تنگی وقت کا گلہ کیا جائے، یا قلت معلومات اور ناموزونی طبیعت کا اعتراف، کہ اس وقت اس مسئلہ پر مبسوط بحث نہیں ہوسکتی ورنہ یہی ایک بحث فکر و احساس کی جولانی کے لئے کافی ہے، اور جس سے یہ ثابت ہوجائیگا کہ بہت سی باتیں متقدمین سے حاصل کرنے کے باوجود قابل ستائش ہوا کرتی ہیں، انسانی تخئیل اور افکار کا زیادہ حصہ تقلید اور تتبع پر منحصر ہے ہاں یہ تقلید اگر اچھوتی تقلید ہے اور یہ تتبع سراپا تتبع ہے تو معیوب ہے، اور اگر اس میں انفرادی کاوش ذہن اور فکری جولانیوں کا اضافہ ہے، تو مستحسن ہے، خدا کے فضل سے میرا تعلق غیر مقلد (اہلحدیث) فرقہ سے ہے، اور میں اسی معنی میں تقلید کا انکار کرتا ہوں ورنہ نظری تقلید کا کسے انکار ہے؟

اس وقت میں مختصراً اساطیر الاقدمین (میتھالوجی) اور ہیئت سے نظائر پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی طبائع کا رجحان کس طرح باوجود اختلافات زبان، ملکی حالات، قطع رسل و رسائل اور بلا مرابطہ و اختلاط، ذہنی اور فکری حیثیات سے مماثل پایا جاتا ہے، ہیئت سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ افراد محض ایک دو مسائل کی تحقیق کا اضافہ کرنے پر، فخر ملک و قوم شمار کئے جاتے ہیں" اور ہیئت اجتماعی کی نظر میں معزز اور محترم ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہوجائیگی کہ ہوسکتا ہے یا نہیں غالب کا کلام "مستعار اور حاصل دریوزہ گری" صرف غالب ہی کے تخئیل کا نتیجہ ہو، ہاں اس تخئیل کے عناصر، قومی اور اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات سے بالواسطہ لئے گئے ہوں، اور بیچارے مرزا نے خاقانی اور جامی، سعدی اور حافظ، فیضی اور عرفی، خیام اور حزیں کے ان متوارد کلام کو آنکھوں سے تو دیکھا ہو، لیکن اس کا اثر مطلق ان کے دماغ میں موجود نہ ہو، پھر یہ بھی ماننا کہ غالب کے کلام میں اگر دو ایک بھی طغرائے امتیاز آپ کو نظر آتے ہیں؟ ——— تو علمائے ہیئت کی طرح غالب کو بھی قابل فخر و ستائش تسلیم کرنا پڑے گا

اساطیر الاقدمین | علمائے مغرب کی کاوشوں کی بدولت، اس موضوع پر جامع تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ اس سلسلہ میں

یونانیوں اور رومیوں کے فسانے، مصر اور ہند کے توہمات، چین اور جاپان کے اساطیر، بابل و اسیریا کی قدیم عجائب پرستیاں، میکسیکو اور پیرو (امریکہ) کے اوہام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں۔ ڈونلڈ اے میکنزی اپنی کتاب "بابل و اسیریا کے اوہام و فسانے" میں لکھتا ہے، جس طرح بھیم نے راکششوں کو مارا، اسی طرح ہرقل نے کیڈن کا خاتمہ کیا اہل بابل کا یہ فسانہ جس میں گلگمیش کا سفر بادیہ پیمائی، اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں سے گزرنا، باغ و راغ سے گزر، بحر ...ات کے سواحل تک رسائی دکھائی جاتی ہے ہندوستان کے اس فسانہ سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے جسمیں ہنومان کے واقعات بادیہ پیمائی، اور صحرا نوردی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جسوقت وہ سیتاجی کی تلاش میں سرگرداں تھے، اسی طرح اہل ہند کے فسانہ میں مسٹر نوبڈ ٹیلانے سری کرشن جی کی نے نوازی اس کے دلکش اور غیر معمولی تاثرات، اور بستی کی نوجوان لڑکیوں پر جنھیں "گوپا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے ساحرانہ جذب و کشش کا منظر دکھایا ہے، وہ یونانیوں کے اساطیر ...ی ترانہ سنجی اور نغمہ پردازی، اس کے غیر معمولی کرشمۂ ترنم اور مناظر فطرت پر اس کے حیرت انگیز اثرات سے ملتا جلتا ہے جو "گولڈن فلیس" کی تلاش میں، اور پھر دوبارہ اپنی بیوی کی اچانک وفات کے غیر معمولی رنج والم میں عالم سفلی (انڈر ورلڈ) کے سفر میں جا رہا تھا۔

حلول ارواح کے متعلق یونان، مصر، ہند اور سب سے بڑھکر قدیم اہل عرب کا ایک عقیدہ معلوم ہوتا ہے، یونان میں حضرت مسیح کے پانچسو برس قبل ایک فلسفی فیثاغورس تناسخ کا قائل تھا، اسی طرح ہند میں بھی آج تک یہ خیال موجود ہے۔ ڈونلڈ اے میکنزی اپنی دوسری تصنیف "قدیم اہل مصر کے فسانہ و اوہام" میں لکھتا ہے کہ جب مصر میں کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کا ایک مجسمہ اس کی قبر پر رکھدیا جاتا ان کا عقیدہ تھا کہ متوفی کی روح اس مجسمہ میں داخل ہوتی ہے، ورنہ حنوں کے لئے ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے، اس لئے وہ اس مجسمہ کے نزدیک اکل و شرب کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے خیال میں تین روحیں ہوتی تھیں، اس مجسمہ میں جو روح حلول کرتی تھی اسے وہ "کا" کے نام سے موسوم کرتے تھے احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حلول روح کے متعلق، قدیم عرب بھی وہم میں مبتلا تھے چنانچہ امام بخاری مناقب میں عبدالرحمٰن ابن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد قاسم بن محمد، جنازہ کو دیکھکر کھڑے نہیں ہوتے تھے، ——————

—————— انکا خیال تھا کہ متوفی کی روح، کسی پرندہ کے جسم میں حلول کرتی ہے، جب کوئی نیک عمل کرتا ہے، تو کبوتر وغیرہ کے جسم میں اس کی روح جاتی ہے، اور بد ہوتا ہے تو کوے وغیرہ میں۔ میکنزی نے اپنی اس تصنیف میں اہل مصر کی شجر پرستی کا بھی حال لکھا ہے، جو آج تک ہندوستان میں مروج ہے، اسی طرح مجھے یاد آتا ہے، کہ اہل میکسیکو، و پیرو (امریکہ) کے "واقعات و اوہام" میں یا "اہل جاپان کے توہمات" میں جولیوس اسپنسر، اور ہوڈ لینڈ ڈیوس کی تصنیفات ہیں، .... جن میں مصنف نے ان قدیم باشندوں کی تصویریں بنائی ہیں اور آفتاب کے سامنے تعبدانہ رنگ میں کھڑا دکھایا ہے، ہند میں آج تک آفتاب کی پرستش ہوتی ہے۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب تک قدیم اہل بابل، امریکہ، مصر، جاپان، ہند وغیرہ میں ذرائع آمد و رفت نہ تھے،

کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے اخلاق، طرز عبادت، اور عقاید کا علم ہوتا تو یہ مماثلت کیسی؟ گو قدیم ہندوستان کے اسباب رسل و رسائل و جہاز رانی کے متعلق بینی کمار سرکار نے اپنی علمی تصنیف "فنون حکمیہ میں اہل ہند کا کمال" میں لکھا ہے اسی طرح مصر و ہند کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق ہیرو ڈوٹس یونان کا قدیم مورخ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ فسانے اور اوہام اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ کی روشنی وہاں تک نہیں پہونچ سکتی، آمد و رفت کے ذرائع، اور رسل و رسائل کے اسباب بعد کی پیداوار ہیں۔ اس سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ انسانی جذبات و احساسات یکساں ہیں ماحول کے مناظر نے اختلافات پیدا کئے، لیکن اصول میں نوع انسانی کی رفتار تخئیل ایک محور کے ماتحت ہے۔ پس ہوسکتا ہے کہ غالب کی شاعری اور شاعرانہ تاثرات، اہل فارس کی تقلید کا نتیجہ نہ ہوں، بلکہ فطری مناظر نے غالب پہ اثر ڈالا ہو اور اہل فارس سے توارد، اور تمثیل کی وجہ وہی نوع انسانی کے مرکزی جذبات و احساسات کی مقارنت ہو۔؟

ہیئت

موجودہ علم ہیئت پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ بتدریج اس میں انفرادی اضافے ہوتے گئے، اس فن کے سربرآوردہ علما ہیئت داں کے لقب سے مشہور ہوئے، گو انھوں نے متقدمین کی تقلید ہی کی ہو اور صرف ایک ہی مسئلہ میں اجتہادی نظر ڈالی ہو، چنانچہ بطلیموس، مصر کا مشہور ہیئت داں بروج کی تخصیص، اور ان کے تسمیہ میں اہل بابل کا مقلد ہے، بطلیموس پر کیا منحصر ہے، آج تک اقوام عالم میں بروج کے متعلق وہی افکار ہیں، جو قدیم اہل بابل کی رسائی ذہن کا نتیجہ ہیں، میکنزی نے اس نظریہ کو بھی شد و مد سے پیش کیا ہے، اسی طرح بطلیموس سے لیکر البطانی (جسے بطلیموس عرب کہا جاتا ہے) عباسیہ اور فاطمہ کے علمائے ہیئت بنو شاکر، ابوالحسن، اور ابن یونس کے زمانہ تک ایک نظریہ رہا، یہاں تک کہ یورپ میں کوپرنیکس پیدا ہوا، اور اس نے بطلیموس کے نظام میں یہ تغیر کیا کہ زمین بھی ایک کرہ ہے اور بجائے ارض کے آفتاب اس نظام کا مرکز ہے۔

البطانی جو عرب اسلام میں سب سے پہلے مشہور ہیئت دان گزرا ہے اس کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کے اس اجتہادی نظریہ پر ہے کہ اس نے ہیئت اور علم مثلث کے حساب میں وتر دائرہ کے بدلے جیب متساوی (   ) کا استعمال کیا، دسویں صدی عیسوی میں بنو الجور کی شہرت ہیئت دانی اس نظریہ پر ہے کہ انھوں نے حرکات قمری کا اندازہ لگایا، عہد مامون میں بنو شاکر نے پہلے پہل منطقۃ البروج کے انحراف کا انکشاف اور تغیرات فی ہیئت القمر کا معائنہ کیا۔

اب اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے مغرب کی کاوشوں کو دیکھئے، مسٹر جین نے کرۂ ارض کی ہیئت کے متعلق اپنی تحقیق پیش کی، لینگلے نے جبل دہنی پر آفتاب کے متعلق اپنی فکری قوت کو جولانی دی، کلف آفتاب کے متعلق ——— پروفیسر سیمپسن کی تحقیق موجود ہے، مشتری پر کرۂ ہوا کے وجود کے متعلق تین علمائے رصدگاہ ایڈمیرل اسمتھ مسٹر میکر اور ڈاکٹر پیرسن نے نظریات کا اضافہ کیا، مولٹن نے "سائنس ان ماڈرن لائف" (جدید زندگی میں علم و حکمت) کی پہلی جلد میں اس طرح کی بیسوں مثالیں پیش کی ہیں،

کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جب بطلیموس، البطانی، ابن یونس، مسٹر جین اور بیرسن، وغیرہ کی علم دانی، اور شہرت، متقدمین کی تقلید کے باوجود، چند تحقیقات انفرادی کے باعث احترام وعظمت کی مستحق ہیں، تو کیا غالب شعرائے متقدمین کے مقابلہ میں صرف "دریوزہ گر" اور "مستعیر" ہی کہلانے کا مستحق تھا، کسی مدح وستائش کا نہیں ؟

لطیف اسلوب بیان اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال میں آج اردو غالب کی بہت کچھ مرہون منت ہے اردو میں خواجہ حافظ کے طرز میں کسی نے کچھ کہا تو میرے خیال میں وہ مرزا غالب ہی ہیں، بے باکی، مذہب سے لاپروائی، رندمشی شرب ودوام کیف ومستی اور اسیر صوفیانہ خیالات کی روانی، جذبۂ واحساس کا وفور، ذوق ونشاط کا سیلاب جو تغزل کی جان ہیں، جس طرح خواجہ حافظ کے ہاں پائے جاتے ہیں اسی طرح مرزا غالب کے یہاں ہیں،

عبدالمالک آروی

صدائے شکست

(افسانہ)

ملہر راؤ جس وقت میوزک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے آئے تو سب نے ان کی صورت دیکھ کر حکم لگا دیا کہ یقیناً یہ شخص موسیقی کا بڑا ماہر ہوگا، کیونکہ قدرت اس قدر ظالم نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان کو اس قدر بدصورت بنائے اور پھر اس کی تلافی کسی اور طرح نہ کرے۔ سیاہ فام چہرہ چیچک کے داغوں سے ناہموار، چوڑی ناک ماتھے کے قریب بالکل چپٹی، آنکھیں غیر معمولی طور پر بھیانک ہونے کی حد تک بڑی، ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے لیکر ٹھوڑی تک ایک سطح نظر آتی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا جس سے دہن کا وجود متعین ہو سکتا۔ قد چھوٹا، قامت ناموزوں، ہاتھ پاؤں بدنما، الغرض ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے وہ انتہائی بدقسمت انسان تھا اور بدصورتی کا ایک مجسمہ لیکن اسی کے ساتھ خدا نے موسیقی کی ایسی زبردست دولت اس کو عطا کر دی تھی کہ دنیا اس کی عزت کرنے پر مجبور تھی اور جس وقت وہ اپنے گلے سے کوئی آواز پیدا کرتا تو اس کی اسی مکروہ صورت پر اک خاص قسم کا روحانی حسن چھا جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ کوئی دیوتا ہے جو مصلحتاً ایسی صورت اختیار کر کے آسمان سے زمین پر اُتر آیا ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری دولت اس کی لڑکی رجنا تھی، جو کسی طرح بہ لحاظ صورت اپنے باپ کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن ذوق موسیقی کے لحاظ سے ماننا پڑتا تھا کہ سوائے ملہر راؤ کے وہ کسی اور درخت کا پھل ہو ہی نہیں سکتی۔

یوں تو وہ غیر معمولی کیا، معمولی حسین بھی نہ تھی، اور اس کا کوئی عضو علٰحدہ علٰحدہ کسی مخصوص جمال کا مالک نہ تھا، لیکن بحیثیت مجموعی وہ بہت دلکش چیز تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص اس کو ایک بار دیکھنے کے بعد، دوبارہ نظر اٹھانے پر مجبور نہ ہو جائے اگر کسی عورت کے خد و خال میں نمایاں نقص نہ ہو، تو سانولا رنگ اور کتابی چہرہ، یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ شباب کے ساتھ ملکر کافی قیامت ہو جاتی ہیں، چہ جائیکہ قامت میں رعنائی ہو اور اداؤں میں تہذیب کی دلکشی کہ پھر تو مرد کا اس کے سامنے سراپا "عذر" ہو کر رہ جانا ناگزیر ہے۔

رجنا جس کی عمر ۲۱ سال کی ہوگی۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے یقیناً غیر معمولی چیز تھی اور چونکہ وہ مدراس یونیورسٹی کی گریجویٹ بھی تھی اس لئے اس کے دلکشی جمال ایک ایسی سنجیدہ فضا پیدا کر دیتی تھی کہ وہاں تک پہونچنے کی ہمت مشکل سے کسی کو ہوتی تھی جب وہ کالج میں اپنے باپ کے ساتھ آتی (اور ہفتہ میں دو چار بار ضرور آتی) اور کسی درجہ کی تعلیم کو آکر دیکھنے لگتی تو کبھی یہ ہوتا کہ استاد گھبرا کر خود خاموش ہو جاتا اور کبھی وہ خود اس کے ہاتھ سے ساز لیکر درس میں مشغول ہو جاتی۔ طلبہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے کہ کاش رجنا بائی ان کے درجہ میں آ جائے نہ اس لئے کہ وہ عورت تھی اور جوان و دلکش عورت، بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا ہر درس

موسیقی اک مستقل "نشۂ حیات" ہوا کرتا تھا اور اس کی آواز کا ہر ہر جزو، ہر ہر نشیب و فراز، ایک ایسا نقشِ روح ہوتا تھا جو کبھی مٹ نہ سکتا تھا۔

یوں تو وہ ہر ساز کو تکمیل کے ساتھ بجا سکتی تھی کیونکہ اس کا باپ حقیقتاً بین کار ہی تھا اور اس لئے رچنا کو بھی بین ہی میں ماہر کیا تھا جس کی مہارت تمام سازوں کا مالک بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی نظری ذوق کے لحاظ سے زیادہ تر سرود کی طرف مائل تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جس وقت وہ بین کی نزاکتوں کو (جو حقیقتاً خود اسی کے ذوق کی نزاکتیں تھیں) سرود میں ظاہر کرتی تھی تو نہ سرود سرود رہتا تھا اور نہ وہ مغنیہ۔ وہ ترقی کرکے کوئی ایسا ساز ہو جاتا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا اور یہ ایک مغنیہ کی حیثیت سے بڑھکر کوئی ایسی ہستی نظر آتی جو صرف اساطیر و صنمیات میں پائی جاتی ہے۔

رچنا اپنے اخلاق و اوقات کے لحاظ سے اس قدر صحیح نمونہ انسانیت و نسائیت کا تھی کہ اس کو دیکھکر قدیم آریہ ورت کی وہ دیویاں یاد آجاتی تھیں جن کا ذکر اب صرف کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ ماں عرصہ ہوا مر چکی تھی اس لئے اپنے باپ کی آسائش اور دو چھوٹے بھائیوں کی پرورش و تربیت بھی اسی کے ذمہ تھی اس کی شادی کمسنی میں ہوگئی تھی لیکن قبل بلوغ اس کا شوہر مرگیا اور وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے دوسری شادی کی مخالف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے ساری عمر باپ ہی کے گھر میں بھائیوں ہی کی خدمت میں صرف کرنا ہے اس لئے وہ اپنے موجودہ حال پر حد درجہ قانع تھی اور اس نے اپنے باپ کے گھر کو اپنے سبق و تمیز، اپنی روحانی شگفتگی اور اپنی اخلاقی دلآویزی سے ایک مختصر سی جنت بنا رکھا تھا جس میں سوائے اس کے باپ کے کسی اور ہستی کی گنجائش نہ تھی جو اس کے شمائل سے متاثر ہوتا۔ اول تو یوں بھی ملہر راؤ کے گھر بہت کم آدمی آتے جاتے تھے کیونکہ وہ خود اپنے اندر سوسائٹی کی کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا اور جو لوگ آتے بھی تھے سو وہ اس تمنا کو لیکر کہ رچنا بائی سے ملاقات ہو جائے گی، لیکن اس کی اوقات کچھ ایسے مصروف تھے کہ مشکل ہی سے کبھی اس کو لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملتا

وہ بہت صبح اٹھتی اور اسی وقت نہاکر، پوجا میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی پوجا یقیناً وہ پوجا نہیں تھی جس میں مورتیوں کو سامنے رکھکر گھنٹیوں کی آواز سنائی جاتی ہے یا چھوٹے چھوٹے چمچوں سے ان پر پانی گرایا جاتا ہے۔ اشلوکوں کا ورد ہوتا ہے جنہیں پڑھنے والا خود نہیں سمجھتا بلکہ اس کی پوجا صرف خیال و مراقبہ کی تھی، محویت و استغراق کی تھی یعنی بجائے اس کے کہ وہ خود کسی بت کو پوجتی، خود بت ہو جاتی تھی اور پرستش کے لائق۔ کبھی کبھی وہ اس کے بعد گاتی بھی تھی اور یہ گانا اس کا اس درجہ بلند، اس قدر پردردہ روح اور ایسا آلہانہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس کی تکرار دوسرے وقت نہیں کرسکتی تھی۔ اس وقت اس کا گانا اس کی وہ دلی التجائیں وہ روحانی تمنائیں ہوتی تھیں جو مقصود و مدعا سے بے نیاز ہوکر تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتی ہیں۔ وہ نغمۂ صباحی کے بعد اس کی فارغِ گریہ آنکھوں میں ہلکا سا نم جس کے اندر سے آنکھ کی چمک ایک محدب شیشہ کے پار ایک نقطۂ نور معلوم ہوتی تھی، وہ اس کے رخسار کی رنگین تازگی، وہ صبح صادق کی سی وسیع پیشانی، الغرض تمام وہ دلکشیاں جو کسی فرضِ خداوندی سے فارغ ہونے کے بعد ایک مطمئن قلب انسان کی ہستی میں پیدا کردیتا ہے، رچنا ایسی تکمیل کے ساتھ اس کے چہرہ پر

نمودار ہوجاتی تھیں کہ بقول ہمارے ایک دوست کے (جنھوں نے ایک دو مرتبہ اس کو صبح کے وقت دیکھا تھا) بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے دو زانو ہوجاؤ۔

وہ صبح کی پوجا کے بعد طلوع آفتاب سے قبل تمام خانہ داری کی ضروریات سے فارغ ہوکر، اپنے بھائیوں کو لیکر بیٹھ جاتی اور اُن کو پڑھاتی، یہاں تک کہ اسکول کا وقت آجاتا اور وہ بچوں کو روانہ کرکے کبھی میوزک کالج چلی جاتی اور کبھی گھر ہی پر مطالعہ کتب میں مصروف ہوجاتی۔ وہ مذہباً کچھ بھی ہو لیکن اعتقاداً و عملاً بالکل ٹھیا سوفسٹ (صوفی) تھی اور خدا اور مذہب کا ایک خاص مفہوم اس کے ذہن میں تھا۔ وہ تفریق مذہبی اور جماعتی عصبیت سے بالکل ناواقف تھی اور وہ ہر انسان کو خواہ وہ کسی مشرب و ملت کا ہو، نگاہ لطف و اخوت سے دیکھتی تھی۔ الغرض یہ تھی بلند سیرت رجنا کی جس نے ایک عام صفت محبوبیت اس کے اندر پیدا کردی تھی،

(۲)

میوزک کالج کے طلبہ میں راج کمار بوس، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بنگال میں موسیقی معاشرت کا ایک ضروری جزو ہوکر رہ گئی ہے اس لئے وہاں کا ہر فرد کچھ نہ کچھ ذوق اس کا رکھتا ہے، لیکن راج کمار کا خاندان چونکہ خصوصیت کے ساتھ فنون لطیفہ کا ماہر مانا جاتا تھا اس لئے اس کے اندر یہ ذوق زیادہ تکمیل کے ساتھ پایا جاتا اور وہ بنگال اور مدراس کی موسیقی کے فرق کو سمجھتا تھا اسلئے جب اس نے یہ سنا کہ مدراس کا مشہور نایک ٹھہرا دمیوزک کالج میں پرنسپل ہوکر آیا ہے تو اس نے بھی ایک اسکالر کی حیثیت سے اپنے آپ کو کالج سے وابستہ کردیا اور چند دن میں اس کی غیر معمولی ذہانت اور فطری ذوق نے ایک استادانہ حیثیت حاصل کرلی

رجنا بائی کے عام اخلاق اور مہارت فن نے جس طرح اور ہر شخص کی نگاہ میں اس کو عزیز و محبوب بنا رکھا تھا اسی طرح راج کمار پر بھی اس کا خاص اثر تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ دنیا جب رجنا کو محو ترنم دیکھتی تھی تو بیتاب ہوجاتی تھی اور داد دینے پر مجبور۔ لیکن یہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے نہایت خاموش لطف اٹھاتا اور جس وقت سارے مجمع کی نظریں حریص ہوکر رجنا پر پڑتیں، اس کی نگاہ صرف ایک پرستش خاموش ہوکر نکلتی اور اس کا پیام اعتراف صرف اُس کے چہرہ کا وہ رنگ ہوتا جس کے تغیر کا سمجھنے والا مجمع میں سوائے ایک ہستی کے اور کوئی نہ ہوتا۔

راج کمار قصداً اِن موقعوں کو بچا جاتا جب اسے رجنا سے مخاطب ہونا پڑتا اور رجنا بھی یہ سمجھکر کوشش کرتی کہ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ نہ آے اور اس میں بڑی حد تک اس کا جذبۂ نسائیت بھی شامل ہوتا۔ چھ مہینے گزر چکے ہیں اور کالج کی فضا کا کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا استاد ایسا نہیں ہے جس کو رجنا سے گفتگو کرنے بلکہ ایک حد تک بے تکلف ہوجانے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ لیکن راج کمار کو ابھی تک یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، اور اگر کبھی وہ اس کا خیال بھی کرتا تو کانپ اُٹھتا کیونکہ اس حجاب و شرم کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی تھی وہ اسی قدر زیادہ شدت کیساتھ محسوس کرتا جاتا تھا کہ کہیں یہ سکوت کسی خاص ہنگامہ کی پرورش تو نہیں ہے۔ یہ اجتناب کسی مخصوص جذب و کشش کا مقابلہ تو نہیں ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس قفل خموشی کا ٹوٹنا کسی طلسم کا ٹوٹ جانا ثابت ہو۔

وہ ڈرتا تھا، اس وقت سے جب آنکھ سے آنکھ ملا کر اس کو رجنا سے گفتگو کرنا پڑے۔ وہ شرماجاتا تھا اس خیال سے کہ اگر کبھی اس سے ہمکلام ہونے کا موقعہ ملا تو وہ اس وقت تک کی کنارہ کشی کا کیا جواب دیگا۔ کوئی کیوں یقین کرنے لگا کہ عزت و احترام کا جذبہ بڑھ کر انسان کو ایسا ہی بنا دیتا ہے۔ وہ جس وقت اپنے جذبات کا تجزیہ کرتا تھا تو اس کو یقین ہوجاتا تھا۔ کہ رجنا کے ساتھ اسے محبت نہیں ہے، اور وہ اس خیال سے خوش تھا، لیکن جب وہ یہ دیکھتا کہ اس کے خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی، جس میں رجنا کا تصور ساتھ ساتھ نہ ہو، تو وہ گھبرا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دل اس کو اور وہ دل کو دھوکا دے رہا تھا اور اس کی محبت اسی طرح پرورش پا رہی تھی جس طرح برف کے نیچے اُگنے والے درخت کہ جب تک برف منجمد ہے کسی کو اُن کا علم نہیں ہوتا لیکن برف کے پگھلتے ہی وہ معاً شگوفہ کے نمودار ہوجاتا ہے۔ یقیناً اس کی محبت کا اظہار بھی "برف" ہی کے پگھلنے کا منتظر تھا۔

صبح کا وقت تھا اور سردی کا آغاز۔ کالج کے برآمدوں میں معلق گملے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور قریب ہی ہارسنگار کے درخت پر سناٹا چھا رہی تھی۔ راج کمار اپنے خیال میں مستغرق۔ لاسلکی کے کمرے سے نکل کر باہر جانا چاہتا تھا اور اس نے اس ارادہ سے پردہ ہٹایا ہی تھا کہ ٹھیک اسی وقت رجنا دوسری طرف سے آگئی اور ان دونوں کا سامنا اس طرح ہوگیا جس طرح تنگ راستے میں دو آدمی آمنے سامنے آجائیں اور ان کے لئے گزرنا دشوار ہوجائے۔ راج کمار کا ہاتھ پردہ کے ساتھ اُٹھا کا اٹھا رہگیا اور رجنا بھی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس کو فوراً ختم ہوجانا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور ان دونوں مجسموں میں اس وقت تک حرکت پیدا نہ ہوئی، جب تک کسی کے قدموں کی آہٹ نے ان کو اس نیند سے بیدار نہ کیا۔ راج کمار نے نہایت عجز سے گردن جھکا کر اظہار معذرت کیا اور رجنا بھی ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ خاموش جواب دیتی ہوئی اندر چلی گئی

(۴)

کالج کے سالانہ جلسہ میں رجنا کو لکچر دینا تھا جس کا موضوع "موسیقی کا اثر اخلاق پر" تھا، وہ بہت انہماک کے ساتھ اس کی تیاری میں مصروف تھی صبح کو ضروریات سے فارغ ہوکر وہ کل کے لکھے ہوئے مسودہ پر غور کر رہی تھی کہ راج کمار بھی آگیا۔ اس عرصہ میں اس کی آمد و رفت یہاں شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ رجنا کے باپ نے لکچر کی طیاری میں راج کمار سے مدد لینے کا مشورہ اس کو دیا تھا اور اس طرح روز صبح یہ دونوں یکجا ہوجاتے تھے۔ اس وقت راج کمار کو صرف یہ علم تھا کہ رجنا صرف موسیقی ہی کی ماہر ہے لیکن جب اس نے اس کے لکچر کے ناتمام اجزا دیکھے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے فکر رس کے لحاظ سے شاعر بھی ہے اور قوت بیان و اسلوب ادا کے لحاظ سے بے مثل ادیب بھی ہے۔ جس وقت ذیل کے چند فقرات اس نے دیکھے تو وہ حیران رہگیا۔ ایک جگہ اس نے دوسرے فنون لطیفہ کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

موسیقی کی وسعت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب دوسرے فنون لطیفہ کی پابندیوں پر نگاہ ڈالی جائے، نقاشی، محتاج ہے، کاغذ کی، موقلم کی، رنگ کی، یا پھر اس مواد کی جو تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہے، اگر ان اشیاء کو آج معدوم کردیا جائے تو سوائے ان فطری نقاشیوں کے جو عالم کون میں تو ہر جگہ نظر آتی ہیں لیکن دنیا۔ ئے تقلید میں وہ محتاج ہیں، مادی ذرایع کی، فن نقاشی

بھی فنا ہو جاتا ہے - شاعری محتاج ہے موسیقی کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شعر کا مفہوم ہی پیدا ہوا ہے موسیقی سے اور یہی وجہ ہے کہ جس شعر میں جتنی موسیقیت کم ہوتی ہے اتنا ہی وہ شعر کم ہوتا ہے -

اور فنون جمیلہ آغوش فطرت کے صرف ایک مختصر سے حصہ کو آباد کرتے ہیں، لیکن موسیقی تمام عالم طبیعی کا احاطہ کئے ہوئے ہے بادل کی گرج بارش کا شور، آبشار کا گرنا، ہوا کا چلنا، کوہ آتش فشاں کا پھٹنا، شیر کی ڈکار، بلبل کا نغمہ، بچہ کا رونا، جوان کا ہنسنا، اذان کی صدا، ناقوس کی آواز، یہ سب موسیقی ہی کے مظاہر ہیں جن سے کائنات معمور ہے - اور اگر آج اجرام سماوی اس نظام ریاضی کے ساتھ (جو حقیقتاً نظام موسیقی ہے) گردش ترک کر دیں تو میزان وجود میں اختلال پیدا ہو جائے اور عالم خلق درہم برہم -

موسیقی کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس کی متضاد کوئی چیز قدرت نے پیدا ہی نہیں کی، یہاں تک کہ خاموشی و سکوت جو بظاہر موسیقی کے منافی معلوم ہوتے ہیں، وہ خود موسیقی سے لبریز ہیں - کیا آپ نے کبھی آدھی رات کو بیدار ہو کر اس سکون کی آواز کو نہیں سنا جس سے خلا، عالم معمور نظر آتا ہے - موسیقی ہی ایک ایسا فن ہے جس کا ساز صرف ایتھر ہے جو تمام اہتزازات کو حاسہ سے قریب کرتا ہے، اسی لئے اور تمام فنون لطیفہ حقیقتاً صرف افکار انسانی ہیں اور موسیقی عبارت ہے محض عواطف (Sentiments) سے - ایک نقاش کلیوپٹرا کی تصویر بناتا ہے ایک بت تراش وینس کا مجسمہ طیار کرتا ہے، ایک معمار تاج محل اور قصر الحمرا کو وجود میں لاتا ہے، ہم ان کو دیکھتے ہیں اور صرف ایک جذبۂ حیرت و استعجاب تحریک میں آتا ہے، برخلاف اس کے جب موسیقی کی کوئی آواز ہمارے کانوں تک پہونچتی ہے تو ہماری روح میں اتنی بلند کیفیات کا ہجوم ہوتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہر کیفیات سے جداگانہ اک مقصد حیات وابستہ کر سکتے ہیں (باقی)

نیاز

اس مہینہ کے رسالہ میں ایک غلطی

یہ ہو گئی ہے کہ کاتب صاحب نے صفحہ ۴۶ کے بعد صفحہ ۳۷ شروع کر دیا اور درمیان کی کاپی آٹھ صفحے کی نہیں لکھی ہر چند جو مضمون صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۴۷ میں جاتا ہے وہ مسلسل ہے اور مطالعہ کے سلسلہ میں کوئی ہرج پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ اس ماہ کا رسالہ بجائے ۹۶ صفحات کے ۸۸ صفحہ کا رہ گیا اس غلطی کی اطلاع اسوقت ہوئی جب پرچہ تقریباً مکمل ہو گیا - امید ہے کہ یہ عذر قبول کیا جائیگا -

"مینیجر نگار"

بابُ المراسلۃ والمناظرۃ

(دارالعلوم ندوۃ العلماء)

مصدر لطف وکرم - 　　　ہدیۂ سپاس ونیاز

آپ نے ستم کیا کہ میری "غلط فہمی" کے خیال سے اپنی "چھیڑ" ملتوی رکھی، میں تو ان شامت زدوں میں ہوں، جو اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غلط فہمی کیسی؟ آپ کا یہ شکوہ کہ "میں نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقاتوں کا ذکر یوں آزادی وبیباکی سے کر دیا" سر آنکھوں پر، گزارش یہ ہے کہ میرا یہ غضب تو محدود تھا جناب ہی کی بارگاہ قدس تک، لیکن غضب آپ نے کیا کہ رازِ درونِ پردہ طشت از بام کر دیا آپ کی دلچسپ تمہید میرے لئے مایۂ سرور نشاط ومسرت ثابت ہوئی، یہ تو تھی خارج از موضوع گفتگو چاہتا ہوں کہ اصل موضوع پر پھر جناب کی کچھ تضیع اوقات کروں،

کر رہائے تو ماراکرد گستاخ

شاید میں اپنا مافی الضمیر صحیح طور سے پیش نہ کر سکا، جن چیزوں کا آپ نے جواب مرحمت فرمایا ہے وہ محض ضمنی ہیں، یعنی اپنے عزم صمیم اور ظن تیم کا لوگوں کے بالکل علی الرغم اظہار واعلان، بلاشبہ میرا یہ مطالبہ تھا اور مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنے خیالات وداعیات، منظر عام پر پیش کر دئے۔ لیکن اصلی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کو وقت وزمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھنا" کہاں تک مستحسن ہے؟ آخر وقت وزمانہ کا تقضا کیا ہوتا ہے، تہذیب وتمدن کا معیار کیا ہے؟ کیا ہر عالمگیر حکومت کا نظام تہذیب غلاموں کے لئے وحی آسمانی ہے، کیا ہر چمکتی چیز سونا ہے کیا ہر رنگ وبو والی چیز لطیف ہوتی ہے؟ کیا ہر نقش ونگار والی چیز مرکز جذب کشش ہو سکتی ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو گزارش ہے بصد عجز ونیاز، سوال ہے بصد احترام وآداب کہ کیا یورپ کی تہذیب تہذیب ہے کیا یورپ کا تمدن تمدن ہے؟ مانا کہ یورپ کے بتان سیمین بدن دنیا کو تسخیر کر چکے، تسلیم کہ مہوشان یورپ نے عالم نسائیات میں ایک روح تازہ پیدا کر دی، اقرار کہ دانایان فرنگ نے عالم ایجاد واختراع میں، عالم علم وعمل میں، عالم تہذیب وتمدن میں، عالم انسانیت وشائستگی میں ایک جدید راستہ پیدا کر لیا، لیکن غور طلب یہ ہے کہ کیا یورپ کی حضارت رحمۃ للعالمین ہے کیا یورپ کا تمدن باعث فوز وفلاح ہے کیا یورپ کی شائستگی لائق اعتماد ہے، کیا یورپ کی ذہنیت

لائق تقلید ہے؟ ہو سکتا ہو کہ جوانی کے نشہ میں، غفلت کی ترنگ میں، نادانی کے دھن میں، ہم اس کی کورانہ تقلید شروع کردیں، ممکن ہو کہ اس کی ہر ادا ہمارے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش ہو، ناممکن نہیں کہ اس کے خیالات و دعیات ہمارے لئے باعث دلچسپی ہوں، لیکن کیا اس صورت میں حقیقۃً وہ معلم اخلاق، مصلح تمدن، اور بانی بنائے انسانیت وشائستگی تسلیم کیا جاسکتا ہو؟

آپ کا ارشاد ہو کہ "جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں، وہ ان کے انحطاط وزوال کا انتہائی دور ہے" میری گزارش ہے کہ یورپ اس وقت جس صراط مستقیم سے گزر رہا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم ہے، لیکن حکم میں "پل صراط" کے ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اس کے نیچے ایک غار ہو جو نہ معلوم کتنی مہذب ومتمدن قوموں کو ہضم کرچکا ہے لیکن اب تک اس کی شکم سیری نہیں ہوئی، مدہوش یورپ مستقبل بدوش یورپ، مست وبیخبر یورپ اب سکر کے عالم میں ہے۔ اس کے قدم میں تزلزل، اس کی حرکت میں ارتعاش، اس کی اداؤں میں اضطراب پیدا ہوچکا ہے، وہ عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہو جسمیں اس جیسی نہ معلوم کتنی مہذب ومتمدن قومیں ایسی گریں کہ آج ان کے نام کے سوا کوئی یادگار باقی نہیں،

یورپ آج "برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہو، جانتا ہو کہ اس مصیبت عظمیٰ سے رہائی ناممکن ہے، سمجھتا ہے کہ اس لعنت سرمدی سے نجات ناممکن ہو، محسوس کرتا ہو کہ اس کی کشتی عمر بھنور میں ہو تو اب وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کردے۔ یہ نہیں کرتا کہ استقلال وثبات سے اپنی سیہ کار زندگی کو ختم کردے، بلکہ کوشش کرتا ہے اس کی کہ یہ لعنت عام ہوجائے یہ گندے جراثیم تمام اقوام وملل میں راسخ ہوجائیں، تاکہ حشر سب کا ایک ہو،

بلاشبہ یورپ نے عورتوں کو آزادی دی ہو لیکن آج وہ

سعدی از دست خویشتن فریاد

کا صحیح مصداق ہو، پچھتاتا ہے اپنی اس حماقت پر، کف افسوس ملتا ہو اپنی اس نادانی پر تاسف کرتا ہے اپنی اس جہالت پر، چارلی چپلن کے ساتھ اس کی بی بی نے جو کچھ کیا وہ پبلک میں آچکا ہے، اسی قسم کے، بلکہ اس سے بھی بڑھے ہوئے واقعات وحادثات ہر روز پیش آتے ہیں، اب وہ خود نادم ہو کہ اس نے اعتدال کو چھوڑ کر افراط کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ کتنا غلط تھا؟ کتنا گمراہ کن تھا؟ کتنا حماقت انگیز تھا۔ آزادی اسلام نے بھی دی، لیکن "باندازۂ ظرف" یورپ نے بھی آزادی دی لیکن "بقدر ذوق"۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اعتدال وافراط میں کیا فرق ہے، آپ نے دیکھ لیا

کہ حوا کی ان بیٹیوں کو آزادی دینے کے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ پھر جب قرآن کہتا ہے کہ "ان کیدکن عظیم" تو ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہے، ابروؤں پر بل آجاتا ہے؛ اسلام نے عورتوں کو مسیحیت کی طرح لعنت نہیں سمجھا ہے، اس نے مسجدوں میں جانے کی اجازت دی ہے، کام کاج کرنے کی اجازت دی ہے، میدان جہاد میں خواتین اسلام نے خدمات انجام دیے، معرکۂ کارزار میں عورتوں نے مرہم پٹی کے فرائض انجام دیئے، تفقہہ فی الدین کیا، علوم و فنون پر عبور حاصل کیا لیکن کلب کی ممبری کبھی نہیں کی، مسجدوں میں جانے کے لئے اصرار کیا ملاحظہ ہو:۔

"حدثنی عن مالک عن یحیی بن سعید عن عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل امرأۃ عمر بن الخطاب انہا کانت تستاذن عمر بن الخطاب الی المسجد فیسکت فتقول واللہ لاخرجن الا ان تمنعنی فلا یمنعہا" مؤطا امام مالک صفحہ ۱۴۰ مطبوعہ مصر

یعنی حضرت عمر بن الخطاب کی زوجۂ محترمہ مسجد جانیکی اجازت حضرت عمر رض سے طلب فرمایا کرتی تھیں آپ خاموش رہتے تھے، تو فرماتی تھیں خدا کی قسم جب تک آپ مجھے منع نہ کردیں گے میں برابر نکلونگی مگر آپ منع نہیں فرماتے تھے"۔

خواتین اسلام ہی عمر فاروق جیسے باجبروت و باہیبت خلیفہ کو برسر ممبر ٹوک دیتی تھیں، مگر پارک کی سیر، لوگوں سے اختلاط اور کلب کی ممبری، کبھی آپ کا شیوہ نہیں رہا، وہ انیس خلوت اور رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں لیکن مشیر کار کی حیثیت انکی کبھی نہیں رہی، اور غالباً جناب نے بھی اپنے اکثر افسانوں کا موضوع یہی رکھا، پھر اس انقلاب خیال اور تغیر عمل کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایکطرف تو عورتوں کے لئے افسانہ نگاری اور غزل گوئی کو آپ سرحد ممنوعہ کہتے ہیں دوسری طرف کھلے بندوں پھرنے کی اجازت بھی دیتے ہیں،

این چہ بوالعجبی است؟!

کہا جاتا ہے کہ یورپ رواداری کا علمبردار ہے، مساوات کا مبلغ ہے اس لئے کہ اس کی حضارت معراج کمال پر پہونچ چکی ہے ایسی تنگ نظری اس سے نہیں سرزد ہوسکتی، قطع نظر کیجئے اس عہد جہالت سے جب یورپ پر کلیسا کا اقتدار تھا پوپ کی فرماں فرمائی تھی۔ اس عہد میمنت فرجام کو دیکھئے کہ باوجودیکہ یورپ، مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرچکا ہے کلیسا کو بے دخل کرچکا ہے لیکن اب بھی لنش کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ کالوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے کسی گورے کی توہین کی، ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، آگ میں جلایا جاتا ہے، یہ سب کچھ آئین نوازوں کا تہذیب

پرست مجمع کرتا ہی، بلغیر عدالت میں چارہ جوئی کے، پولیس نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہی اور خاموش رہتی ہی، سرخیل مہذبان یورپ امریکہ نے ابھی حال ہی میں ہندوستانیوں کو حقوق شہریت سے محروم کیا ہی جسپر ایک غیور و خود دار ہندوستانی نے خودکشی بھی کرلی، سراد منصفین زمانہ برطانیہ جو

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہی

کی صحیح مصداق ہی، چین کی طرف سے نظر توجہ ہٹاکر مصر کی طرف پھر توجہ مبذول فرمائی ہی اور دیکھتے ہی دیکھتے نحاس پاشا سے وزارت چھن گئی، محمود پاشا برسراقتدار ہوگئے، پارلیمنٹ شکست ہوگئی، اور پھر مسٹر آسٹن چیمبرلین کا ارشاد ہی کہ ہم مصر کے اندرونی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے، بل کی بل میں بیک گردش چشم نیلوفری، عراق پر بھی ہماری سرکار دولت مدار کے ہوائی جہاز اُڑنے لگے، ایران سے بھی معاہدہ ہوگیا، تہذیب و تمدن، انسانیت و شائستگی، حضارت و مدنیت، کا یہ کتنا شاندار اور دلفریب مرقع ہے ؟

کہا جاتا ہی کہ طفل یورپ، بانِ اسلام ازم کے ہوے سے خائف نہیں ہی میں عرض کرتا ہوں کہ یہی تو وہ دھڑکا ہے جس کے تخیل کے اتنک طفل یورپ رعشہ براندام ہوجاتا ہی، گزشتہ جنگ عمومی میں یہ ہوا جناب لائڈ جارج صاحب تجمیع القابہ کو نظر آیا تھا اور بڑی بیچارگی اور بیکسی کے لہجہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مسلمانوں کی ایک دیوار ہی، جو چین سے لیکر "تانجاک کاشغر" ہندوستان سے لیکر مصر اور مصر سے لیکر تمام دنیا تک قایم ہی، اس آہنی دیوار سے جو اپنا سر ٹکرائے گا، خود اس کا سر پاش پاش ہوگا مگر اس دیوار میں تنزلزل بھی نہیں نہیں ہوسکتا، اور طفل یورپ کا یہی وہ دھڑکا تھا جس نے کابل کے بیدار بخت و جوان ہمت فرماں روا کو ہندوستان کی سیاحت نہیں کرنے دی اور یاں یہی وہ ہوا تھا جسنے ابن سعود کے ہاتھوں موتمر اسلامی کا خاتمہ کرایا، اور یہی وہ ہوا تھا جس نے عبدالعزیز ثعلبی کو تیونس سے جلا وطن کرایا، جس نے برکت اللہ بھوپالی کا "دیار غیر میں" وطن سے دور" خاتمہ کرایا، انسانیت اور شائستگی کا یہ کتنا دلنشین نمونہ ہی ؟

غرض یورپ کے کن کن کمالات و احسانات کا شکریہ ادا کیا جائے، اس نے عالم انسانیت پر جو عظیم احسانات کئے ہیں، دنیائے خدع و فریب میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، مشکل ہے کہ اس کوزہ میں اس دریا کی وسعت آسکے، مختصراً یوں سمجھئے کہ :-

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ، کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

ارشاد کیا گیا ہے کہ چونکہ تجربہ شاہد ہے کہ باندازۂ درازی داڑھی کی معصیت بڑھتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داڑھی رکھنا صورت ہی بگاڑنا ہے، اور نماز اس لئے اور یقیناً قابل مضحکہ ہے کہ اس سے ہئیت اجتماعی کے فوائد نہیں حاصل ہوتے، غرض ہے کہ "بزم میں اہل تماشا" کے ہونے سے "اہل نظر" کے نقدان کا توحکم نہیں لگایا جاسکتا۔ رہی نماز تو اس سے صرف ہئیت اجتماعی کا پیدا کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ ذاتی نیائش وعبودیت کا اظہار بھی تھا، اور یہ مقصد بہرحال حاصل ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے ان ناچیز خیالات کو نگار میں جگہ دیکر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، بہتر ہوتا کہ آپ ان خیالات کو پیش نظر رکھکر آپ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے، تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں،

رئیس احمد جعفری

(نگار) - عزیز من، آپ نے جس جوش و ولولے کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی ہے اس کی داد تو یقیناً آپ کو ملنی چاہئے لیکن استدلال و استنتاج کے لحاظ سے (معاف فرمائیے) اگر یہ کہوں کہ آپ کی یہ تمام "کاوکاو خامہ فرسائی" شورش کتابت کی تسکین کے سوا اور کچھ نہیں ہے نہ اس لئے کہ تقضایائی ترتیب ناقص ہے، نہ اس لحاظ سے کہ نتیجہ آپ جو کچھ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ دلائل کے منافی ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ شاید جس طرح آپ اپنا مافی الضمیر اس سے قبل صحیح طور سے نہ پیش کرسکے تھے، اسی طرح میرا بھی غالباً بنا مدعا نہ سمجھا سکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو یورپ کی تہذیب و معاشرت پر گفتگو کرنی پڑی حالانکہ وہ بالکل خارج از بحث امر ہے۔

میرا یہ کہنا کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کا وقت کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" ہرگز اس نتیجہ کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم یورپ کی تہذیب و معاشرت کو کلیتہً قابل تقلید سمجھکر اس کی پیروی کرنے لگیں۔ میں نے آج تک کبھی اس کی تائید نہیں کی اور نہ میں انہ تخبیت و تفریح کو مقتضائے فطرت انسانی سمجھتا ہوں۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اب سے ۱۳۰۰ سال قبل ملک عرب میں بیٹھکر جو قوانین ہماری معاشرت و تمدن کے لئے مرتب ہوئے تھے، وہ آج ہندوستان، ترکی، ایران، افغانستان، افریقہ، مصر، چین، ہر جگہ عمومیت کے ساتھ قابل عمل نہیں ہو سکتے اور اس لئے اگر ماحول کے لحاظ سے ضروریات زمانہ کے اقتضاء سے، سیاسیات وقت کی بنا پر، اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے، دیگر اقوام عالم کی ترقی علوم وفنون روش بدوش دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے، ان قوانین کو بدلدینے کی ضرورت ہو، تو یقیناً انہیں بدل جانا چاہئے۔

اگر اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ وہ ناسخ ادیان سابقہ اور ماحی مذاہب قدیمہ ہے، یعنی اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انسان کو مہذب، وشائستہ بنانے کے لئے، جامعۂ انسانیت کو "من حیث ہی اکمل" تمام کون میں سربلند و ممتاز کرنے کے لئے اسلام آخری تعلیم اور بالکل آخری لفظ ہے، اگر "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کوئی الہامی پیشین گوئی، کوئی خداوندی کلیہ ہے، اور اگر مسلمان انسان ہے اور انسانیت نام ہے صرف عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ بغیر دلیل کے تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور اگر ہم آپ تسلیم بھی کرلیں تو کیا ہوتا ہے، دنیا تو اس کے لئے طیار نہیں ہوسکتی۔

پھر غور کیجئے کہ آپ کے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہے؟ سوائے اس کے کہ آپ اپنے ہاں کی تعلیم کو پیش کریں اور کیا کر سکتے ہیں، پھر اگر وہ تعلیم اس قدر ہمہ گیر، اتنی وسیع اور اس درجہ لچکیلی ہے کہ ہر وقت و زمانہ ہر ملک و قوم کے حالات و طبائع اور امیال و عواطف، کا ساتھ دے سکتی ہے تو بیشک آپ کا دعویٰ صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

کلام مجید میں سوائے بعض معاشری احکام کے (جن میں طلاق، نکاح، ترکہ وغیرہ شامل ہیں) اور جن کا اُس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے نص قطعی کی صورت میں پیش کرنا ضروری تھا اور جن میں اب ضرورت زمانہ کے لحاظ سے تغیر ضروری ہے باقی تمام تعلیمات ایسی ہیں جن میں ازل سے ابد تک کسی وقت کسی تغیر کی ضرورت نہیں، نہ اس لئے کہ انکا تعلق ایسے حقائق مسلمہ اور بدیہیات واضحہ سے ہے کہ ان پر بحث کرنے کی کسی وقت حاجت ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ہماری حیات ارتقاء کا انحصار انہیں پر ہے مثلاً خدا کی وحدانیت انبیا کی رسالت کہ ان کا تسلیم کرنا انسانی سراسیمگی کے دور کرنے اور اجتماعی انضباط پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یا درس اخلاق کہ اس کی اہمیت بھی کسی وقت کم نہیں ہو سکتی اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہاں تک کہ آج یورپ بھی جو عملاً بہت سی بداخلاقیوں کا مرتکب ہوتا ہے مقالاً اسی کا دعوائے حمایت کرتا ہے۔ یقیناً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم اور اخوت کا درس تو ہر مذہب نے دیا ہے پھر اسلام میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کو خاتمۃ الکلام اور مقطع المذاہب کہہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب فرنگی محل اور دیوبند یا اپنے دار العلوم ندوہ کی فضا میں نہ ڈھونڈیئے، بلکہ اس کے لئے خود تھوڑی سی توسیع نظر اور اجتہاد فکر سے کام لیجئے جو ہر شخص کا فطری حق ہے اور اس وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ کلام مجید کیوں دوسرے صحف آسمانی اور کتب الہامی سے ممتاز ہے۔

یہ امر مسلمہ عالم ہے کہ صحیح معنے میں رشد و ہدایت کی زبان و تخئیل وہی ہو سکتی ہے جو جماعت مخاطب کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ اگر عام لوگوں کے سامنے بجائے حصول و ضرورت مذہب کے فلسفۂ مذہب کی تاریخ پر گفتگو کیجائے تو وہ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور اس لئے ان پر کوئی اثر بھی نہ ہو گا۔ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر تمام صحف آسمانی یا کتب ملہمہ کا نزول ہوا۔ پھر چونکہ موسیٰ، عیسیٰ، بودھ، کرشن وغیرہ تمام انبیاء سابقہ کے زمانہ میں دماغ انسانی نے اس قدر ترقی نہ کی تھی کہ وہ اعمال نیک و بد، جزا و سزا کے معمولی اور سطحی مفہوم کے سوا حقیقی معنی کو سمجھ سکیں اس لئے ان کے سادہ دماغوں کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش نہیں کیا گیا اور مابعد الطبیعیات کی دنیا قائم کر کے بہشت و دوزخ، عذاب و ثواب اُخروی کی زبان میں لوگوں کو عمل نیک کی دعوت دی گئی اور یقیناً وہ اثر ہوا جو مقصود تھا۔

جب نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا تو اس وقت بھی دنیا کوئی خاص ترقی نہ کر چکی تھی، لیکن خدا کے علم میں تھا کہ وہ دور نہضت و ارتقا جو منتہائے نظر فطرت ہو سکتا ہے، اسی دور ظلمت و تاریکی کے بعد آنے والا ہے، اس لئے قرآن کو اُس تعلیم کا حامل بنا کر نازل کیا جس کے بعد پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت نہ ہو، یعنی اگر اس میں ایک طرف بلید دماغ والوں کے لئے وہی تعلیم کی "سادگی" ملحوظ رکھی گئی جو امم سابقہ کے لئے ان کے انبیاء نے اختیار کی تھی تو دوسری طرف وہ "پُرکاری" بھی پیدا کی گئی جس کے سمجھنے کے بعد تمام اور تعلیمات

حرف غلط ہو کر رہجاتی ہیں۔

دیگر ادیان کی تعلیم کا ناقص پہلو باعتبار دنیاوی ترقی کے، جزا و سزا اور حیات بعد الموت کی تعلیم میں پنہاں تھا، لیکن قرآن ہی اول وہ صحیفۂ آسمانی ہو جس نے اس خیال اور تعلیم کی حقیقت کو ظاہر کیا اور بتایا کہ جو کچھ انسان کو اس باب میں اسوقت تک بتایا گیا وہ صرف ایک تعبیر مصلحت تھی، ورنہ حقیقت یہ ہو کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب سب اسی دنیا سے متعلق ہے، یہاں تک کہ احیاء موتیٰ سے بھی مراد صرف مردہ اور جامد قوموں کا زندہ ہوجانا ہو۔

کلام مجید میں کوئی ایک تعلیمی آیت بھی ایسی نہیں ہو جس میں درس عمل نہ دیا گیا ہو اور محض زبانی حمد و ثنا یا مقانی تسبیح و تہلیل کی طرف ترغیب دلائی گئی ہو۔ اسلام نے ظاہری مراسم یا سطحی باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اُس نے صرف "بما کسبت قلوبکم" کو دیکھا اور اسی پر آخری حکم لگایا۔ جہاں سیئات کا ذکر کیا، اُس سے غیر عملی اور غیر مجاہدانہ زندگی مراد لی اور جہاں حسنات کا ذکر کیا اس سے عمل اور اجتہاد مراد لیا۔ اس نے بتایا کہ جنات عدن سے مقصود سوائے قومی ترقی کے اور کچھ نہیں ہو اور جہنم کا مفہوم قوم اجتماعی انحطاط و زوال ہو۔ حور و قصور کوثر و سلسبیل کے معنے نبی آخر الزماں کے ظہور سے قبل خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن محمدؐ کے ذریعہ سے خدا نے ان الفاظ کا مفہوم صرف دنیاوی فلاح و ترقی قرار دیا، کیونکہ اگر مرنے کے بعد کسی عالم کو تسلیم کرلیا جائے تو وہاں کی خوشحالی یہاں کی تکالیف کا کیا بدلہ ہوسکتی ہو جبکہ اس کے بعد پھر کوئی حیات عمل انسان کو دی جانے والی نہیں ہو۔

الغرض میں نے جہاں تک غور کیا ہو یہ تعلیم ——— صرف قرآن پاک نے دی اور یہی وہ امر مابہ الامتیاز ہے جو صحیفۂ محمدی کو صحف موسوی و عیسوی وغیرہ سے جدا کرتا ہو۔

پھر جس مذہب میں ترقی کی تعلیم اس قدر زبردست ہو اس کا اس قدر قدامت پسند ہونا کہ سیکڑوں سال قبل جو ایک طریقہ مقرر کردیا گیا ہو اس میں کسی تغیر کو قبول نہ کرے کس حد تک قرین عقل و انصاف سمجھا جاسکتا ہو۔ آپ خود اپنے ہاں کے قیاس، اجتہاد اور اجماع کو دیکھئے کہ یہ کیا ہیں۔ کیا یہ تغیر و تبدل کے متقضی نہیں ہیں کیا ان کا وجود اس لئے نہیں ہو کہ ان کے ذریعہ سے ہم وقت ضرورت کے مطابق قانون معیشت و معاشرت بنا سکیں۔

پھر جب یہ امر نہ صرف قرآن و حدیث بلکہ اکابر امت کے اقوال و عمل سے بھی ثابت ہو تو آج میرا یہ کہنا کہ "ہمارے تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" کیوں چین پیشانی کا باعث ہوتا ہو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس تغیر سے مراد یہی ہو کہ بالکل یورپ کی زندگی کو اختیار کرلیا جائے۔ یہ تو میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر اہل یورپ میں کچھ باتیں قابل تقلید ہیں تو اُن کو کیوں نہ اختیار کیا جائے ———

——— جب کہ ارشاد نبوی "الحکمۃ ضالۃ المومن"۔ موجود ہے

آپ نے اہل یورپ کی موجودہ معاشرت کے جو جو نقائص ظاہر کئے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن اگر آپ اسی سلسلہ میں

"ہنرش نیز بگو" پر بھی عمل کرتے تو بہتر تھا۔ اگر اہل یورپ میں سو معایب ہیں تو دو چار خوبیاں بھی ہونگی، لیکن ہمارے معائب و محاسن میں تو یہ نسبت بھی نہیں ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے عادات و خصایل پر نکتہ چینی کا کیا حق حاصل ہے اور اس کو سوائے اس کے کہ (Poor man's Consolation) سے تعبیر کیا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں، اگر دانایان فرنگ کی ایجاد و اختراع، علم و عمل آپ کے نزدیک لغو و بیکار ہے، اگر ان کی دنیاوی ترقی آپ کے نقطۂ نظر سے زوال و انحطاط ہے، اگر انکی ذہنیت آپ کے لئے لائق تقلید نہیں ہے تو خدا کے لئے بتائے آپ کس راہ پر نوع انسان کو لیجانا چاہتے ہیں اور وہ "صراط مستقیم" آپ کی کونسی ہے جس کے "نیچے" کوئی غار" نہیں پایا جاتا۔

اگر آج یورپ " برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہے تو کیا ایشیا میں افزایش نسل کے ساتھ فاقہ کشی کو برکت خداوندی کہیں گے۔ اگر علوم و فنون کی ترقی آپ کے نزدیک خدا سے انحراف ہے تو خدا کے لئے بتائیے کہ جہل و جمود کیونکر خدا تک پہونچاتا ہے اگر یورپ کا انسان اپنے اعضاء سے کام لیکر رات دن محنت کرتا ہے تو آپ کے ہاں کا وہ زاہد شب زندہ دار جو توکل پر پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہے کیوں اس پر ہنسے، جبکہ وہ بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خدا نے ہاتھ کی پانچ انگلیاں اسی لئے بنائی ہیں کہ انسان پھاوڑا لے اور زمین کھودے ورنہ محض تسبیح ہلانے کے لئے صرف ایک انگوٹھا اور کلمہ کی انگلی کافی تھی۔

آپ نے مغربی عورت کی آزادی کا جو مذموم پہلو پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے، لیکن بندہ نواز یہاں کی "پردہ نشینانِ حریم ناز" کی ترد امنی بھی تو اس حد سے گزر گئی ہے کہ اس کو نچوڑ کر فرشتوں کو وضو کی دعوت دیجائے۔

اگر وہاں کا مرد عورت کی آزادی سے پریشان ہے۔ تو یہاں کی عورت مرد کے ظلم و استبداد سے چیخ اٹھی ہے، اگر وہاں اخلاقی انحطاط زیادہ ہے تو نشۂ دولت کی وجہ سے، لیکن افسوس تو ہم پر ہے کہ دولت بھی نہیں اور حسن اخلاق بھی ندارد۔ وہ گر معصیت کرتے ہیں تو " عذر نا پذیر" کے ماتحت، اور آپ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس حال میں کہ کوئی حیلۂ غیر شرعی بھی موجود نہیں۔ وہ تو علانیہ کہتے ہیں کہ عصمت انسان کی کوئی بڑی ممدوح و مہتم بالشان صفت نہیں ہے کیونکہ اگر آج دنیا معصوم ہوجائے تو کائنات میں خاک اڑنے لگے۔ لیکن آپ تو اس کو غایت انسانیت سمجھتے ہیں اور پھر ترک کئے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح میں یورپ کے ظلم و استبداد، غیر رواداری، عدم مساوات وغیرہ وغیرہ تمام سیاسی و اخلاقی معایب کا معترف ہوں، لیکن میں کبھی انکا ذکر مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یورپ کے بدترین اخلاق کے مقابلہ میں جب ہم ایک بھی کوئی اس کا ضد پیش نہیں کرسکتے، تو ہم کو اس پند و موعظت کا کیا حق حاصل ہے۔ آپ کا یہ طعن مغرب کے خلاف صرف بیدست و پا، جاہل و نا قابل، کاہل و مجہول غلام کا سا غصہ ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے صرف ظالم آقا کو گالیاں دینا ہی ذریعۂ نجات سمجھتا ہے

ہاں اسلامزم کے متعلق آپ نے لائڈ جارج کا جو فقرہ نقل کیا ہے اس سے آپ کا یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ واقعی اس مفروضہ خطرہ سے خائف ہے (معاف فرمائیے) انگریزی ذہنیت اور ڈپلومیسی سے آپ کے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ پہاڑ کو رائی بنا دینے کے لئے وہ کیونکر پہلے رائی کو پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ ورنہ لائڈ جارج اس قدر احمق نہیں

ہو سکتا کہ اپنی قوت کے مقابلہ میں ہمارے ضعف کو محسوس نہ کر سکے۔ پان اسلامزم "بالقوۃ" یقیناً نہایت خطرناک چیز ہو اور اسی لحاظ ست لائڈ جارج نے یورپ کو اس سے متنبہ کیا لیکن جہاں تک "بالارادہ" کا واسطہ ہے، وہ اور سارا یوروپ اب اسی طرح مطمئن ہے جسطرح ہم آپ مایوس۔ ہماری عملی قوت کا امتحان کافی ہو چکا ہے، اب خواہ مخواہ کے "تیوروں" سے کچھ نہیں ہوتا، بندر نچانے والا جانتا ہے کہ جب تک ہاتھ میں ڈنڈا موجود ہے بندر کو ناچنے سے مفر نہیں، اور اس لئے وہ بندر کی "بھبکیوں" کی بھی پروا نہیں کرتا اور جب چاہتا ہے گردن کی رسی کو جنبش دیکر اپنی قوت کو تسلیم کرا لیتا ہے۔

نیاز

الاحتجاج والاعتذار

مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے اگست کے نگار میں مجھ پر تین ظلم کئے ہیں۔ دو کی شکایت تو میں ان سے پرائیوٹ طور پر کر چکا ہوں ایک تو میرے مضمون مذہب اور الہیات سے متعلق ہر جس کا زیادہ حصہ سہواً یا ارادتاً حذف ہونے کے بعد تمام سلسلہ مضمون خبط و بے ربط ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ مضمون مذہب اور نبوت میں کتابت کی نہایت فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں جو کاتب نبوت کو ثبوت، اور قباحت کو قیامت یا مغز کو فخر لکھے۔ میں اس کاتب کی جان کو روؤں یا سنگی طباعت کو یا اردو کے طرز تحریر کو بہرصورت مولانا نیاز اگر ایک نظر کاپی کو دیکھ لیتے تو یقیناً بہت کچھ اصلاح کتابی غلطیوں کی ہو جاتی خیر۔ تیسری بڑی شکایت مجھے ان کے "محاکمہ" سے ہے۔ اور اس کے متعلق میں پبلک طور سے پراٹسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالہ کی آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دیدیں۔ اگر احتجاج کا مفہوم پراٹسٹ سے ادا ہو سکتا ہو (جو خود اہل زبان نہیں سمجھتے ہیں) تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں محبت سے زیادہ اپنی معذوریوں پر نگاہ رکھ کر شکایت کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولانا نیاز نے اپنے محاکمہ میں بہت عجلت اور بے تابی سے کام لیا۔ اگر وہ تھوڑا اور انتظار کرتے تو آئندہ چلکر "مذہب اور عبادات" کے عنوان سے جو مضمون ہوتا اس سے ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں یا اگر وہ مذہب اور قومیت کے مضمون کو ذرا اور غور سے پڑھتے تو ان کا وہ اعتراض جو انہوں نے کیا ہے خود بخود اٹھ جاتا۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل ہوں کہ مذہب کا ایک مقصود ہئیت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے۔ اور مجھے خیال نہیں پڑتا کہ میں نے اس مضمون میں عبادات و معاملات میں کوئی تاویل کی ہو۔ میرے مضمون کے تنقیح طلب دو مسئلے تھے۔ آیا اسلام قومی مذہب ہے یا عمومی۔ دوسرے یہ کہ قرآن اسلام کے لئے کافی ہے یا نہیں، اگر وہ ان دو تنقیح طلب مسئلوں پر محاکمہ کرتے تو میں اس کو سر آنکھوں پر رکھتا مگر اصل تنقیح طلب مسائل کو چھوڑ کر صرف سلسلہ گفتگو میں نماز و ارکان پر جو میں نے کچھ کلام کیا اس کی انہوں نے گرفت کر لی۔ اور اسپر دو تین ورق سیاہ کر ڈالے شاید وہ ان حضرات کے خاطر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہوں جنہوں نے مجھ پر سب و شتم کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہوگی بلکہ خود مولانا

نیاز کے بائیکاٹ کا نوٹس دیا ہو۔ مگر میں مولانا کو کم سے کم اپنی ذات سے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ للّٰہیت کی بنا پر اگر سب و شتم کیا بھی جائے تو میں اس کے سُننے کے لئے بھی تیار ہوں اور جو حضرات اس کے لئے بیتاب ہوں ان کے لئے مضمون کے آخر میں میں نے اپنا پورا پتہ دیدیا ہے کہ وہ خود براہ راست مجھکو گالیاں دے لیں اور مولانا نیاز کو مجھ تک پہونچانے کی تکلیف دیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو حضرات اس بات کے خوگر ہیں وہ اس کے جواز کے لئے حضرت عباس عم رسول اللہ کا جناب علی کرم اللہ وجہہ کو خاطی الغادر الخائن کہنا یا عبد اللہ ابن زبیر اور ابن عباس کی مسئلہ متعہ پر تہتک جس کا ذکر صحاح ستہ میں بھی ہے مثالاً پیش کرینگے اور جوش مذہبی اور للّٰہیت میں تو جناب موسیٰ نے حضرت ہارون کی داڑھی کھینچ لی تھی اور توریت کی الواح کو اٹھا کر پھینک دیا تھا

مولانا نیاز نے مجھے خواہ مخواہ فقہی مسائل میں گھسیٹ لیا۔ حالانکہ نہ میں اس کا اہل تھا اور نہ میں قرآن سے باہر ضحاک و کعب احبار کی پرواہ کرتا ہوں۔ مگر اس معاملے میں مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے ایک ابتدائی غلطی ضرور ہوئی اور یہ کہ مذہب اور قومیت کا مضمون وہیں ختم کر دینا چاہیئے تھا جہاں تک جون کے پرچے میں چھپ چکا تھا۔ اور بقیہ حصہ جو جولائی کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔ وہ درحقیقت مضمون کے سلسلہ میں نہ تھا۔ بلکہ آخر میں ایک نوٹ تھا جو باریک حرفوں میں نیچے لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اور چونکہ وہ نوٹ نہایت سرسری طور سے لکھا گیا تھا۔ میں نے مسائل حدیث اور فقہ کو قرآن سے زائد دکھلانے کے قصد سے ریمارک میں اتنا بڑھا دیا تھا کہ چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لہذا لغو ہے، یہ ایک ایسی چنگاری تھی جس نے مسلمانوں کے دل و جگر میں ایک آگ لگا دی میرا خیال تھا کہ جب میں دوسری کتاب تنزیل القرآن لکھونگا تو اس میں ہر ایک مسئلہ اعتقادی اور اعمالی پر جو قرآن سے باہر حدیث میں ہے اس کی لغویت کی حیثیت سے ثابت کرتا اور دکھلاتا کہ ایسی تمام حدیثیں موضوعات اور اسرائیلیات ہیں، مگر میں نے جوش میں اس نوٹ کو لکھ ڈالا اور اس کو میں اب واپس لینے کیلئے تیار ہوں، اس لئے کہ میں ابھی اس مسئلے کی پوری منصفی کے قابل نہیں ہوا۔ ہاں میرا بے شک اب بھی یہی قول ہے کہ نماز اگر دنیادی مشاغل کی انہماک میں ادا کی جائے تو اس سے بہتر ہے کہ نماز کو ترک کر دیا جائے، کیونکہ جو نماز یکسوئی اور حضور قلب سے نہ پڑھی جائے وہ نماز ایک قسم کا تمسخر ہے۔ محض منہ سے چند الفاظ کو بڑبڑا لینا اور چند بار اٹھک بیٹھک کر لینا نماز کا مقصد نہیں۔ لیکن اس قسم کی نماز ہمیشہ اسیوقت عادتاً کی جائیگی جو اوقات قرآن سے باہر ہے یکسوئی اور حضور قلب کا سب سے بہتر وقت وہ ہے جب کہ آدمی صبح اٹھتا ہے اور جب راتکو وہ آرام کرنے جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے گھر آتا ہے۔ قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا و من اٰناء اللیل اس وقت اگر کوئی خدا کی طرف منہ نہ کرے تو نہایت بدبخت ہے۔ ہاں یوم جمعہ کو اگر مسلمان اسلامی سلطنت میں ہو جہاں اس کو اس روز چھٹی مل جاتی ہے تو اس روز جمعہ کی نماز دوپہر کو باجماعت پڑھنا فرض ہے۔ یہ ہے قرآن کا حکم۔ میں یہی کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں سوائے ان تین موزوں اور فطری اوقات کے اور کسی وقت کی نماز ثابت نہیں۔

حتیٰ کہ صاحب ہدایہ کو جب پانچ وقت کی نماز ثابت کرنی پڑی تو انہوں نے مجبور ہو کر "فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تظھرون" کی تاویل کی مگر شاید صاحب ہدایہ اپنے دل میں کبھی خود اپنی تاویل سے مطمئن نہ ہوئے ہوں گے، مولانا عبد القادر، اور ان کی تقلید میں مولوی نذیر احمد دہلوی نے "اطراف النہار" سے دو پہر کے معنے لئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اطراف النہار کے معنے دن کے تگ بھگ کئے ہیں۔ لیکن اگر وہ کشاف اور بیضاوی کی تفسیر دیکھیں تو اطراف النہار کے معنے محض صبح اور شام کے وقت کے ہیں اور یہ ہی اصطلاح عرب کی ہے۔ عرب کو میں نے کبھی اطراف النہار سے ظہر مراد لیتے ہوئے نہیں سنا۔ "دلوک الشمس الیٰ غسق اللیل" محض قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا کی تفسیر ہے اور جنہوں نے اس سے پانچ وقت کی نماز کی تاویل کی ہے وہ مولانا محمد علی احمدی صاحب ہیں ظاہر ہے کہ ان کے وہم کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ پھر اگر آپ قرآن کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اس آیت سے پتہ چل جائیگا کہ ظہر کی نماز کو فرض کرنے کا خیال ہی قرآن حکیم کو نہ تھا یعنی جو آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دوسروں کے خلوت میں جانے سے پہلے فلاں اوقات میں اذن لے لیا کرو۔ ایک وقت کا ذکر اس میں اس طرح ہے کہ بعد صلوٰۃ العشا مگر دوسرے وقت میں محض ظہیرہ یعنی دوپہر کے وقت۔ اگر ظہر کی نماز قرآن سے ثابت ہوتی تو جس طرح صلوٰۃ العشا کہا گیا ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ الظہر کہہ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھی جاتی۔ کیوں۔؟

اب آپ روایات پر آئے۔ اسد الغابہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں۔ مگر میں اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے کہتا ہوں کہ اسد الغابہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت دو نمازیں صبح ورات کی ادا کرتے تھے اور یہی فرض ہیں، بعد ہجرت نماز وسطےٰ یا نماز عصر فرض ہوئی۔ خود وسطےٰ کے معنی یہ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ تین کے بیچ میں ہے اور تین کے بیچ کو ہی وسطےٰ کہتے ہیں یعنی اول اور آخر در وسطے۔ مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے ظہر و عصر اور مغرب اور عشا کو بلا عذر و بلا خوف و بلا سفر جمع کیا ہے۔ نسائی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تعجب سے کہتا ہے کہ یہ ہی ایک سنت ہے جو ہمارے زمانے میں لوگوں نے ترک کر دی ہے اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے بلا عذر کیوں جمع کیں میرے نزدیک تو اس کی سیدھی سادھی تاویل یہ ہے کہ آپ نے تین وقت کی نمازیں ادا کیں اور آپ نے وقفہ دیکر نمازیں پڑھیں راوی نے اس کو دو وقت کی نماز سمجھ لی۔ اب اگر آپ حدیث پڑھیں تو عصر و ظہر کے اوقات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ذرا غور کرنے سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ عصر و ظہر کو ایک ہی وقت سمجھا جاتا تھا۔ یہ حدیث کہ آنحضرت پر شب معراج میں پچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس حدیث کو میں قطعی موضوع سمجھتا ہوں اور اگر موضوع نہیں ہے تو مرفوع ضرور ہے۔ اس واسطے کہ اس کے راوی انس ہیں اور انس کی عمر آنحضرت کے وفات کے وقت انیس برس کی تھی۔ اور آنحضرت کو معراج اس وقت ہوئی ہے۔ جبکہ انس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ اور ابوہریرہ اور ابن عباس کا تو اس وقت پتہ بھی نہ تھا۔ یہ روایت اگر ابوبکر صدیق یا حضرت علی کی ہوتی۔ تو اور بات تھی علاوہ اس کے اگر معراج

کا یہ واقعہ صحیح ہوتا تو قرآن کے سورۂ معراج یا بنی اسرائیل میں اس کا ذکر ضرور ہوتا مگر وہاں ہم کیا پاتے ہیں" اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر" میں کہتا ہوں کہ معراج آسمانی خود ایک معارضہ ہے ورنہ نماز کی تعین اس بھونڈے طریقہ سے اللہ میاں کے ہاں ہو جیسے نعوذ باللہ وہ بنئے کا سودا تھا۔

اب اجماع امت کا سوال باقی رہ گیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر اس کے متعلق میں کچھ کہونگا تو وہ ہوٹسما (Houtsma) گولڈزیہر (Goldziher) اور ولہاسن (Wellhausen) کی تحقیق کا نتیجہ ہوگا اور لوگ مجھے مقلد فرنگ سے مطعون کریں گے۔ مگر دل کی بات ہی کہتا ہوں۔

تمام سامی مذاہب میں انھیں تین اوقات کی نماز فرض تھی اور قرآن کا تعین اوقات کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ بہت سے ارکان جو ہمارے یہاں فرائض میں داخل ہیں وہ یہودیوں کی کتاب تالمود میں ملتے ہیں مجوسیوں میں نماز کے پانچ وقت ہیں جو نماز پنجگانہ کہلاتی ہیں (نماز اصل عجمی لفظ ہے اور نمستے کا سنسکرت لفظ اسی لفظ سے نکلا ہے) قرن اولی کے مسلمانوں پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب کہ انھوں نے عرب سے نکلنے کے بعد اپنے ماتحت قوموں یعنی ذمیوں کے مذہب اور عبادات کا موازنہ اپنے مذہب سے کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں کو شدت سے جوش مذہبی تھا وہ یہ نہ گوارا کرتے تھے کہ وہ مذہبی غلو اور تشدد میں ذمی قوموں سے کم رہیں۔ اس لئے جب یہودیوں کے ہاں انھوں نے رجم زانیہ اور ساحرہ اور مرتد دیکھا تو انھوں نے خیال کیا کہ قرآن کا اس بارے میں سکوت کہیں ان کو دوسرے مذاہب کے آگے خفیف نہ کرے۔ انھوں نے فوراً یہ ہی احکام اپنے ہاں لے لئے۔ حتیٰ کہ رجم زانی میں تو انھوں نے قرآن کے منحرف ہونے کا دعویٰ ہی کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے جب مسیحی راہبوں کو ہر وقت نماز پڑھتے دیکھا اور (مجوسیوں) کو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو حوصلہ ہوا کہ تین وقت کی مختصر نماز قرآن سے بڑھکر ذمی قوموں کو نماز دکھلانی چاہئے اسی زمانے میں ایک فرقہ عرب میں عراق کی سرحد پر پیدا ہوا جس نے اپنے اوپر پچاس وقت کی نماز فرض کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے کھیت جوتنا چھوڑ دیا۔ مزدوروں نے کام کرنا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ابتری پھیل گئی۔ اسپر خلیفہ نے اس فرقے پر فوجکشی کی اور ان کو منتشر کر دیا۔ مفسرین اور محدثین عموماً عجمی ہیں مشکل سے ایک فیصدی اس میں عرب تھے، وہ لوگ اور خود امام ابو حنیفہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہوکر مجوسیوں سے بھی نماز کم رکھیں اور انھوں نے اسکے لئے حدیثیں وضع کیں اور مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز لا ڈالی۔ میں نے یہ مختصراً لکھا ہے۔ شائقین اس کی تحقیق کے لئے (　　　　　) کا مطالعہ کریں۔

ارکان نماز میں میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ کیوں نہ یورپ کا ابو حنیفہ نماز کو ان کی عادت کے مطابق اجتہاد کرے جبکہ قرآن ارکان وتعدیل سے خاموش ہے اس جملے سے میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمام مسلمان اپنے طریقۂ عبادت کو بدل دیں۔

لیکن جب ارکان وتعدیل میں خود حنفی و مالکی جعفری وغیرہ وغیرہ میں اس قدر اختلاف ہے اور پھر صاحب فراش مریض

اور سوار کی نماز میں ارکان وتعدیل پر تشدد نہیں اور حالت جنگ کی نماز کی اور صورت پیدا کی گئی تو اگر میں نے اوپر کا یہ جملہ لکھ دیا تو (بقول اکبر) ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے۔ وضو کے متعلق تو ابن عباس نے بھی یہی کیا ہے اور تعجب ہے کہ میں قرآن سے مسح پاتا ہوں مگر مسلمانوں کا عمل پیر دھونے کا ہے۔

مولانا نیاز نصاب زکوٰۃ کے باتعیین ہونے پر مجھ سے معترض ہیں۔ میں ان سے یہی کہونگا کہ وہ قرآن کو پڑھیں اور بغور اسکا حکم دیکھیں۔ کیا قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ لوگ تم سے پوچھتے کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدو کہ جس قدر ہو سکے۔ اسلامی سلطنت میں تعین زکوٰۃ کی مصلحت خواہ کچھ ہو مگر یہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص اس سے زیادہ صدقہ وخیرات کر سکتا ہے جتنا فقہا کے نصاب میں ہے۔ مگر اس کو ایسا کرنے پر منحرف اسلام سمجھا جائے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سارا نصاب زکوٰۃ اور عشر (جو کہیں بھی قرآن میں نہیں آیا) وہ سب ہم کو یہودیوں کی "فارملزم" سے ترکہ میں آیا ہے۔ اور میں فارملزم کو قومی مذہب کے لئے جائز سمجھتا ہوں مگر عمومی مذہب کے لئے لغو ولایعنی کیونکہ اس طرح مذہب صرف چند حرکات جسمانی کا نام ہو جاتا ہے

آخر میں کچھ میں اپنے ذات کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ ابتدا میں مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کے درس میں جب کہ میری عمر ۱۰ برس کی تھی شامل ہوا۔ وہ اس وقت مسجد اٹالہ جونپور میں معلم تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ابتدائی اور منتہی طالب علموں کو بلا لحاظ ان کی علمیت اور قابلیت کے صبح کے وقت سب کو اپنے گرد ایک حلقہ میں جمع کرتے تھے ہر ایک کے ہاتھ میں قرآن ہوتا اور ایک قرآن ان کے سامنے کھلا ہوتا تھا۔ ایک طالب علم باآواز بلند قرآن کی ایک آیت پڑھتا تھا۔ اس کے بعد مولانا اس کے معنی اور تفسیر عام فہم عبارت میں بیان کرتے۔ میں نے بھی ان کے اس طریقہ سے فائدہ اٹھایا اور قرآن کی یہ چنگاری میرے دل ایسے وقت ڈالی گئی کہ اگر مسلمان مجھے مار بھی ڈالیں کہ تم قرآن روایات سے سمجھا دو تو مجھ سے یہ ممکن نہیں۔

۴۔ سول لائن۔ میرٹھ — سید مقبول احمد (بی اے)

(**نگار**) مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری رائے پر یہ "اعتذار و احتجاج" تحریر فرمایا اور آپ کا جو مدعا تھا اُسے زیادہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ "فلسفۂ مذہب" کے سلسلہ میں آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہے اور میں اس مضمون کو آپ کی دینی خدمت سمجھتا ہوں، لیکن اگر کہیں کہیں مجھے آپ سے اختلاف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ آپ کو اُسے صحیح سمجھنے پر مجبور کر دوں جس طرح آپ سے میرا اتفاق کرنا ہر مسئلہ میں اور لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتا آپ نے "مذہب و قومیت" کے سلسلہ میں فقہی مسائل کو چھیڑنے میں جس عجلت سے کام لیا اس کا اقتضا تھا کہ میں بھی قبل از وقت اپنی رائے کا اظہار کرتا، لیکن آپ کے اس "اعتذار و احتجاج" پر اپنی رائے ظاہر کرنے میں جلدی سے کام نہ لونگا کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوقات نماز کے متعلق اسی اشاعت میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اُسے ملاحظہ فرمائیے۔

نیاز

باب الاستفسار

نماز پنجگانہ ہے یا سہ گانہ

(جناب سید محمد اطہر صاحب۔ خیرپور)

آپ نے اگست کے رسالہ میں سید مقبول احمد صاحب کے مضمون فلسفۂ مذہب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اوقات نماز کے متعلق بہت مجمل سی بات لکھی ہے نہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیئے یا تین وقت کی، ہرچند آپ کا رجحان یہی ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیئے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس باب میں تفصیل سے اپنی رائے دیں گے۔

(نگار) اوقاتِ نماز کے متعلق نص قطعی یا کلام مجید کا جو حکم ہے وہ نہایت صاف و صریح ہے اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یعنی قرآن سے صرف تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔

سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے:۔

" واقم الصلوٰۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل " (یعنی نماز ادا کرو دن کے دونوں کناروں میں اور کچھ رات گئے) اس آیت میں " طرفی النہار " کے معنی میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا، کیونکہ جس طرح طرف کے معنی کنارہ اور حد اخیر کے ہیں اسی طرح وہ حصہ کے معنے میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف تعداد اوقات پر موثر نہیں ہوتا اور اس آیت سے تین ہی وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ دوسری آیت سورۂ بنی اسرائیل میں یہ ہے:۔

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل و قرآن الفجر۔ ان قرآن الفجر کان مشہودا و من اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک

اس آیت میں " لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل " کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ " نماز ادا کرو" آفتاب ڈھلنے کے وقت سے آغاز شب تک۔ لیکن یہ ترجمہ میرے نزدیک صحیح نہیں، کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ زوال آفتاب سے آغاز شب تک برابر نماز پڑھتے رہو حالانکہ یہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے کہ:۔ نماز ادا کرو زوال آفتاب کی شام تک۔ یعنی دوپہر ڈھلنے کے بعد ایک نماز پڑھنا چاہیئے، جس کا وقت غروب آفتاب تک ہے۔ اور دوسری نماز صبح کی ادا کرو اور تیسری رات کی۔ الغرض اس آیت سے بھی تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے جن میں سے دو وقت کی تو بالکل صراحت ہے۔ فجر اور عشاء علاوہ ان آیات کے سورۂ نور کی ایک اور آیت سے نہایت صریح طور پر ان دو وقتوں کی تعیین ہوتی ہے۔ رسول اللہ کے اوقات خلوت کا تعین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

یاایہا الذین آمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات۔

من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء الخ

اس آیت میں نماز فجر اور عشاء کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور اس لئے اب بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ تیسری نماز جسے "صلوٰۃ وسطےٰ" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور جو" لدلوك الشمس الیٰ غسق اللیل" سے بھی ظاہر کی گئی ہے اور جو" طرفی النھار" میں بھی موجود ہے کونسی ہوسکتی ہے اور کس وقت تک اس کو ادا کرنا چاہئے۔ سو وہ میرے نزدیک صرف نماز عصر ہوسکتی ہے کیونکہ یہی ایک نماز ہے جو نہار کا ایک طرف بھی ہوسکتی ہے اور جو غروب آفتاب تک ادا کئے جا سکنے کے لحاظ سے " الی غسق اللیل " کی صراحت کو بھی بیکار نہیں جانے دیتی۔

اب رہا یہ امر کہ پانچ وقت کی نماز کیوں اور کب رائج ہوئی یہ بیشک ذرا دشوار امر ہے۔ صحاح ستہ کی دو حدیثیں ایسی ہیں جو صراحتہً نماز کے پنجگانہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث وہ جو بہ سلسلۂ معراج پچاس وقت کی نماز کو پانچ وقت تک گھٹا دینے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری وہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جبریل آئے اور رسول اللہ کے سامنے پانچ وقت کی نماز ادا کی جس کا تتبع ہمیشہ رسول اللہ نے کیا۔ روایتاً ان دونوں حدیثوں میں کوئی سقم ہو یا نہ ہو لیکن درایتاً ناقابل قبول ہیں علی الخصوص اس وقت جبکہ بعض حدیثیں ان کی معارض ہیں۔ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے بحالت قیام دن میں صرف تین وقت کی نماز ادا کی دوسری روایت

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو دو نمازیں ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ الغرض یہ امر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تعین اوقات ہوگئی تھی، کبھی آپ نے پانچ مرتبہ ادا کی اور کبھی صرف تین مرتبہ البتہ اس کے بعد جب شریعت منضبط ہوئی اور قانون مرتب ہوئے تو پانچ نمازیں فرض مقرر کی گئیں جن کے اوقات حنفیوں کے نزدیک پانچ اور شیعوں کے نزدیک تین ہیں یعنی نمازیں تو ان کے ہاں بھی وہی پانچ ہیں لیکن دو کو وہ ملا کر پڑھتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جسے داخل ایمان و اسلام سمجھ لیا جائے اور نہ اس پر زیادہ اعتنا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز علٰحدہ علٰحدہ اوقات میں پڑھتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے میں بھی کلام نہیں اور جو ظہرین و مغربین پڑھتا ہے وہ بھی یقیناً مسلم ہے۔ میں نے سید مقبول احمد صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے جو خیال ظاہر کیا تھا اس کا مدعا یہی تھا کہ ایسے مسائل میں اختلاف و تنقید کی زیادہ ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس کی کوئی تاویل کسی قوم کی عادات و مشاغل کے خصوصیات کو پیش نظر رکھکر نہ کرنا چاہئے کہ اس طرح ہمیشہ کے لئے تاویل کا دروازہ کھل جائیگا اور کبھی کسی مسئلۂ شرعی کی تعیین نہ ہوسکے گی۔

قرآنی پردہ

(جناب سید مقبول احمد صاحب بی اے۔ میرٹھ)

پردہ کے متعلق آپ کا نوٹ مجھے بھی متعجب کرنے والا تھا مگر جب میں نے فلسفۂ مذہب پر آپ کے نوٹ کو پڑھ لیا تو خاموش ہو رہا

خدا نہ کرے کہ آپ قرآن سے اس بدنما برقع کو ثابت کریں جو ہماری عورتوں کو عجوبۂ زمان بنا دیتا ہو ۔ ورنہ پھر خدا کا حکم "یغضون ابصارھم" کی ضرورت ہی باقی نہ رہیگی کیونکہ اس خوفناک ہستی کو دیکھ کر خود آدمی کراہت سے اپنی نظر نیچی کریگا۔ مولانا عبدالماجد صاحب کا جو قول ہو وہ غالباً ہدایہ کا مشہور مسئلہ ہو اور ابوحنیفہ کی رائے تو یہی ہو کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ۔ اس کے علاوہ مسلم میں سب سے واضح حدیث پردہ کے خلاف یہ ہو کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو عیدین میں نکالا اور مسلمانوں کو اپنی بیویاں بیٹیاں نکالنے کا حکم دیا اس کے علاوہ مواعظ نبوی میں عورتیں مساجد میں جمع ہوتی تھیں اور آپ نے ان کو مخاطب کرکے کلام کیا۔

(**نگار**) اس وقت تک پردہ کے متعلق اور عبدالماجد صاحب دریابادی کے مضمون کے خلاف جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ صرف یہ ہو کہ :۔

(۱) میرے نزدیک کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتا ہو اور عبدالماجد صاحب کے نزدیک نہیں

(۲) پردہ کا میں مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ کلام مجید اس کا مخالف ہو بلکہ اس بنا پر کہ موجودہ ضروریات زمانہ و تمدن کا اقتضا یہی ہو۔ اب آپ اگر اس کی مخالفت میں یہ فرمائیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں عورتیں باہر نکلتی تھیں، مساجد میں جاتی تھیں مواعظ نبوی میں شرکت کرتی تھیں، تو اس سے میرا قول رد نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں کے باہر نکلنے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ ممکن ہو کہ وہ نکلتی ہوں لیکن چہرہ کو چھپا کر اور گھونگھٹ کی اوٹ کرکے ۔ عورت کا چہرہ چھپانا علیحدہ امر ہے اور گھر سے باہر نکلنا دوسرا امر آپ ان دونوں کو کیوں ملا دیتے ہیں۔ رہا موجودہ برقعہ اور اس کی بدنمائی، سو یہ بھی بالکل خارج از بحث امر ہے اگر آپ کے نزدیک ہندوستان و مصر ایران و ترکی کا کوئی برقعہ ایسا نہیں ہو جو بدنمائی سے بچ سکے تو آپ کو اختیار حاصل ہو کہ کوئی اور حسین و جمیل اختراع کرکے عورت کے چھپے ہوئے چہرہ کا بدل پیش کیجئے اور لوگوں کی دعوتِ نظر کا سامان پیدا کیجئے، کون منع کرتا ہے ۔ لیکن اس کو اصل مسئلہ کیساتھ ملا کر مغالطہ نہ پیدا کیجئے۔

اب میں پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ابوحنیفہ چہرہ کو کھلا رکھنے کے قایل ہوں یا نہ ہوں، حدیثوں میں خواہ کچھ ہو میں ان سے بحث نہیں کرتا، میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کلام مجید میں ضرور چہرہ چھپانے کا حکم موجود ہو۔

اگست کے ملاحظات میں، عبدالماجد صاحب کی رائے کے خلاف میں نے مختصراً ظاہر کیا تھا کہ "یدنین علیھن من جلابیبھن" سے چہرہ پر نقاب ڈالنے کا حکم صراحتہً ثابت ہوتا ہو۔ اور آج بھی یہی کہتا ہوں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس باب میں میری مخالفت کرے تو اس کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ احادیث کا حوالہ دے یا قول ابوحنیفہ سے تمسک کرے بلکہ اس کو چاہئے کہ کلام مجید ہی سے میری غلطی کو ظاہر کرے ۔ افسوس ہو کہ آپ نے بھی یہ نہیں کیا اور اسی قسم کا جواب دیا جو میرے استدلال کو کسی طرح رد نہیں کر سکتا۔

کلام مجید کی اس آیت میں لفظ " جلباب " کا آیا ہے جس کے معنے اگر آپ نقاب کے نہیں تو کم از کم اوڑھنی یا سر کی چادر کے تو ضرور لیں گے جسے عربی میں خمار کہتے ہیں۔ اچھا اب خمار کے متعلق بھی ملاحظہ کیجئے کہ سورۂ نور کے چوتھے رکوع میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔" قل للمومنات یغضضن من ابصارھن .... ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن الخ

اس آیت میں تین باتوں کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ راستہ چلنے میں اپنی نگاہ نیچی رکھیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر وہ حصہ جو مجبوراً ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں سر سے گریبان تک لٹکا لیا کریں۔

پہلا حکم نگاہ نیچی کرنے کا اس لئے ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر محرم عورتوں کا دیکھنا درست نہیں اسی طرح عورتوں کو بھی چاہئے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھیں، دوسرا حکم زینت کے چھپانے کا ہے مگر وہ حصہ زینت کا مستثنےٰ کر دیا گیا ہے جس کا چلنے میں ظاہر ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ "الا ما ظھر منھا" سے استثنا زینت کا کیا گیا ہے نہ کہ کسی عضو یا حصۂ جسم کا، مقصود یہ ہے کہ بناؤ سنگھار نہ دکھائیں مگر اس قدر جس کا چلنے میں ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے، خواہ وہ ہاتھ پاؤں کا زیور ہو، قامت کا حسن ہو، یا وضع و لباس کی چھب ہو اس استثنا سے چہرہ یا ہاتھ پاؤں کی بحث پیدا کرنا ہی میرے نزدیک بالکل خلاف اصول ہے۔

سورہ نور کی اس آیت میں الفاظ " و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن " خاص طور پر قابل غور ہیں۔ خمر، جمع ہے خمار کی اور خمار عربی زبان میں اس چادر یا اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر پر ڈالی جاتی ہے۔ اوڑھنی اوڑھنے کا عام اور فطری طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پشت سے اس کو لا کر سر پر ڈال لیا جائے نہ یہ کہ چہرہ کی طرف سے اُسے لایا جائے اور پیٹھ کو ننگا کر دیا جائے۔ پھر جب اوڑھنی اوڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ پیٹھ کی طرف سے لا کر اسے سر پر ڈالا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کے لٹکانے کا حکم اگر ہو سکتا ہے تو صرف چہرہ ہی کی طرف جو کھلا ہوا تھا نہ کہ پیٹھ جو پہلے ہی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ علاوہ اس کے اگر جیوبھن (گریبانوں) سے مراد موجودہ فراک کا وہ گریبان نہیں ہے جو پشت کی طرف ہوتا ہے اور جسے عام طور سے انگریزوں کے بچے استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قمیص کا گریبان ہے تو یہ امر آپ سے بھی مخفی نہ ہوگا کہ وہ گریبان آگے ہی کی طرف ہوتا ہے اور جب اوڑھنی وہاں تک لٹکائی جائیگی تو چہرہ خواہ مخواہ چھپ جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ چہرہ کو کھلا رکھتے ہوئے صرف اوڑھنی کا آنچل گریبان اور سینہ تک لیجاؤ تو اس کی تردید سورۂ احزاب کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں الفاظ " یدنین علیھن من جلابیبھن " استعمال کئے گئے ہیں اور جن میں " یدنین " کا لفظ لٹکانے کے مفہوم میں صراحتہً موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ پردہ کا مقصود صرف مرد و عورت کے باہم اختلاط یا اس کے محرکات کو روکنا ہے کہ اس میں اندیشہ فساد اخلاق کا ہے اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ عورت ہو یا مرد اس کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جس کو دیکھنے کے بعد جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، اس لئے اوڑھنی سے اگر کسی حصۂ جسم کے چھپانے کا حکم ہو سکتا تھا تو اسی حصہ کا جو سب سے زیادہ باعث فتنہ و فساد ہے، نہ کہ گریبان یا پشت یا ہاتھ پاؤں وغیرہ جن پر مرد کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ چہرہ کو داخل ستر کرنے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت بیکار تھی کیونکہ اس صورت میں وہ راستہ کیونکر طے کر سکتی تھیں تو اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثر ہندو عورتیں باہر گھونگھٹ ہی کرکے نکلتی ہیں اور تمام کام انجام دیتی ہیں۔ یا اگر موجودہ چار شف ہی کو لے لیا جائے جس میں صرف ایک ہلکا سا ریشمی نقاب چہرہ پر پڑا رہتا ہے تو بہت کچھ عورت کی جیب بھی ظاہر ہو سکتی ہے، جس کے چھپانے پر آپ راضی نہیں اور "یدنین علیھن من جلابیھن" کی بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو بحث ہوئی حصۂ اول سے۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ میں کلام مجید میں یہ احکام تسلیم کرتے ہوئے کیوں اس وقت پردہ کا مخالف ہوں، اس کے متعلق میں ایک سے زائد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور اس پر آپ کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو کرنا بے محل ہے۔

نیاز

اعتراف

اپنی سلمیٰ کے حضور میں!

زندہ ہوں، تیرے لئے اے رشکِ مہر و ماہ! میں!!
آج کرتا ہوں، تجھے اس راز سے آگاہ! میں!!

(پنڈت میلارام وفا)

لو! آؤ کہ رازِ نہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں! دامانِ زبانِ خموشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں!
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں!
اظہار کی جراٴت کرتا ہوں!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

راتوں کو مرے رونیکا سماں بیدار ستارے دیکھتے ہیں! اور میری تڑپنے کا عالم، دنیا کے نظارے دیکھتے ہیں!
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں! نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں!
روتا ہوں! آہیں بھرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

فکر آبادِ دنیا میں مری، مسجودِ افکار ہو تم! شعرستانِ ہستی میں مری، معبودِ اشعار ہو تم!
میری پرستش زارِ دل میں، اک صنمِ شیریں کار ہو تم!
ہر دم تمہیں سجدے کرتا ہوں!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

تم چاند سے بڑھکر روشن ہو! زہرہ کی قسم تاروں کی قسم تم پھول سے بڑھکر رنگیں ہو! دنیا کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسین ہو! فطرت کی! فطرت کے نظاروں کی قسم

اور — اور میں تم پر مرتا ہوں!!

میں تم سے محبت کرتا ہوں!

اکثر راتوں کو تنہائی میں، جب تم یاد آجاتی ہو! میرے خیالوں کی لامحدود فضاؤں پر چھا جاتی ہو!

اور میری روح کی خلوت میں، نشتر سے برسا جاتی ہو!

رو رو کے سحر میں کرتا ہوں!

میں تم سے محبت کرتا ہوں!

میری غمگیں فریادوں کو، دنیا کی فضائیں جانتی ہیں! میری پُر سوزش آہوں کو جنگل کی ہوائیں جانتی ہیں

میرے طوفانی آنسوؤں کو، ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں!

پر تم سے کہتے ڈرتا ہوں!

میں تم سے محبت کرتا ہوں!

اس مکر کی دنیا میں کہ جہاں معیارِ صداقت کوئی نہیں! اشکوں سے بڑھ کر سچا، اور اظہار محبت کوئی نہیں!

روتا ہوں، تمہاری یاد میں گو رونے کی شہادت کوئی نہیں!

ہاں، تاروں کو شاہد کرتا ہوں!

میں تم سے محبت کرتا ہوں!

لو دیکھو چشمِ محزوں سے سیلاب در دبہاتا ہوں! ہاں، بربطِ دل سے سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں!

بتخانۂ ناز میں روحِ عجز و نیاز کے سجدے لٹاتا ہوں!

اور قدموں پہ سر دھرتا ہوں!!!

میں تم سے محبت کرتا ہوں!!!

اختر شیرانی

فردوسی شہزادی

سن اے فردوسی شہزادی ——— عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو کرنوں کے جھولے میں
گاتے گاتے اکتا جائے
دنیا کے افسانے سن کر
تیرا دل کھویا سا جائے
جب انسانوں کی محفل کا
منظر تجھکو یاد آ جائے
تیری ہنگامہ گر "فطرت"
تنہائی سے گھبرا جائے!

میرے گلشن میں آجانا ——— عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو؟ میرا گلشن
تیری جنت سے بھی پیارا
عشق کی لہریں ذوق کی موجیں
پریم کی نہریں پریت کے دریا
زریں پھولوں کی اک محفل
رنگیں کلیوں کی اک دنیا
پاک فضا ـ معصوم ہوائیں
حسن کی عصمت کا گہوارہ

عشق کی عظمت کا کاشانہ ——— عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو اس گلشن میں
گھوما کرتے تھے ہم دونوں
مستِ بادۂ الفت ہوکر
جھوما کرتے تھے ہم دونوں
پھر ان پاکیزہ کلیوں کو
چوما کرتے تھے ہم دونوں

وہ مل جل کر نغمے گانا ——— عہد وفا کو بھول نہ جانا

ان باتوں کا ذکر ہی اب کیا

خواب تھا — اور کیا خوابِ کی وقعت

ہاں — دیرِ قدس کی دیوی
ہے گر کچھ احساس محبت!
آ — کہ ترے قدموں میں لٹا دوں
ذوق کی رفعت شوق کی عظمت
باغ میں دیکھونگا تیرا رستہ
شام ہی سے اے لیلیٰ الفت

صبح سے پہلے ہی آ جانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

اس گلشن کے دروازے پر
اک خوش قسمت مالی ہوگا
دل میں ہوگا جوشِ محبت
ہاتھ میں ہوگا پریم کا گجرا
شرم سے جھک جائینگی آنکھیں
تونے گر الفت سے دیکھا
اٹھے گا دامن میں لیکر
پریم کا گجرا - نذرِ تمنا

خدمت کرنا دل نہ دکھانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو گجرا پہن چکے گی
وہ تیرے قدموں میں جھکے گا
تونے گر الفت سے پوچھا
وہ تجھ سے کچھ عرض کرے گا
ہاتھ بڑھا دینا شہزادی
وہ خوش ہو کر بوسہ دے گا

اس شوخی پر مت شرمانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

وہ مالی ہو پریمی تیرا
میں کیوں اس کا نام بتاؤں
ہاں جو کوئی "رنگین وعدہ" ہو
شاید! میں پھر کچھ نہ چھپاؤں
کہدوں - میں تیرا ہی روشن ہوں
اور وہی مالی بن جاؤں
تو جو نگاہِ ناز سے دیکھے
تیرے دامن میں چھپ جاؤں

ہنس دینا باتوں میں لگانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا (روشن صدیقی)

دین کے مبلغ

اک زمانہ تھا کہ یورپ میں مبلغ دیں کے　　وضع کرتے تھے مذاہب کے خطرناک اصول

لغو اقوال کو آیات خدا کہتے تھے　　نہ کوئی جنکی سند تھی نہ کوئی شانِ نزول

انکو تاویل مسائل میں جو حاصل تھا کمال　　طبقۂ خلق میں ہونے لگے اکثر مقبول

فرقہ بندی بھی کی اور تفرقہ اندازی بھی　　مخمصے اور بھی پیدا کئے دنیا میں فضول

قبضۂ دیں سے مراد ان کی تھی دنیا طلبی　　کہ کسی طور سے ملتی رہے دولت معقول

نذر آتش کیا لاکھوں کو نظر نے ان کی　　اور فتووں سے ہوئے ان کے ہزاروں مقتول

پھر حکومت کے ہر اک شعبہ میں رہبر بنکر　　بادشاہوں کی خوشامد کو بنایا معمول

دین کی طرح حکومت کو کیا زیر و زبر　　کیونکہ انہیں نہ فراست تھی، نہ دانش نہ اصول

دام تزویر میں انسانکو پھنسا رکھا تھا　　اور وہ قسمت ہی پہ کرتا رہا اسکو محمول

جب جہالت سے ہوئی فطرت انسان آزاد　　کر چکے تھے یہ خرافات طبیعت میں حلول

چشم انسانکو ہوئی راہ حقیقت کی تلاش　　بولے افراد کہ خود ساختہ ہیں دیں کے اصول

تنگ مذہب یہ عقائد ہیں عیاذ باللہ　　خواہ کچھ ہو مگر ہم ان کو کرینگے نہ قبول

ہاتھ میں واعظِ دین کے نہیں جنت کی کلید　　عرش سے اسکا جہاں میں نہیں ہوتا ہے نزول

آتش غیض و غضب دل میں ہوئی شعلہ فروز　　کیونکہ ہر شخص تھا ان نفس پرستوں سے ملول

حق و باطل میں جو ہونے لگی انسانکو تمیز

پھر کسی پر نہ ہوئی ان کی توجہ مبذول

محمود اسرائیلی

غزلیات

اثر رامپوری

گر بے نقاب حسن خود آرا کرے کوئی — دنیائے شوق کو تہ و بالا کرے کوئی

پھر دل میں ہے نظارۂ پیہم کی آرزو — پھر دل پہ بجلیاں سی گرایا کرے کوئی

رسوا کریں نہ میری نگاہیں مجھے خدا — دیکھوں میں جب کسی کو نہ دیکھا کرے کوئی

ہنستی ہے عقل بھی مری حال تباہ پر — پھنکتا ہو گھر کسی کا تماشا کرے کوئی

یکساں ہے اضطراب میں وصل و غم فراق — کس طرح چارۂ دل شیدا کرے کوئی

دیدار ہو اگر ترا ممکن تو بے خطر — سو عمر وقف تمنا کرے کوئی

بس اے ہجوم یاس اکہ دل میں تواں نہیں — تا کے امید وعدۂ فردا کرے کوئی

سویا ہوں گور میں ترے غم کو لئے ہوئے — ٹھوکر سے اپنی حشر نہ برپا کرے کوئی

پاس ادب سے جرأت اظہار گو نہ ہو — صورت ہو خود سوال تو پھر کیا کرے کوئی

دل میں ہو نور عشق تو سینہ ہو کوہ طور — رگ رگ میں دید برق تجلّے کرے کوئی

دنیائے آرزو میں نہ الجھل پڑے اثر
ہم کو نہ ایسے ناز سے دیکھا کرے کوئی

تبسم نظامی

عشق حقیقی غالب ہے عشق مجازی کون کرے — اپنی فطرت عالی ہے دنیا سازی کون کرے

عیسیٰ ہیں اور گردوں پر حسن ہے اور سو پردوں میں — الفت کے بیماروں کی چارہ سازی کون کرے

نکہت گل کی سرگوشی باد صبا کو بار نہیں — اب غمازی مشکل ہے اب غمازی کون کرے

طور اور ان کی جلوہ گری جلوہ گری اور چشم کلیم — تاب کی ساری باتیں ہیں ہرزہ تازی کون کرے

مفت کا میری آنکھوں کو رونا دھونا رہتا ہے — آنکھ میں ان کے لطف نہیں اشک نوازی کون کرے

بستی کی اس بستی میں کوئی خدا بھی بن جاتا — سب بندے ہی بندے ہیں بندہ نوازی کون کرے

ہائے تبسم وحشت نے رنگ ترنم چھین لیا
گلشن میں شاخ گل پر نغمہ طرازی کون کرے

حافظ غازیپوری

میری نظر میں ہے وہی حسن، طلسم خواب کا ۔۔۔ یاد ہے آج تک مجھے، دور ترے شباب کا
گرم رو صراط عشق، دیدۂ تر نچوڑ کر ۔۔۔ تشنگی الم بجھا، خوف نہ کر سراب کا
پھیل گیا فضا میں جو، صوت شکستہ کی طرح ۔۔۔ درد کی اک صدا ہے وہ، نغمہ نہیں رباب کا
چشم خمار آشنا، وقف تحیرات ہے ۔۔۔ جوش شباب حسن میں، کیف ہے اک شراب کا

حافظ درد آشنا، ختم کر اپنی داستاں
قابل اعتنا نہیں حال دل خراب کا

حسام کاکوروی

مے الفت کبھی بربادکن ہوش نہیں ۔۔۔ یہ وہ صہبا ہے جو منت کش مے نوش نہیں
اسپہ بگڑے ہوئے ہو ضبط فغاں نہ ہو سکا ۔۔۔ میں خطا کار سہی تم بھی خطا پوش نہیں
تم مجھے بھول چکے ہو تو مجھے کیا حاصل ۔۔۔ مجکو میرا ستم آرا - تو - فراموش نہیں
میری آنکھوں سے ترا جلوہ کبھی چھپ سکا ۔۔۔ حسن جو شئے ہے پس پردہ بھی روپوش نہیں
شوق خود شعلہ نوازی کا سزاوار تو ہو ۔۔۔ آتش حسن ضیا ریاش ہے روپوش نہیں
بزم میں آنے تو دو - شکر جفا کرنا ہے ۔۔۔ اور جو کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
خیر میخانہ کی لبریز ہیں جلوے لاکھوں ۔۔۔ کون قطرہ ہے کہ جو میکدہ بر دوش نہیں

للہ الحمد کہ دل سوز ابھی باقی ہے حسام
شمع تربت سر تربت ابھی خاموش نہیں

فرخ بنارسی

حسن محشر خیز جب بیداد پر مائل ہوا ۔۔۔ ذرہ ذرہ خاک عاشق کا ستمگر دل ہوا
دیکھنے کو یوں تو دیکھا بے نقابوں کو مگر ۔۔۔ چشم حیراں سے کوئی پوچھے کہ کیا حاصل ہوا
ذوق عصیاں اب زیادہ رنج محرومی نہ دے ۔۔۔ جس قدر حسن عمل تھا دفتر باطل ہوا
ضبط آئین محبت ہے محبت میں مگر ۔۔۔ اونتی ہی راحت ملی بیتاب جتنا دل ہوا

جو محیط عشق میں ڈوبا نہ اُبھرا حشر تک آشنا ساحل سے کب بیگانۂ ساحل ہوا
عام ہی جلوہ مگر انکو مجھی سے ہی حجاب شکر ہے ان کی نظریں میں بھی اس قابل ہوا

کام آئی ایک دن فرخ مری افتادگی ہو
ضعف سے راہ طلب میں ہر قدم منزل ہوا

جناب محمود علی خانصاحب محمود رئیس الہ آباد

دل کی سب راحتیں مٹتی ہیں تو مٹ جانے دو نقش الفت کو تو للٰلہ اُبھر آنے دو
حشر ہے، حشر، پلٹ آؤ شہیدان وفا کچھ ذرا اور انھیں آج تو شرمانے دو
خود نکل آئیگی ہر موج سے اک راہ فنا کشتیٔ عمر کو ساحل سے تو ٹکرانے دو
جوش الفت میں کٹی جاتی ہیں خود دل کی رگیں دھار تلوار کی مڑتی ہی تو مڑ جانے دو
اک مرا قتل ہی اور بعد میں انکی حیرت بزم غم کے ہیں یہی خلق میں افسانے دو
دیکھنا دیکھنا اس راہ سے جانا نہ ابھی شیشۂ دل کو مرے اور بھی بس جلنے دو

پتیاں پھولوں کی خود بھول نہیں گی محمود
ان کے ہاتھوں میں ذرا انکو بکھر جانے دو

اقتباسات علمیہ

اعادۂ شباب اس وقت تک یہ امر حقایق ثابتہ میں داخل تھا کہ ؎

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن عہد ماضی کے جس طرح اور بہت سے نظریے اب معرض بحث میں ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اور بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا انسان صرف یہ سوچتا رہتا ہے کہ خدا معلوم کس وقت موت آجائے اور یوروپ کا انسان ابھی تک قدرت کے فیصلۂ شیب ہی پر قانع نہیں۔ اور جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ بعض درخت سو سو بلکہ ہزار سال تک قایم رہتے ہیں، بعض حشرات آبی (مثلاً گھونگھا) دو دو سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ لیکن انسان جسے اشرف المخلوقات ہونے کا فخر حاصل ہے ۴۰ سال کی عمر سے ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور ساٹھ، ستر تک پہونچکر فنا ہوجاتا ہے تو اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور فطرت کے اس اصول کے خلاف ایک قسم کی بغاوت محسوس کرکے اس جستجو میں لگ جاتا ہے کہ بڑھاپے کی حقیقت معلوم کرے اور قدرت کا مقابلہ کرکے اپنی عمر طبعی کو بڑھائے۔

نگار کے صفحات میں اس سے قبل بارہا اعادۂ شباب کے نہ صرف امکان بلکہ اس کے وقوع کا ذکر آچکا ہے اور بعض غدود کے بدلدینے سے جو کامیابی یوروپ کے ڈاکٹروں نے حاصل کی ہے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حال میں ڈاکٹر کرو (Crew) نے جو علمی و عملی بحث اس موضوع پر پیش کی ہے وہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے کہ "انسان بھی ہر جاندار کی طرح ایک چھوٹے سے جرثومہ (کیڑے) سے پیدا ہوتا ہے جسے غذا آہستہ آہستہ بڑھاتی ہے، ایک خاص شکل و صورت دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ترقی کرتے کرتے ایک ذی عقل و ہوش، صاحب علم و فراست فرد ہوجاتا ہے، پھر اس کے بعد اس کا نمو رک جاتا ہے، علامات شیب ظاہر ہونے لگتے ہیں قوت عمل ضعیف ہوجاتی ہے اور رفتہ رفتہ حیات و اعمال حیات محدود ہوجاتے ہیں۔ ایک جاندار جسم کے اندر ہمیشہ خلایا مٹتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ شباب میں جتنے خلایا مٹتے ہیں اُن سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیب میں اسکے بالکل برعکس ہوتا ہے یہاں تک کہ جب جدید خلایا بننا بند ہوجاتے ہیں تو فنا ہوجاتی ہے۔

اب یہ رائے مسلم ہے کہ جسم میں جدید خلایا کا نہ بننا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ زہریلے مادہ کا جو جسم میں پیدا ہوجاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اعضا، جو جسم کے کثیف مادہ کو خارج کرتے رہتے ہیں (مثلاً امعا، پھیپھڑے، گردے، جلد) اپنا پورا کام نہیں کرتے اور زہر جمع ہوکر خلایا کو زیادہ فنا کرنے لگتا ہے۔ پھر جب غور کیا جاتا ہے کہ یہ اعضا اپنا پورا کام کیوں نہیں کرتے تو لامحالہ خون کی روانی کی طرف نگاہ

جاتی ہے جسپر انحصار ہے تمام اعضاء کے افعال کا، یعنی خون صالح جسقدر وسعت وکثرت کے ساتھ اعضاء کو پہونچتا رہیگا وہ اتنی ہی تکمیل کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، لیکن خون صالح کا انحصار ہے ان غدود پر جو جسم کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے کوئی خاص مادہ نکل کر خون میں ملتا رہتا ہے اور اس کو صاف رکھتا ہے

یہ غدود کون کون سے ہیں:- غدۂ درقیہ، غدۂ صعتریہ، غدۂ نخاعیہ غدۂ صنوبریہ، گردوں کے اوپر کے غدود اور غدود جنسیہ (یعنی خصیتین) ان تمام غدود سے ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ پیدا ہوکر خون میں ملتا ہی اور خون کے ذریعہ سے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے اس کا تجربہ غدود کے نکالنے اور پھر ان کی جگہ قایم کر دینے سے کافی طور پر ہوچکا ہے۔

پھر جس طرح اور امراض ان غدود کے ضعف سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بڑھاپا بھی جو یقیناً ایک مرض ہی ہے، پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج ان غدود ہی کی تبدیلی سے ہونا چاہئے۔

سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں ایک خصی مرغ پر اس طرح کا عمل جراحی کیا گیا اور ایک دوسرے مرغ کے خصیے اس میں لگا دئیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خصی مرغ نے پھر نر حالت اختیار کرلی اس کے ۴۰ سال بعد فرانس کے ایک ڈاکٹر نے جس کی عمر ۷۲ سال کی تھی جانور کے خصیہ کا جوہر نکال کر اپنے جسم میں پچکاری کے ذریعہ سے پہونچایا تو اس کی قوت حیوانی و دماغی میں بہت اضافہ ہوگیا جب اس نے اپنے اس تجربہ کا اعلان کردیا تو اس قدر ہجوم بڈھے آدمیوں کا اس کے پاس ہوا کہ گھبرا کر لندن چلا گیا ہر چند اس بیان میں صحت کا شائبہ کم ہی کیونکہ اول تو خصیہ کا جوہر حاصل کرنا آسان نہیں، دوسرے یہ کہ پچکاری کے بعد ہی فوراً اس قدر فائدہ مترتب ہونا خلاف اصول ہی، اس کے لئے کچھ زمانہ گزرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ ضرور ہوا کہ ایک اصولی بحث شروع ہوگئی اور ڈاکٹروں کو اس طرف توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں عملی صورت سے جو نتائج پیدا ہوے وہ یہ تھے کہ اگر کسی ضعیف جانور میں مادۂ منویہ کی دونوں رگیں بدل دیجائیں تو وہ جوان ہوجاتا ہی۔ اور دوسرے یہ کہ اگر غدود سے اس کا مادۂ کیمیادی نکلنا بند ہوجائے یا کم ہوجائے تو دوسرے غدود بدلدینے سے پھر اصلی حالت عود کر آتی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے چھوٹے چوہوں کو خصی کیا اور وہ بیکار ہوگئے۔ اس کے بعد دوسرے چوہوں کے خصیے پھر پیوند کئے اور پھر اصلی حالت پر آگئے۔ اسی طرح اس نے چوہیاں لیکر ان کے خصیے (مادہ کے خصیوں کو مبیضہ کہتے ہیں) نکالے تو ان کا میل جنسی جاتا رہا۔ اور جب پھر مبیضہ پیوند کئے تو وہ اصلی حالت پر آگئیں اس کے بعد نر کے خصیے مادہ کے مبیضے نکال کر اس میں پیوند کئے تو اس میں نر کے صفات پیدا ہوگئے اور مادہ کے مبیضے نر کے خصیے نکال کر اس میں لگائے تو وہ مادہ ہوگیا۔ اسی طرح اس نے بغیر خصیے اور مبیضے نکالے ہوے نر میں مادہ کے مبیضے اور مادہ میں نر کے خصیے لگائے تو وہ مخنث ہوگئے بعض ایسے آدمیوں پر بھی تجربہ کیا گیا جنکے خصیے جنگ میں جاتے رہے تھے تو وہ پھر باکار ہوگئے

ان مباحث و امثال پر بنیاد رکھ کر استناخ اور درنوف دونوں ڈاکٹروں نے بہت سے تجربے کئے اول الذکر نے صرف غدود بدلکر اعادۂ شباب کی جراحی کی اور دوسرے نے خصیئے تبدیل کئے لیکن استناخ کا طریق عمل زیادہ آسان تھا۔ کیونکہ جانوروں کے غدود آسانی سے ملسکتے ہیں۔

یہ ذکر ہے اب سے ۲۵ سال قبل کا، لیکن گزشتہ ربع صدی کے اندر جہاں اور بہت سے جدید علمی تجربات تکمیل کو پہونچے ہیں

انھیں میں سے ایک یہ بھی اور اب غدود بدل کر اعادۂ شباب کا عمل نہایت معمولی عمل جراحی ہوگیا ہے۔

ہرچند ابھی تک اتنی کامیابی نہیں ہوئی کہ غدود بدل جانے کے بعد ایک ضعیف ہمیشہ کے لئے جوان ہو جائے اور پھر اس کو دوسرے غدود کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یقینی ہو کہ ایک مرتبہ غدود کی تبدیلی سے انسان بیس سال پیچھے ہٹ جاتا ہے اور میرے خیال میں فطرت کے خلاف انسان کی یہ جنگ کچھ کم کامیاب نہیں ہو۔ ممکن ہو کہ آئندہ چلکر اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور انسان اپنی ۱۲۰ سال کی عمر طبعی کو پہونچ سکے۔

سینما یا صور متحرکہ

اب سے ۱۰ سال قبل سنہ ۱۹۱۰ء میں سینما بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور صرف لہو و لعب سمجھا جاتا تھا لیکن دس سال کے اندر ہی اس صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ اب امریکہ میں موٹر کی صنعت کو چھوڑ کر اس کا چوتھا درجہ ہے اور اس کی کمپنیوں کے حصے نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ تک دنیا میں ۰۰۰۰ ۴۰ مستقل عکاس خانے (Cinema Houses) قائم ہو چکے تھے، ۷۰۰۰ امریکہ میں ۵۰۰۰ بلاد انگلستان میں ۲۰۰۰ جرمنی ۲۷۰۰ فرانس میں ۱۰۰۰ اٹلی میں، ۱۰۰۰ اسپین میں ۸۰۰ اسٹریلیا میں ۷۰۰ سویڈن میں اور ۶۰۰ جاپان میں تھے۔ لیکن اب مغرب میں کوئی مقام ایسا نہیں ہو جہاں کوئی عکاسخانہ موجود نہ ہو، خواہ وہ مرکز تہذیب و مدنیت سے کتنی ہی دور کیوں نہ واقع ہو۔

جنوبی امریکہ میں یہ حالت ہو کہ ہر وہ گاؤں جس کی آبادی ایک ہزار تک پہونچتی ہو: ایک عکاسخانہ رکھتا ہے۔ یہ مختصر سا بیان تھا اس کی صنعت کی وسعت کا۔ اب رہی اس کی مقبولیت سو اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ سنہ ۱۹۲۰ میں امریکہ کے اندر روزانہ ایک کرور آدمی عکاسخانوں میں جاتے تھے اور اب مسٹر ولہائز سینما کمپنی کا ایک ڈائرکٹر کروڑپتی انسان سمجھا جاتا ہو۔ سنہ ۱۹۲۰ میں سینما کمپنیوں کی آمدنی گیارہ کرور گنی ہوئی تھی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ۱۴ کرور گنی۔ اس صنعت میں جو سرمایہ سنہ ۲۵ تک لگا تھا اس کا اندازہ ۱۴ کرور گنی کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کے اشتہار پر صرف ایک سال میں ایک کرور ۲۰ لاکھ گنی کمپنیوں نے صرف کئے اور ۵۰ لاکھ سے زاید آدمی ان میں کام کرتے ہیں۔

اب سینما سے صرف لطف و تفریح کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ اب وہ بہترین ذریعہ تعلیم اطفال کا، سیاسی پروپگنڈا کا اور تجارتی اشتہاروں کا ہو۔ امریکہ کی وسعت تجارت و صنعت کا ایک بڑا راز اس کی صنعت سینما بھی ہے۔ جس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اس کے ملک کی پیداوار، اس کی صنعت و تجارت کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ بازاروں میں وہاں کی اشیاء پہونچکر مقبول ہورہی ہیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۸۰ فی صدی فلم (Film) امریکہ کی کمپنیوں کے رائج ہیں اور اور اس لئے نہایت آسانی سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس وقت امریکہ ۸۵ فیصدی دنیا کے بازاروں پر بھی قابض ہے

کائنات کی عظمت

یہ غالباً سب کو معلوم ہوگا کہ زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہو اور اس کے شب و روز پیدا ہونے کی صورت یہ ہو کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور کی گردش پوری کرلیتا ہو اور اس کا سال اور فصلیں یوں

ہیں کہ ۳۶۵ اور تقریباً چوتھائی دن میں آفتاب کے گرد اس کی گردش پوری ہوتی ہے۔ خود زمین کا کرہ ۲۴ ہزار میل کے کا ہے یعنی اگر ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کیا جائے تو ایک مہینے میں اس کو طے کر سکتے ہیں۔ لیکن آفتاب زمین ۱۳۳۱۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور زمین ایسے ۳۰۴۳۳۲۴ کرے اس سے بن سکتے ہیں۔ لیکن عالم کون میں آفتاب بھی باوجود عظمت کے ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنکھ سے نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف ۶۰۰۰ ہے، لیکن بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے جن ستاروں تصویر لی جا سکی ہے ان کی تعداد ۲۲۴ ملین ہے اور یہ سب کے سب اس نظام کے ہیں جسے کہکشاں کہتے ہیں۔ کہکشاں میں ہر ستارے بہت قریب قریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بُعد کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے ورنہ حقیقت میں ان کے درمیان باہم بہت فصل ہے۔

ڈاکٹر ہبل نے اس طرح تصویریں جو ۱۰۰ انچ کا شیشہ رکھنے والی بڑی دوربین میں لگائی گئی تھیں دو ملین اجرام سدیمی کا شمار کیا ہے ۱۴۰ ملین نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں (یعنی ان کی روشنی ایک کرور ۴۰ لاکھ سال کے بعد ہم تک پہونچتی ہے) یہ اجرام کائنات میں ایک دوسرے سے اس قدر بعید واقع ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸ لاکھ سال کے بعد پہونچتی ہے، ان میں سے ہر سدیم میں جتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے آفتاب کے برابر لاکھوں آفتاب اس سے بن سکتے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ ہمارا آفتاب بھی نجوم کہشاں ہی میں سے ایک تارہ ہے، اور تمام وہ ستارے جن کی تعداد ۲۲۴ ملین بتائی گئی ہے وہ بھی سب اسی کہشاں سے تعلق رکھتے ہیں اور کہکشاں خود ایک سدیم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی)

ڈاکٹر ہبل نے ان سدیموں کی رصد کرکے معلوم کیا ہے کہ وہ حالت نشو و ارتقا میں ہیں اور تدریجی طور پر ایک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ ان کا مادہ بھی ایک ہی ہے اور باہم بُعد بھی یکساں ہے (یعنی ۱۸ لاکھ نوری سال کا فاصلہ) اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سدیم کسی ایک ہی سدیم سے پیدا ہوئے ہیں۔

غذا کا اثر قامت پر

غذا سے جس قدر انسان کی صحت و نمو کا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں حال ہی میں علماء کی ایک جماعت نے پوری طرح تحقیق کرکے اس کو ثابت کیا ہے کہ غذا انسان کی قد و قامت پر بھی بہت اثر کرتی ہے چنانچہ اہل چین، جاپان، کوریا، جاوا وغیرہ کا پست قد ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کی غذا چاول ہے اور اہل افریقہ و یورپ کا دراز قد ہونا بھی ان کی مخصوص غذا کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کی غذا بدل دی جائے تو کیا ان کی قد و قامت میں تغیر ہو سکتا ہے؟

اس امر کے تجربہ کے لئے چوہے پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا جسم اور صفات زندگی بہت کچھ اس کے طعام کیمیاوی کی ترکیب پر منحصر ہیں۔ اور غذا اور اس کے اثر کے متعلق جو تجربے کئے جا سکتے ہیں ان کا اظہار اس کی حالت سے بہت کچھ ہوتا ہے پھر چونکہ وہ ایسا جانور ہے جو گوشت بھی کھاتا ہے اور نباتات بھی اس لئے وہ اس باب میں انسان سے بہت مشابہ ہے اس کے

ساتھ ہضم وغیرہ کے لحاظ سے بھی وہ ہضم انسانی سے مماثل ہے۔ اس لئے اس کو تجربہ کے لئے زیادہ موزوں سمجھا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی تبدیلی سے اس کے اندر بہت سے تغیرات پیدا ہوئے۔

ایک مرتبہ آٹھ چوہیاں لیکر ان کے دو حصے علیحدہ علیحدہ کئے گئے ایک کو معین مقدار پانی اور گیہوں کی دی گئی اور دوسرے کو اسی غذا کے ساتھ شلغم کی پتی بھی دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اول جماعت بڑے چوہوں کے برابر ہو گئی اور دوسری ان سے دو چند جسامت کی ہو گئی۔

اس مسئلہ میں علماء جاپان نے بھی متفرق تجربے کئے۔ بعض مدرسوں کے طلبہ کو وہی غذا دی گئی جو یورپین ممالک میں دیجاتی ہے اور جو جاپانیوں کے مخصوص ملکی غذا سے بالکل مختلف ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان طلبہ کا قد کئی انچ بڑھ گیا اور اسی طرح وزن بھی زیادہ ہو گیا۔ کرنل مارسین لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ایک طرف سکھوں اور پٹھانوں کی قد و قامت کو دیکھئے اور دوسری طرف مدراسیوں کے جسم کو تو تعجب ہوگا، حالانکہ معیشت و معاشرت یا افلاس و عسرت میں یہ سب برابر ہیں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی غذاؤں میں فرق ہے۔ چنانچہ کرنل مارسین نے بعض چوہوں کو علیحدہ رکھکر وہ غذا دینی شروع کی جو سکھ اور پٹھان استعمال کرتے ہیں اور بعض کو وہ جو مدراسی کھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ چوہے مدراسی چوہوں سے جسم میں بڑھ گئے اس کے بعد چوہوں کی متعدد جماعتیں کر کے مختلف ممالک کے لوگوں کی غذا علیحدہ علیحدہ دی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی غذا کھانے والے چوہے بڑے جسم کے ہو گئے اور ان کی جلد نرم ہو گئی، اور جن چوہوں کو جاپان کی غذا دی گئی اُن کے جسم چھوٹے رہگئے۔

بہر حال یہ امر تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غذا کا اثر انسان کی جسم و صحت اور اس کے دماغ پر بہت کافی پڑتا ہے اور اگر اس پر توجہ کی جائے تو بہت سے امراض بھی دور ہو سکتے ہیں۔

آفتاب کے متعلق ایک جدید رائے

یہ ہے کہ آفتاب ہر جہت میں یکساں نور و حرارت وکہربائیت نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ منحصر ہے دوسرے سیاروں کے اجرام پر، ان کے اجتماع و تفرق پر اور اس قوت جذب پر جو آفتاب اور اس کے تابع ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شعاعیں بھی بالکل مادی چیز کی طرح قوت جذب سے متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جب زمین، مشتری سے قریب ہوتی ہے تو آفتاب اور زمین کے درمیان تجاذب بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اس وقت روشنی، حرارت اور کہربائیت ہر چیز میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اقتران بارہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔

علماء ہیئت واقف ہیں کہ ہر گیارہ یا بارہ سال کے بعد آفتاب میں بہت بڑا داغ نمایاں ہوتا ہے جو کرۂ زمین کی فضا میں نمایاں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جب زمین اور مشتری کا قران ہوتا ہے اسیوقت یہ داغ نمایاں ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۹۲ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۲۵ء میں کرۂ زمین اور مشتری کا قران ہوا اور آفتاب کا داغ بھی انہیں سالوں میں نمودار ہوا۔

اسی طرح ستاروں کی روشنی میں بھی بہت اختلاف محسوس کیا جاتا ہے۔ وہی ایک ستارہ جو ایک زمانہ میں بہت روشن نظر آتا ہے

دوسرے زمانہ میں دھندلا ہوجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت کسی ستارہ کے گرد کوئی تاریک ستارہ گردش کرنے لگتا ہو تو وہ درمیان میں آکر کسوف پیدا کر دیتا ہو لیکن یہ تاویل تمام ستاروں میں کام نہیں دے سکتی، اس لئے جدید نظریہ یہ قایم کیا گیا ہو کہ جب کسی ستارہ کے ماتحت تارے اس کے گرد زیادہ جمع ہوجاتے ہیں تو آفتاب سے زیادہ نور و حرارت جذب کرنے لگتے ہیں اور اس لئے وہ ستارہ زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کی روشنی کم معلوم ہونے لگتی ہو۔

لہسن کے فوائد

لہسن کا استعمال جس طرح اب کیا جاتا ہے، اسیطرح زمانۂ قدیم میں بھی پایا جاتا تھا۔ کیونکہ توریت سے بنی اسرائیل کا اس کو استعمال کرنا ثابت ہوتا ہو اور ہیرڈوٹس کہتا ہے کہ جب مصر میں ہرم اکبر بن رہا تھا تو مزدور لہسن کھاتے تھے۔ فرجیلیوس میں بھی درج ہے کہ یونانی اور رومانی سپاہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ بارھویں صدی کے ایک مصنف کا قول ہو کہ کھیتوں میں حرارت آفتاب سے بچنے کے لئے کاشتکار اس کو کھاتے ہیں۔ عرب کے اطبا اور فلاسفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۲۱ء میں جب شہر مرسیلیا میں وبا پھیلی اور بہت سے لوگ مرنے لگے تو قیدخانہ کے چار قیدیوں کو جنھیں پھانسی کی سزا دی جانے والی تھی حکم دیا گیا کہ وہ مردوں کو اٹھائیں لیکن ان پر وبا کا اثر نہیں ہوا حکومت نے اُن سے کہا کہ اگر وہ اس کا راز بتا دیں تو جاں بخشی ہوجائیگی، چنانچہ انھوں نے کہا کہ وہ روزانہ لہسن کا ست استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ صحیح ہو یا غلط لہسن میں بہت سے طبی فوائد مضمر ہیں۔ ابن رشد، ابن سینا، رازی، ابن بیطار وغیرہ نے لکھا ہو کہ اس سے بہت سے امراض کا علاج ہوسکتا ہے اور خود انھوں نے استسقا، سینہ کے امراض، دانت کا درد، گردہ کا سنگریزہ اس سے دور کیا۔ ویدک میں بعض قسم کے بخاروں کا علاج لہسن سے کیا جاتا ہے، مارگزیدہ کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہو اور شہد کے ساتھ ملا کر اس کا استعمال جلدی امراض کے لئے بھی مفید ہو۔ طب میں اس کا استعمال اس لئے کم کر دیا گیا تھا کہ اس کی بو بہت خراب ہوتی ہو اور اس کی تیزی بعض خلایائے جسم کو نقصان پہونچاتی ہو۔ لیکن مسٹر کلمنٹ ایک کیمیاوی نے لہسن کا تیل نکالا ہو اور یہ دونوں عیب اس کے دور کر دئے ہیں۔ سات سال تک مسلسل اس کا استعمال کرنے کے بعد اس دور کو اس نے پیش کیا ہو۔ اور اس کا نام اس نے یادل (yadil) رکھا ہو اس کے استعمال سے سل، انفلوئنزا، اسہال، صفائی زخم نزلہ اور امراض معدہ کو بہت فائدہ پہونچتا ہو۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہو کہ اس نے یادل کے استعمال سے انفلوئنزا کے ۸۰ بیماروں کا علاج کیا جنمیں سے ۸۰ دو دن کے اندر اچھے ہوگئے۔

شیخ الرئیس کے ایک نادر الوجود نسخہ کا انکشاف

ذیل کا مضمون رسالہ **الحکیم** سے پبلک کے فائدے اور اطلاع کے لئے اقتباس کیا جاتا ہے

رنگون کے صاحب ثروت سوداگر اسباب معلومہ کی وجہ سے ..... موذی مرض کا شکار ہو کر بالکل ..... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور و معروف اطبا کا علاج کیا مگر حسب منشا فائدہ نہوا چنانچہ انہوں نے عطائیوں اور ماہر یوں سے بھی رجوع کیا۔ اور آخر میں ناکامیاب رہنے پر یہ قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور بزرگوں کے مقبروں پر جا کر دعائیں مانگیں۔ اور دوران سفر میں جو فقیر یا طبیب ملے تو لگے ہاتھ اُس سے بھی رجوع کر لیں۔ چنانچہ وہ اپنے اسی ارادے پر کار بند ... تو اتفاقاً حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیائؒ کی درگاہ میں مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں طبیب ہوں۔ اپنا حال مجھے سنا دیا اور آخیر میں ایک آہ سرد بھر کر چپ ہو رہے۔ مجھ پر اُن کے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً ہی علاج کرنے کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے اُن کا علاج نہایت محنت جانفشانی سے شروع کیا لیکن کچھ فائدہ نہوا۔ قریب تھا کہ وہ بددل ہو کر واپس چلے جائیں کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی ایک روز یہ معلوم ہوا۔ **گوڑگانوہ** میں کوئی **نذیر احمد** صاحب ہیں۔ جن کے پاس اس مرض کا ایک **نادر نسخہ** موجود ہے لیکن نہ تو وہ طبیب ہیں اور نہ صاحب غرض چونکہ گھر کے رئیس کھاتے پیتے ہیں اس لئے نسخہ کسی کو نہیں بتاتے لیکن اگر کوئی زبردست سفارش لیکر پہونچ جائے تو تیار کر کے دوا دیدیتے ہیں۔ لیکن **قیمت** کچھ نہیں لیتے۔ الغرض اُنہ اس نسخہ کی اسقدر تعریف کی کہ میں ضبط نہ کر سکا۔ اور ایک تعارفی خط لیکر سیدھا گوڑگانوہ پہونچا۔ وہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ میری عرض سننے کے بعد دوا ملاقیمت حوالہ کر دی۔ میں نے واپس آکر سیٹھ صاحب پر اُس کا استعمال شروع کر دیا **سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی اور اسقدر طاقت** پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے اُسکو متعدد مریضوں پر مختلف حالات میں آزمایا ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ کوشش کرنے کے بعد مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ **بو علی سینا کی** خاص دماغی کوششوں کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ ایک معدنی **لوح** پر کندہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ خود طبیب نہیں ہیں ورنہ ہی وہ اس سے کوئی خاص فائدہ اٹھاتے ہیں اس لئے میری استدعا بیجا نہ ہوگی کہ آپ صاحب اِل کے اس نسخہ کو الحکیم میں شائع کر کے تمام اطبا کو شکریہ کا موقع دیں۔

خادم الاطبا ابو مسعود الرحمٰن

ایڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ: ۔ یہ مکتوب کوئی دو تین ماہ ہوئے ہمارے پاس پہونچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہم نے ان واقعات کی مزید تحقیق اپنے کرم فرما خان بہادر ملک سردار علی صاحب کو تکلیف دی۔ جو حسن اتفاق سے آجکل **گوڑگانوہ** میں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ صاحب موصوف کا جو جواب ہمیں موصول ہوا ہے۔ درج ذیل ہے۔

حب السلام علیکم۔ میں کل نذیر احمد قریشی سے ملا تھا۔ وہ حکیم نہیں ہیں۔ مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہور کے فرزند ہیں۔ **اِن کے پاس واقعی قوت باہ کا ایک عجیب نسخہ ہے**۔ میں نے انکو ہر چند سمجھایا کہ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ نسخہ کو ظاہر کر دیا جائے مگر انہوں نے فرمایا کہ وہ اس معاملہ میں سوچ رہے ہیں ؂ ؂

تابعدار **سردار علی**۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

نوٹ: ۔ پبلک کے سخت تقاضے و اصرار پر اس دوا کی تیاری کا انتظام و اہتمام دوسری مرتبہ کیا جا رہا ہے چونکہ اجزا نہایت مشکل سے ملتے ہیں اس دفعہ بھی **صرف سو اشخاص** کیلئے دوا کی تیاری کا انتظام ہو رہا ہے۔ بہت سے نام رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔ ضرورتمند اصحاب دوا کی **قیمت** بہت روانہ کر کے **اپنا نام رجسٹرڈ** کرالیں۔ **قیمت اکسیر سینا پانچ روپیہ**۔ **قیمت طلاء سینا پانچ روپیہ**

محصول ڈاک ۶؍ بذمہ خریدار

نذیر احمد قریشی۔ برکت منزل۔ گوڑگانوہ

سماجی — ۱۲ر
سوانح عمرو عیار — ۱۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی — ۸ر
حاجی بغلول — ۸ر
پیاری دنیا — ۸ر
کایا پلٹ — ۸ر
میٹھی چھری — ۶ر
طرحدار لونڈی — عہ
طلسمی فانوس — ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرنالنی — ۱۲ر
مار آستین — ۱۲ر
بنگالی دلہن — ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ — ۱۲ر
پرتاب — ۱۲ر
روہنی — ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی — عہ
سکینہ بنت حسین — ۶ر
ملکۂ زنوبیہ — ۱۴ر
قرۃ العین — ۳ر
مخدرات — ۱۲ر
جویائے حق — للعہ
نعمت چین — عہ
فاتح مفتوح — ۱۲ر
بابک خرمی — ۸ر

الفانسو — ۱۲ر
ایام عرب — ۸ر
قیس ولبنیٰ — ۱۲ر
یوسف ونجمہ — ۱۲ر
زوال بغداد — ۱۲ر
مینا بازار — عہ
مقدس نازنین — ۱۲ر
رومتہ الکبریٰ — ۱۲ر
فلپانا — ۱۲ر
شوقین ملکہ — عہ
منصور موہنا — ۸ر
حسن انجلینا — ۸ر
ملک العزیز ورجنا — ۱۲ر
فردوس بریں — ۸ر
حسن کا ڈاکو — ۱۲ر
دربار حرام پور — ۱۰ر
غیب دان دلہن — عہ
بدر النساء کی مصیبت — ۳ر
خوفناک محبت — ۱۲ر
سیوہ تیغ — ۸ر
نیکی کا پھل — عہ

حکیم محمد علی مرحوم طبیب دہلی

نیل کا سانپ — ۹ر
رام پیاری — عہ
عبرت — ۱۲ر
حسن سرور — للعہ
اختر حسینہ — ۸ر
دیول دیوی — ۹ر
جعفر عباسہ — ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق — ۱۲ر
قاسم وزہرہ — عہ
نیرنگ جمال — ۴ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زندانی — ۶ر
اصلاح زبان — ۶ر
قواعد میر — ۶ر
اول اردو — ۶ر
جان اردو — ۶ر
شاعری کی پہلی کتاب — ۸ر
" دوسری کتاب — ۸ر
" تیسری — ۸ر
" چوتھی — ۸ر

میر ولی اللہ بی اے

بندگی — ۸ر
کاس الکرام — ۸ر
لسان الغیب جلد اول — ۸ر
" دوم — ۸ر
" سوم — ۸ر
" چہارم — ۸ر
نمکدان فصاحت — ۱۲ر
بادۂ ناب — عہ

ظفر عمر بی-اے

چوروں کا کلب — ۹ر
نیلی چھتری — ۴ر

بہرام کی گرفتاری — عہ

مولوی عبدالماجد بی اے

فلسفہ جذبات — ۸ر
مکالمات برکلے — ۱۲ر
پیام امن — ۴ر
تصوف اسلام — عہ
زود پشیمان — ۸ر
فلسفیانہ مضامین — ۱۲ر

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن — للعہ
سیرۃ عائشہ — ۱۲ر
حیات امام مالک — عہ
خلافت عثمانیہ — عہ
خلافت اور ہندوستان — ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

اسوۂ صحابہ دو جلد — ۸ر
سیرۃ عمر بن العزیز — ۱۲ر
انقلاب الامم — ۸ر
تاریخ الحرمین — ۸ر
فقرائے اسلام — ۱۲ر
فطرت نسوانی — ۱۲ر
شعر الہند دو جلد — ۸ر

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول — ۸ر
" دوم — ۸ر
سیر الصحابیات — ۸ر

مولوی عبدالباری ندوی

مبادی علم انسانی — ۱۲ر
برکلے کا فلسفہ — ۱۲ر

مولوی عبدالرزاق ندوی

سوۂ حسنہ — ۸ر
کتاب الوسیلہ — ۸ر
ترکی و یورپ — ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

گلستان جلی — ۸ر
گہوارۂ تمدن — ۸ر
نگارستان — ۸ر
صحابیات — ۸ر
تاریخ الدولتین — ۱۲ر

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا — ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ — ۱۲ر
خیالستان — ۱۲ر
ثالث بخیر — عہ
حکایات و احتسابات — ۱۲ر

مولوی راشد الخیری

صبح زندگی — ۱۲ر
شام زندگی — عہ
شب زندگی — ۸ر
نوحۂ زندگی — ۱۲ر
منازل السائرہ — ۸ر

بنت الوقت — ۸ر
قطرات اشک — ۱۲ر
عروس کربلا — ۱۲ر
یاسمین شام — ۱۲ر
تیغ کمال — عہ
ماہ عجم — ۱۲ر
محبوبہ خداوند — ۱۲ر
مو و دہ — ۸ر

مولانا حالی مرحوم

مقدمہ شعر و شاعری — ۱۲ر
دیوان حالی — ۱۲ر

تاریخی و دلچسپ جاسوسی ناول

سراب مغرب — ۸ر
بالشویک شہزادی — ۸ر
شہید وفا — ۸ر
ممتاز بیگم — ۸ر
شعلۂ رنگین — ۸ر
محاصرۂ پیرس — عہ
شیخ چلی — عہ
بہادر ترک — ۸ر
بہرام کی واپسی — ۴ر
انقلاب فرانس — ۱۲ر
حسن بنارس — ۸ر
فطرتی جاسوس — ۱۲ر
ترکی حرم سرا — ۸ر
جنگ طرابلس — ۸ر
بہرام چوہر — ۱۲ر
زر پرست — ۴ر

کنجی کا راز
عبدالرحمٰن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
کرشمہ
وفادار دلہن
طواف زمین
سیاحت زمین
سیاحت ہوا
ملازمین مراکش
سمندر کی سیر
اسرار بالشوزم
عروج لیلیٰ
امین بک
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
نیلی چھتری
بہرام کی آزادی
بہرام کی گرفتاری
بہرام کی سرگزشت
پراسرار قتل

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
بساط سخن
انشار نسوان
مکاتیب محسن الملک
لیلیٰ مجنون ڈراما

مثنوی قاسم و زہرہ
فسانۂ جوش

تاریخی کتابیں

تاریخ اندلس
تاریخ عرب
اسرار رنگون
شباب لکھنؤ
مرقع اودھ
ارض نہرین
تفریح الاذکیا
تاریخ حبیب اللہ
ملاۃ الکونین
البدر
قصص الانبیا
صمصام الاسلام
فتوح الشام
تذکرۃ الکرام
منہاج النبوۃ
حیات العلماء
مذاہب الاسلام
روضۃ الصفا
تاریخ اودھ
خواتین رنگون
سیر المتاخرین
اعمالنامہ روس
تاریخ مصر

سلاطین اودھ
صحیفۂ زرین
تاریخ دربار
تاریخ ایران

تصوف و اخلاق

سیر الطیبات
علم الاخلاق
خدا کی ہستی
[illegible] المبادر
مختارات صوفیہ
حیات ابدی
افراد کاسبہ
عوارف المعارف
بوستان معرفت ۵ جلد
شجرۂ معرفت

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی
گلشن بیخار

سہرا باب سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
کلیات سعدی
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات حزین
دیوان عنصری
دیوان ظہیر فاریابی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال اسیر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی
کلیات ظفر
کلیات مومن

دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات اسمٰعیل
مراۃ الغیب
صنمخانۂ عشق
فریاد داغ
دیوان قائل
دیوان شہیدی

فن شعر و عروض

زر کامل العیار
ترجمہ حقائق البلاغت
عروض سیفی
شجرۃ العروض

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین
" باتصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرہنگ
کارخانۂ عالم

لڑکیوں کی تعلیم

الف لیلیٰ و لیلیٰ
فریب حسن
سوز عشق
بعد البعث
تامل اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس

زنانہ کتب خانہ

شوکت آرا بیگم
درس حمایت
خاتون جنت
بیوی کی تربیت
بہشتی زیور ۱۰ حصے
بہشتی گوہر
اقبال دلہن
حسن معاشرت
جواہر ریزے
عورتوں کی انشار
بیوی کی تعلیم
تربیت اطفال
اصلاح معیشت
شمع ہدایت
اصلاح الرسوم
جہان آرا بیگم
بچوں کی پرورش
آرسی مصحف
سدا سہاگ
ترغیب [illegible]

نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

(مطبوعہ نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام نیاز فتح پوری)

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳۔ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جس پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیئے جاتے ہیں
۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۷ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد
- نبات النعش ۹/
- مراۃ العروس ۱۰/
- توبۃ النصوح ۱۲/
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامی
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر ۱۲/

مولانا شبلی
- سیرۃ النبی جلد اول
- " دوم
- " سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- " پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر ۸/
- آغاز اسلام ۸/
- کلیات فارسی
- کلام شبلی اردو ۸/

امیر مینائی
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸/
- ضیائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمر عیار

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذی ۸/
- حاجی بغلول ۸/
- پیاری دنیا ۸/
- کایا پلٹ ۸/
- میٹھی چھری ۶/
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۱۲/
- مار آستین ۱۲/
- بنگالی دلہن ۱۲/
- معشوقۂ فرنگ ۱۲/

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴　　　جلد ۱۴ - شمارہ ۵

صفحہ ۱۷ کا اعلان ضرور پڑھئے

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۸ء

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | نومبر ۱۹۲۸ء | شمارہ ۵

ملاحظات

نہرو کمیٹی رپورٹ کی اشاعت اور لکھنؤ کے اجتماع کو دو ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا اور سیاسیات کی وہ ساکن فضا جس کی تہ میں ایک بے پایاں تلاطم پنہاں تھا، اس کے اضطراب کی عمر بھی کافی ہوگئی لیکن نہ اس وقت تک یہ معلوم ہو سکا کہ اختلاف کا حقیقی راز کیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا کہ کس اہم نتیجہ کی امید پر یہ شور و غوغا بلند کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی جماعت یا کوئی فرد صرف اس اصول کی بنا پر اختلاف کرے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ کی تجاویز ہندوستان کی مکمل آزادی سے متعلق نہیں ہیں اور حریت کاملہ اور غلامی کے درمیان کوئی ایسی منزل نہیں ہے جس پر قیام کیا جائے، تو میں اصولاً اس کو تسلیم کرونگا اور پورے احترام کے ساتھ تسلیم کرونگا، لیکن اگر کوئی نہرو کمیٹی رپورٹ کے مقاصد کو تسلیم کرنے کے بعد محض اس دلیل کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرے کہ اس میں مسلمانوں کے حقوق کی محافظت نہیں ہے، یا (مولانا شوکت علی کی "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" اصطلاح میں) مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے طیار نہیں۔

ہر چند جب مولانا شوکت علی لکھنؤ کے جلسہ میں تمام تجاویز پر اتفاق رائے کا اظہار کر چکے تھے تو انھیں وہاں سے باہر نکل کر اختلاف کا حق حاصل نہیں تھا، لیکن خیر اس سے بحث کرنا فضول ہے کیونکہ ممکن ہے قیصر باغ کی مسحور کن فضا نے تاب تکلم

چھین لی ہو یا یہ کہ وہاں سے نکلنے کے بعد ان میں کسی شخص نے اشتعال پیدا کیا ہو، یا یہ کہ اُن کے مصالح قیادت نے کوئی علیحدہ زمین اپنی حکومت کے لئے بنانی چاہی ہو، بہرحال جو سبب بھی ہو اُس سے ہمیں بحث نہیں، لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ ان کے دلایل مخالفت کیا ہیں۔ پھر جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہی شوکت علی جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے، آج وہ افتراق و انشقاق پیدا کرنے کے لئے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور سر محمد شفیع کی صف میں نظر آتے ہیں اور دلیل صرف یہ ہے کہ "ہم جاہل ہیں، مفلس ہیں، اس لئے ہم اپنا کاسۂ گدائی ہاتھ سے نہیں پھینک سکتے اور نہ برطانیہ کے خوان کرم کی اولش کو چھوڑ سکتے ہیں۔"

کیا آزادی کامل چاہنے والے، کیا وراثتِ زمین اور خلافت فی الارض کے مدعی اسی ذہنیت و دماغ کے ہوتے ہیں، اور کیا ایسا دعویٰ کرنے والوں کو شرم نہیں آتی کہ جب حقیقی موت و زندگی کا سوال سامنے آتا ہے تو ان کے منہ سے یہی آواز پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہندو ہماری حیات کے ضامن ہو جائیں تو خیر انکا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں، ورنہ ہمارے لئے تو "جشن مرگ" ہی بہت ہے۔ پھر آیئے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ ہندوؤں نے نہرو کمیٹی رپورٹ میں کس حد تک مسلمانوں کی ضمانتِ حیات سے احتراز کیا ہے اور وہ کونسا نادر شاہ اس میں چھپا ہوا ہے جو مسلمانوں کا قتل عام کر دینے والا ہے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خوف کی چیز ان کی اقلیت ہے لیکن اسکی جس حد تک کیگئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں کیونکہ مرکزی قانون ساز مجلس میں ان صوبوں کے مسلمان نمایندوں کے لئے جہاں مسلم آبادی کم ہے نشستیں محفوظ کر دی ہیں اور صوبوں کی قانون ساز مجلس میں آبادی کے تناسب سے نشستیں حاصل کر لینے کا بھی حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے مثلاً بنگال و پنجاب، وہاں کسی جماعت کے لئے نشست محفوظ نہیں کی گئی اور اس طرح گویا مسلمانوں کو زیادہ نشستوں پر قابض ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جہاں اسلامی آبادی بہت زیادہ ہے وہی نظام حکومت قایم کیا جائیگا جو دوسرے صوبوں میں ہے۔ سندھ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائیگا۔

یہ ہیں وہ رعایتیں جن کو مسلم کشی و حق تلفی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے خلاف صرف اس اندیشہ سے آواز بلند کیجاتی ہے کہ مسلمان چونکہ جاہل ہیں، بے حمیت ہیں، نالایق ہیں، مفلس ہیں، اس لئے وہ کسی رعایت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے، یہ بالکل نئی قسم کا خراج ہے جسے جہل علم سے طلب کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ وہ صداقت پر ہے۔

مسلمانوں کی اس مخصوص جماعت کی یہ ذہنیت کہ اگر نہرو کمیٹی رپورٹ سے اتفاق کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی اقتدار کم ہوتے ہی ہندو موجودہ رعایتوں سے بھی مسلمانوں کو محروم کر دیں گے۔ ایسی غیر خود دارانہ اور شرمناک ذہنیت ہے کہ اگر خدانخواستہ آج مسلمانوں کی آبادی کا اکثر حصہ اس کا طرفدار ہو گیا تو ہمیشہ کے لئے اسلام کا اقتدار دنیا سے اٹھ جائیگا اور انگریزی قوم بھی جس سے اس طرح طلب اعانت کی جا رہی ہے غلامی کے اس انتہائی ذلیل اعتراف کا جواب سوائے منہ پھیر کر ہنس دینے کے اور کچھ نہ دے سکے گی۔ مسلمانوں کے ایک اور زبردست قاید، جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ

نہرو کمیٹی رپورٹ میں مجرموں کو جسمانی سزا دینے سے اختلاف کیا گیا ہے، اور اس طرح گویا مسلمان چوری کریگا، لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائیگا، مسلمان زنا کریگا اور سنگسار نہ ہو سکیگا، مسلمان شراب پیئے گا اور اس کے درّے نہ لگائے جا سکیں گے۔ یعنی سات کروڑ مسلمان اپنی شریعت کی بیچارگی ہر منٹ محسوس کرکے رہ جائیں گے۔"

غالباً یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا، سنگسار کیا جانا اور دُرّے لگانا کس حد تک سرقہ، زنا اور میخواری کا انسداد کر سکتا ہے اور اسوقت تک شدید یا خفیف جسمانی سزاؤں نے دنیا کے جرائم میں کتنی کمی پیدا کی ہے، لیکن جناب عبدالماجد صاحب سے یہ دریافت کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے قانون میں ان کے تمام مطالبات کی رعایت کر دیجائے تو پھر وہ اس میں کسی ایسی استثنائی دفعہ کا مطالبہ تو نہ کریں گے جس سے علماء اور رہبران قوم اس قسم کے تعزیروں سے محفوظ رہیں یا یہ کہ مفتیان اسلام کو کسی ایسے حیلۂ شرعی پیدا کرنے کی اجازت نہ ہوگی جو ایک ہی ناجائز بات ان کے لئے قابل معافی اور دوسروں کے لئے لائق تعزیر ہو؟ کیونکہ خود شریعت کوئی چیز نہیں ہے اگر اس کے نافذ کرنے والے فاروق جیسے انسان نہ ہوں خیر، یہ تو سیاسی لطائف ہیں جنپر کوئی شخص توجہ نہیں کرتا۔ لیکن واقعی سنجیدگی کے ساتھ جو اختلاف کیا گیا ہے وہ بھی میرے نزدیک بالکل لایعنی ہے یہاں تک کہ بہت سے اختلاف کرنے والے خود بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کیوں مخالف ہو گئے ہیں۔

مسلم کانفرنس کا انعقاد جس کی صدارت کا فخر سر آغا خان کو ملنے والا ہے، بالکل تضیع اوقات ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے جو مسلم کانفرنس سے۔ انجمنوں کی کثرت ہمیشہ لامرکزیت کی طرف انسان کو لیجاتی ہے اور لوگوں کے خیال میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت یقیناً کوئی وجہ ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ مخالفین رپورٹ کی نیت پر حملہ ہو سکے زیادہ سے زیادہ اس کو قصور فہم کی ایک نہایت ہی مہلک مثال کہہ سکتے ہیں، اس لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ممکن ہے کہ آئندہ وہ اپنی غلطی کو سمجھ جائیں اور پھر اسی شاہراہ پر آجائیں جو اس وقت منزل تک پہونچنے کے لئے سب سے زیادہ قریب کی صراط مستقیم ہے

سائمن کمیشن جس کا وجود دوست دشمن کی تفریق کا بہترین معیار ہے، اکتوبر کے چوتھے ہفتہ میں آ کر اُتارا ہی گیا اور انھیں روایات کی تکرار شروع ہو گئی جن کو ایک مستبد حکومت کے مستبد اصول پر قائم ہونے والی مستبد کمیشن کے ساتھ ساتھ زندہ ہو جانا چاہئے، تلوار وں کی چھاؤں بندوقوں کی حفاظت، مظاہرۂ عسکری کے سایہ میں کام کرنے والا کمیشن ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے آیا ہے لیکن اُسے خبر نہیں کہ ایک قوم کا فیصلہ خود اسی قوم کے ہات میں ہوتا ہے جس کو تیغ و تفنگ عارضی طور پر کچھ دنوں کے لئے مضمحل تو کر سکتے ہیں لیکن محو نہیں کر سکتے

ممکن ہے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، سر سنکران نائر آنریبل میاں محمد شفیع وغیرہ کا گروہ اس وقت مسٹر سائمن کے نشۂ ہمنشینی میں بہت سی حقیقتوں کو نظر انداز کر جائیں لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ جس کمیشن کو کامیاب بنانے کے لئے فوج و پولیس کو اپنی قوت سے کام لینا پڑے، وہ کبھی ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتی۔ اس وقت کمیشن کا استقبال

پبلک کی طرف سے حقیقی معنے میں کہیں نہیں ہوا اور نہ غالباً ہو، لیکن ہمارا کام یہیں تک پہونچکر ختم نہیں ہوجاتا کہ ہم اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرکے بیٹھ جائیں بلکہ ہمارا فرض اس سے زیادہ یہ ہونا چاہئے کہ جس دعوے کو لیکر کمیشن آیا ہے، ہم اُس کو خود اپنے اتحادِ عمل سے پورا کرکے دکھا دیں اور ثابت کردیں کہ ہمارا کمیشن سے کٹنا آپس میں جڑ جانا ہے اور "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت" ہمارا مسلک نہیں۔

ہم اس سے قبل ظاہر کرچکے ہیں کہ اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انجمنوں کی کثرت کوئی محمود طریق کار نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان دو جمعیتوں کو جن کا نام تبلیغ و خلافت ہے یقیناً مٹا دینا چاہئے۔ اول الذکر جماعت کا وجود سیاسیاتِ ہند کے لئے بے انتہا مضرت رساں، اور خود مسلمانوں کے لئے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہے

اول تو ہمیں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ تبلیغ کانفرنس نے جماعت اسلامی میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر بھی لیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں حصول ترقی کا ذریعہ کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے اور اس کا فقدان پہلے ہی کم نہیں ہے رہی خلافت کمیٹی سو یہ حالت موجودہ جبکہ خلافت کا وجود باقی نہیں رہا، اس کی ایک ناکارہ یادگار قائم رکھنا قرینِ عقل و انصاف نہیں جس طرح دوران قیام خلافت میں اس کمیٹی کا روپیہ نامناسب محل و موقعہ پر استعمال کیا گیا، اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے چنانچہ سنا گیا ہے کہ کلکتہ میں نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے کافی مالی امداد دی ہے، جو یقیناً اس کے مقاصد و فرائض سے بالکل علحدہ چیز ہے۔

مسلمانوں کو اگر اپنی کوئی مخصوص انجمن قایم کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم لیگ کو از سر نو زندہ کیا جائے اور تمام قوتیں اسی کی اصلاح میں نہ صرف ہوں۔

سیاحت یورپ کے بعد شاہ افغانستان نے جس تیزی کے ساتھ ملک کو اسباب ترقی سے آراستہ کرنے کی عملی کوشش شروع کردی ہے، وہ یقیناً حیرتناک ہے سلطنت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں آثار حیات نہ پیدا ہوگئے ہوں اور ترقی کے لئے اضطراب نہ رونما ہوگیا ہو۔

حال کی اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ مصارف فوج کے لئے وہاں خزانہ بالکل علحدہ کردیا گیا ہے اور مدراس کے تمام طلبہ کو اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک سال تک مدرسۂ حربیہ میں کام سیکھنا لازم قرار دیدیا گیا ہے۔ فوج کی رنگین وردی بھی منسوخ کردی گئی ہے اور وہی خاکی لباس تجویز کیا گیا ہے جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ عہدوں کے گریڈ مقرر کردیئے گئے ہیں تاکہ ہر شخص باقاعدہ ترقی حاصل کرسکے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور مفید اصلاح یہ ہوئی ہے کہ فوج میں کوئی وہ شخص بھرتی نہیں ہوسکتا جو خود پیر ہے یا کسی پیر کا مرید۔ اگر کوئی ملازم فوج اس جرم کا مجرم پایا جائیگا تو اس کو سخت سزا دیجائے گی۔

کچھ طلبہ باکو روانہ کئے گئے ہیں تاکہ معدنیات روغن کا کام سیکھیں، اسی طرح کئی ہزار طلبہ یوروپ بھیجے گئے ہیں تاکہ وہاں کے مختلف کارخانوں میں رہکر وہاں کے اصول صنعت و تجارت پر عبور حاصل کریں۔ اندرون ملک کے انتظام کی طرف بھی شاہ امان اللہ خاں کو حد درجہ انہماک ہے۔ انھوں نے حکم دیا ہے کہ ملک کے اندر ہر جگہ تارگھر قایم کئے جائیں تاکہ تمام ملک سے برقی تعلق قایم ہو جائے اور لاسلکی اسٹیشن بھی بنائے جائیں۔ محکمۂ مال کی تنظیم کے لئے باہر سے ایک مشیر طلب کیا گیا ہے تاکہ وہ اس محکمہ کو باضابطہ اصول پر قایم کردے۔

وزرات تعلیم کو حکم دیا گیا ہے کہ صنعتی اور طبی مدارس ہر جگہ قایم کئے جائیں اور ترکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دیجائے تاکہ یہاں کے طلبہ ترکی کے مدارس جبریہ میں آسانی سے داخل ہو سکیں۔

دربار میں نشستوں کی تعیین بھی منسوخ کردی بلکہ ہر شخص کو اختیار ہوگا جہاں چاہے بیٹھ جائے، کسی کو کسی پر کوئی تفوق نہ ہوگا۔

امیر امان اللہ خاں کی تخت نشینی سے قبل صرف ایک اخبار سراج الاخبار وہاں سے شائع ہوتا تھا لیکن اسوقت وہاں مختلف صوبوں سے ۱۰ اخبار نکل رہے ہیں جو نہایت آزادی سے رائے زنی کرتے ہیں۔ ان اخباروں کے اکثر اڈیٹر غیر ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر کے تعلیم یافتہ ہیں۔

حال ہی میں ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ امان اللہ خاں خلیفہ بننا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ تمام سنی ممالک اور جماعتوں کے نمایندوں کو طلب کرنے والے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک تو ڈیلی ہرلڈ کا صرف ایک سیاسی لطیفہ ہے اور حقیقت سے بالکل دور جن لوگوں نے امان اللہ خاں کی ذہنیت اور ان کی دیمقراطی خصوصیات فطرت کا مطالعہ کیا ہے، وہ کہہ سکتے ہیں، کہ امان اللہ خاں کا خلیفہ بننے کی خواہش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مہاتما گاندھی کا گوشت کھالینا کہ یہ ان کے ایمان کے خلاف ہے اور وہ اُن کے اعتقاد کے۔

علاوہ اس کے اس زمانہ میں جبکہ خلافت و خلیفہ کا مفہوم کوئی باقی نہیں رہا ہے اور نہ مسلمانوں کی جماعت اب اس عہدہ کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، امان اللہ خاں یا کسی اور کا اس کی خواہش کرنا، اپنے موجودہ اقتدار کو بھی ہاتھ سے کھونا ہے اور شاید امان اللہ خان اس قدر کم فہم نہیں ہیں کہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہوں۔

سیاسیات یوروپ و شرق کی فضا میں اب محسوس طور پر یہ تغیر پیدا ہوتا جاتا ہے کہ مشرقی اقوام و ممالک میں بہ نسبت برطانیہ کے فرانس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ حال کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک پروفیسروں اور ترک طلبہ کی تعداد کثرت سے فرانس جا رہی ہے۔ شام و مصر میں فرانسیسی تہذیب جس قدر مقبول ہوتی جارہی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ شاہ افغانستان نے بھی اپنے بیٹے کو فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرس ہی روانہ کیا ہے اور متعدد انجنیر اور سائنس دان

فرانس سے طلب کئے ہیں - سیام کے اکثر طلبہ فرانس کی یونیورسٹیوں میں جارہے ہیں اور چین کے طلبہ سب سے زیادہ وہیں جاتے ہیں - کیونکہ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنکے کسب معاش میں بھی آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں -

ہرچند انگلستان اس سے قبل بھی کسی علم و فن کی تعلیم کے لئے خاص شہرت نہ رکھتا تھا اور انگریزی یونیورسٹی کے کامیاب طلبہ اور مغربی یونیورسٹی کے طلبہ سے کمتر درجہ کے سمجھے جاتے ہیں، لیکن انگلستان کا سیاسی اقتدار اتنا زبردست تھا کہ وہ اس کمی کی تلافی پوری طرح کررہا تھا اور ایشیاء کی تعلیم و تہذیب پر بھی وہ خاص اثر ڈال رہا تھا - لیکن اب یہ تغیر اگر ایک طرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایشیا خود اپنی سیاسی اہمیت کو سمجھنے لگا ہے - تو دوسری طرف اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرانس گو برطانیہ کا حلیف ہو، لیکن وہ اس کا فریق بننے کے لئے بھی ہر وقت آمادہ ہے -

---

مہاتما گاندھی سے برہم ہوکر ہندوؤں کی ایک جماعت کا ان سے مہاتما کا خطاب چھین لینا تو خیر ایسی اہم بات نہ تھی، کیونکہ ایک شخص نہ مہاتما کسی کے بنانے سے بنتا ہے اور نہ مٹانے سے مٹ سکتا ہے، اگر وہ اس قابل ہیں تو اپنی جگہ مہاتما ہی رہیں گے خواہ اُنھیں کوئی اس خطاب سے یاد کرے یا نہ کرے، کیونکہ ان ظاہری و لفظی اعزازات سے بلند تر ایک دنیا اور ہے جہاں صداقت و حقیقت کی جستجو صرف صداقت و حقیقت کے لئے کی جاتی ہے اور جہاں دنیاوی عزت و جاہ حقیر نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے - لیکن مہاتما گاندھی کی ذات سے جو امر قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آشرم کے اصول میں تبدیلی منظور کرلی ہے اور وہ راہبانہ زندگی جو وہاں کے قیام کی ضروری شرط تھی اس کو ترک کردینے کی اجازت دیدی گئی ہے -

اب وہاں شادی شدہ اشخاص بھی رہ سکتے ہیں - وہاں رہکر شادی بھی کرسکتے ہیں اور غذا بھی اپنے ذوق کے مطابق جو چاہیں کھاسکتے ہیں - حالانکہ اس سے قبل وہاں ایک ایسا عالم تجرد و تجرید تھا کہ مشکل سے اس عہد تمدن کے انسان کی گزر وہاں ہوسکتی تھی - مہاتما گاندھی کو یقین دلایا گیا کہ موجودہ حالت آشرم کی ممکن ہے ان کی زندگی تک قایم رہے، لیکن اسکے بعد اس صورت کا قایم رہنا ممکن نہیں ہے، اس لئے انھوں نے ایک کمیشن تحقیق حال کے لئے مقرر کیا اور اس کی سفارش پر یہ تمام آسانیاں پیدا کی گئیں لیکن یہ اُمید کم ہے کہ خود وہ اپنے لئے بھی ان آسانیوں کو منظور کریں گے -

---

سر مالکم ہیلی ہمارے صوبہ کے جدید اور پنجاب کے سابق گورنر ایک خاص ذہنیت کے انسان سمجھے جاتے ہیں جسکا ثبوت انھوں نے اپنے پنجاب کے دوران حکومت میں کافی سے زیادہ فراہم کردیا تھا - خیال تھا کہ انھیں خطوط پر یہاں بھی ان کے خیال و عمل کی رفتار قایم ہوگی، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہرچند اصولاً تو وہ اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہوئے ہیں لیکن عملاً راستہ دوسرا اختیار کیا ہے -

اگر پنجاب میں سر فضل حسین کے تجربات سر مالکم ہیلی کی سیاسی تدبیر کی شہادت میں پیش کئے جاسکتے ہیں تو اب

یہاں لکھنؤ میں ہندوؤں کی جماعت ہے جن کو جناب سر مالکم ہیلی نے مشورہ دیا ہے کہ وہ امین آباد پارک میں انعقاد مجلس میلاد کے متعلق مسلمانوں کو راضی کریں۔ ممکن ہے کہ بعض مسلمان اس غیر معمولی رواداری کے اظہار پر مسرور ہوں، لیکن جنھوں نے کسی ماہر نیرنجات کی طلسم کاریوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ایک صندوق سے تریاق نکال کر دکھاتا ہے، اسی طرح وہ پھر اسی تریاق کو زہر بنا کر بھی پیش کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صلح دمفاہمت جو انسانی خودداری کا خراج وصول کرنے والی ہو، وہ کسی قوم کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتی۔ اور ہندو مسلمان دونوں کو اس سے درس لینا چاہئے کہ ہمارے جائز حقوق پر جنگ کرنے کے بعد کس طرح ایک تیسری قوت کو ناجائز مداخلت کا موقعہ مل جاتا ہے اور نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا۔ کہ باوجود مصالحت کے بھی عناد بدستور قایم رہتا ہے اور مخالفت کی آگ بجائے کم ہونے کے دریردہ اور مشتعل ہو جاتی ہے۔

اس ماہ کے رسالہ میں مولوی عبدالمالک صاحب آروی کا مضمون اصحاب کہف پر اس لحاظ سے کہ وہ ایک ایراد کا جواب ہے۔ بہت اچھا ہے لیکن نفس مسئلہ کے متعلق انھوں نے کوئی تفصیلی بحث نہیں کی، حالانکہ اس کا موقع تھا۔ میں چونکہ اجمالاً ایک بار نگار میں اس پر لکھ چکا ہوں۔ اس لئے میں نے کسی تفسیر و تتمہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔

جناب ابن السبیل کا مضمون شاما افسانہ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے اور اسی قسم کے بہت سے دلچسپ واقعات جناب ابن السبیل کے کشکول میں موجود ہیں۔ میرے نزدیک ایک قسم کے واقعات فسانوں سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔

مرزا احسان احمد صاحب کے مضمون پر میں نے ایک تفصیلی رائے تحریر کی ہے اس لئے بہ سلسلۂ ملاحظات اس پر لکھنا بیکار ہے صدائے شکست آئندہ ماہ میں ختم ہو جائیگا۔ اور ناظر دہلوی کا ایک اور مقالہ جو شاہ نصیر الدین گنج معانی رح کی نہایت تفصیلی حالات پر مشتمل ہے آئندہ ماہ میں درج ہوگا۔

حصۂ نظم میں فلسفۂ حسن پر جناب سرور لکھنوی کی نظم بہت خوب ہے، لیکن جن صاحب نے میرے پاس روانہ کیا، انھوں نے یا اصل مصنف نے اس کو پہلے معارف کے پاس بھیجدیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظم دونوں جگہ شایع ہو گئی۔ اگر اس کی اطلاع مجھے ہو جاتی تو شاید میں اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھتا۔

اس ماہ میں باب المراسلۃ والمناظرۃ کے ماتحت کوئی مقالہ تحریر نہیں ہوا کیونکہ کوئی مضمون جواب طلب موصول نہیں ہوا باب الاستفسار میں اس مرتبہ صرف تاریخی مقالے نظر آئیں گے۔

پریس کے اسٹاف میں تبدیلی اور بعض ان ناگزیر حادثات کے بنا پر جو لیتھو پریس کی دنیا میں بہت عامۃ الورود ہیں اس مہینہ کا نگار (روایتاً) چار پانچ دن کی تعویق سے نکل رہا ہے ورنہ (اصولاً) یوں تو اس کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ ہے۔ اس انتظار سے جن حضرات کو زحمت ہوئی ہو اُن کی خدمت میں یہ معذرت پیش کی جاتی ہے۔

نیاز فتحپوری

اصحاب کہف

ڈاکٹر ٹسڈل یورپ کے ان مایۂ ناز علما میں ہے، جن پر وطن بجا طور پہ فخر کر سکتا ہے، چونکہ وہ "امام دینیات" (ڈاکٹر ڈیوائینٹی) کی سند حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے اس کی کوشش علمی کا زیادہ حصہ مسیحیت کی توثیق، اور اصول اسلام کی تنقیح میں بسر ہوا، اس سلسلہ میں اُس نے متعدد کتابیں لکھیں جنہیں "مذہب ہلال" "اعتراضات محمدی" وغیرہ مشہور ہیں، چونکہ فارسی اور عربی زبانوں کا بھی ماہر تھا اس لئے اس نے فارسی زبان میں "ینابیع الاسلام" ایک کتاب لکھی، اس کے مغربی دوستوں نے اصرار کیا تو انھیں خیالات کو مغربی انداز میں "ماخذ قرآن" کے نام سے پیش کیا، یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بعض جگہ قابل ستایش ہے، لیکن چونکہ وہ "رنگ آشنائی" سے بالکل محروم ہیں اس لئے کتاب گویا سراسر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے معاندانہ جذبہ رکھنے کا پتہ دیتی ہے، انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں بالترتیب ثابت کیا ہے کہ قرآن میں قدیم عرب، یہود، صابئی، نصرانی، مجوسی، اور حنفی (ابراہیم حنیف کے پیرو) کے معتقدات اور اعمال ہیں لیکن یہیں تک سخن کا سلسلہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، کیونکہ قرآن مجید کا تو دعویٰ ہی ہے " ذلك الدين القيم اور ان هذا لفى الصحف الاولى" یہود، نصرانی اور حنفی کے عقائد اور اصول مذہبی اگر قرآن مجید میں ہیں تو اعتراض ہی نہیں، چونکہ قرآن مجید نے لفظاً ان سب کو ثابت کیا ہے، پھر اس سے استثنا کیا ہے باقی رہے مجوسی اور صابئی، مجوسیوں کا پیشوا زردشت تھا۔ وستا میں جسے زردشت نے الہامی کتاب کے نام سے پیش کیا تھا۔ تحریف اور تغیر ہوا ہے۔ چنانچہ پروفیسر میکس مولر کے عالمانہ سلسلہ تصنیفات "مقدس صحف مشرقیہ" کی چوتھی جلد میں جو وستا کا پہلوی نسخہ ہے، اس کا انگریزی ترجمہ ڈارمسٹیٹر نے کیا، مترجم نے مقدمہ میں ان تمام انکار اور آرا کو جمع کر دیا ہے جو اس کتاب کے متعلق محققین یورپ کی کاوش کا نتیجہ ہیں، بعض محققین کا خیال ہے، کہ "وستا" کا یہ پہلوی نسخہ زردشت کی وہ کتاب ہی نہیں جسے اس نے الہامی شکل میں پیش کیا تھا۔ خیر مجوسیوں کے اکثر موجودہ معتقدات، اور وستا کا یہ پہلوی نسخہ اسلامی دنیا میں الہامی تصور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اسلام کا دعویٰ ہے، " لكل قوم هاد " زردشت کے بعض تعلیم قرآن میں اگر پائے جاتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، ڈاکٹر صاحب کی یہ تبویب " اسلام میں مذہب زردشت کے معتقدات و اعمال " عوام میں غلط فہمی پھیلانے کا سبب ہے، کیونکہ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مجوسیوں کو اہل اسلام مشرک کہتے ہیں اور پھر بھی جلب منفعت میں ان کے رہین ہیں لیکن دنیا اب قدیم مذہب زردشت اور موجودہ مجوسیت میں، امتیاز اور تفریق کر سکتی ہے، جو ایک مشہور مغربی عالم کی تصنیف "ابتدائی مذہب زردشت" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، بہرحال ڈاکٹر موصوف اعلیٰ درجہ کے محقق، اور متعدد السنہ کے ماہر ہیں، تمہید میں انھوں نے لکھا ہے، کہ اس کتاب میں جتنے اقتباسات ہیں وہ سب میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں، لہٰذا ایک طالب العلم سخت حیران ہوتا ہے کہ مغربی علما کا دماغ ہوتا ہے، یا دائرۂ معارف کا مخزن، " ماخذ قرآن " میں جتنے حوالے ہیں انہیں دیکھکر اور ڈاکٹر صاحب

کے اس بیان کو تسلیم کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے، کہ وہ مغربی زبانوں میں یونانی، جرمنی، انگریزی اور مشرقی زبانوں میں عبرانی، عربی، فارسی، اور سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، چینی زبان کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "البتہ اس زبان کو میں نے مستعدی سے نہیں حاصل کیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چینی زبان سے بالکل ناآشنا بھی نہ تھے،

اصحاب کہف

اس وقت میں ڈاکٹر صاحب کے ان اعتراضات اور رد و کد کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں، جو انھوں نے قرآن مجید کے واقعۂ اصحاب کہف کے متعلق کیا ہے، میں اس واقعہ پر ایک تاریخی اور عقلی بحث کرنا چاہتا ہوں، اور بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید پر اس ضمن میں کونسی ناقدانہ روشنی ڈالی ہے اور وہ حقیقت سے کتنی دور ہے، پھر بتاؤنگا کہ تاریخ نے اس واقعہ کا کہ ساتھ دیا ہے، اور قرآن مجید نے کس معقول اسلوب بیان، اور نفیس حسن ادا سے اس واقعہ کی توضیح کی ہے۔

تاریخی ماخذ

پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ اصحاب کہف کے متعلق تاریخی ماخذ کیا ہے "آج کل میں آرہ کے جین سدھانت بھا (لائبریری) کے ارباب حل و عقد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جن کی شفقت کی بدولت مجھے مستند اور معتبر کتب کے مطا کا موقعہ ملا، اس سلسلہ میں میں نے "دقیانوس اور اصحاب کہف کے متعلق" انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا" مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس، جا (طبع یازدہم) "دی نیو یا پولر انسائیکلو پیڈیا" جلد ۱۲ ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۵ کا گہرا مطالعہ کیا، علامہ ابن خلدون نے بھی ملوک قر (کیتم) کے سلسلہ میں اصحاب کہف کا مختصر تذکرہ کیا ہے علامہ البیرونی نے آثار الباقیہ میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے جس کا حوالہ انس پیڈیا برٹینیکا میں موجود ہے، یہ حوالہ آثار الباقیہ کے انگریزی ترجمہ ڈی ساشو پر مبنی ہے انسائیکلو پیڈیا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یورپ دلفریب ادیب اور مشہور مورخ گبن نے اپنی کتاب "انحطاط و زوال دولت روما" میں نہایت عمدگی سے اس واقعہ کو دہرایا ڈاکٹر ٹسڈل نے اس واقعہ کے تاریخی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا نوٹ سے مستفاد ہے جس میں مذکور ہے، کہ ۵۲۱ء (آنحضرت صلعم سے پچاس ساٹھ سال قبل) ایک شامی عالم جاکوب آف سروگ نے ایکٹا سنیکٹورم میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسرا روایت الینڈس کے "حکایات" میں موجود ہے، جارج سیل نے بھی ترجمۂ قرآن مجید میں نوٹ کے اندر گریگوری آف ٹورس کے حوالے اصحاب کہف کے متعلق رائے زنی کی ہے،

اسلامی ماخذ میں پہلے تو قرآن مجید ہی ہوا اور سورۂ کہف میں کسی قدر تفصیل سے یہ واقعہ مذکور ہے، بخاری میں باوجود تلاش کہیں اصحاب کہف کا تذکرہ نہ ملا بخاری کے اندر کتاب التفسیر میں اصحاب کہف کے سلسلۂ واقعہ میں قرآن مجید کے اندر جو الفاظ آئے صرف انکی مختصر توضیح ہے، جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے، کوئی روایت نہیں، مناقب میں ہوسکتا ہے لیکن وہاں بھی دوسرے غار والوں کا ہے، قرآن مجید کے اصحاب کہف کا نہیں، ابو داؤد میں بھی کوئی ذکر نہیں، تفسیر جلالین میں کوئی روایت ایسی نہیں جس سے تاریخی پڑے، بقیہ معتبر تفاسیر، اور کتب تاریخ، نہ میرے پاس ہیں اور نہ آرہ میں دستیابی کی امید ہے کہ مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھ

ڈاکٹر صاحب کے اعتراضات

پس وپیش کے ساتھ یہ واقعہ (اصحاب کہف) جو بیان کیا گیا ہے، اسے سمجھنے کے لئے ہم لوگوں کو رکھنا چاہئے، جیسا کہ مفسرین کا بیان ہے، مکہ کے بعض کفار نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم

چیلنج دیا کہ آپ اگر مدعی نبوت ہیں تو اصحاب کہف کا واقعہ بتلائے، یہ قصہ ان لوگوں میں مختصر طور سے مشہور تھا، تعداد اصحاب کہف کے متعلق بحث تھی، اور اس موضوع پر بہتیرے آرا بیان کئے جاتے تھے، محمد (صلعم) نے جیسا کہ آیات ۲۲ اور ۲۳ سے ظاہر ہے، دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ کیا، ان کا مقصد تھا کہ کسی سے اس کے متعلق تفتیش کرینگے، مگر وہ اس حصول اطلاع میں ناکام رہے اس لئے انھوں نے تعداد کا فیصلہ ہی نہیں کیا، لیکن اس وقت سے انکی سعی خلاص زیادہ کامیاب نہیں معلوم ہوتی، نہ تو انھوں نے حدوث واقعہ کے زمانہ کی تعیین کی، نہ مقام کی، پھر بھی جرأت کرکے ایک واقعہ کا فیصلہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ غار میں ۳۰۹ برس تک وہ لوگ پڑے رہے، بدقسمتی سے اس میں بھی انھوں نے غلطی کی، پھر بھی یہ بات ہے کہ اُن کو شک نہ تھا کہ قصہ میں جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ حقیقتاً حادث ہوا، (قرآن مجید کے) اسلوب بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ محمدؐ کے پاس کوئی لکھی ہوئی کتاب نہ تھی، اور نہ کوئی معتمد خبر رساں تھا، جو انھیں صحیح واقعات کی خبر دیتا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کے) قبل ہلوگ اس افسانہ کے متعلق مختلف روایات پاتے ہیں معلوم ہوتا ہے، قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کے لئے محمد (صلعم) ان زبانی روایات کے مرہون ہیں نہ کہ الہام کے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، جو انسائیکلوپیڈیا سے مستعار ہے، اور انھوں نے وہی واقعات لکھے ہیں جن کو عام مورخین نے، اور جس کا تذکرہ "انسائیکلوپیڈیا برٹینکا" اور "دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا" میں بوضاحت موجود ہے، کوئی نئی بات نہیں لکھی، اس لئے میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ واقعات کا ترجمہ کرنے کی بجائے انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں :—

یہ شامی الاصل روایت جو کم وبیش ایک ہی طریقہ سے مشہور ہے، پہلے پہل گریگوری آف ٹورس کی وساطت سے مغربی ادبیات میں داخل ہوئی، واقعہ یوں ہے کہ شہر آفسس کے سات نوجوان عیسائی ۲۵۰ء میں دقیانوس (DEC…) کے قتل وغارت سے بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے ان لوگوں کے مقام فرار کا پتہ لگ گیا اور اس کا راستہ بند کردیا گیا، یہ شہدا سو گئے اور تقریباً دو سو برس کے بعد ایک چرواہے کو جبل تو ٔلیتن ([illegible]) میں اس غار کا پتہ لگ گیا اور روشنی میں اس نے اصحاب غار کو جگایا ان لوگوں نے اپنے ایک ساتھی (جیلیقوس) کو کھانا خریدنے کے لئے روانہ کیا یہ لڑکا دیکھکر متعجب ہوا کہ دروازہ شہر پر صلیب لٹک رہی ہے اور اندر بالاعلان حضرت مسیح کا نام لیا جاتا تھا، جب اس نے ایک نان بائی کی دوکان پر دقیانوس کے زمانہ کا ایک سکہ دیا تو لوگوں کو شبہ ہوا اور اُسے اس جرم میں حکام کے نزدیک پکڑ کر لائے، کہ اس نے کوئی مخفی خزانہ دبالیا ہے، اس نے اپنا واقعہ بیان کردیا ہے اور اس کی تصدیق میں وہ لوگوں کو غار کے نزدیک لاکر اپنے بقیہ چھ رفقا کو دکھا دیا جو ابھی جوان تھے اور اُن کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا جب شہنشاہ تھیاڈوسیس ثانی کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فوراً وہاں پر پہونچا، اصحاب کہف نے کہا خدا نے یہ واقعہ اس لئے دکھایا ہے کہ حشر کے متعلق لوگوں کا ایمان راسخ ہوجائے، یہ پیغام سناکر وہ پھر سو گئے علامہ البیرونی کے قول کے مطابق نوے صدی میں ایک غار کے اندر چند غیر بوسیدہ لاشیں دیکھی گئیں، جنھیں لوگوں نے شہر انسس کے محو شدگان خواب کی طرف منسوب کیا۔

ڈاکٹر صاحب اس واقعہ پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کی غیر معقولیت کی مزید تشریح کرنا عبث ہے، باوجودیکہ اس حیثیت سے محمد (صلعم) پر زیادہ الزام عاید نہیں ہوتا، جتنا ان جاہل مسیحیوں پر ہے، جن کی وساطت سے اسقدر وسیع طریقہ پر اسکا نشر و ابلاغ ہوا اور بہت شبہ ہے کہ انھوں نے ہی اس کی ایجاد کی ہو بہت ممکن ہے کہ ابتداً اس قصہ کی نوعیت محض تمثیل اور مذہبی افسانہ کی ہو اور اس کی ایجاد کا مقصد یہ دکھانا ہو کہ کس طرح قلیل عرصہ میں مسیحیت اپنے پیرؤں کی ابتلا او قتل و غارت کے باوجود عالمگیر ہوگئی، ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی دعویٰ ہے کہ محمد (صلعم) کے قبل یہ فسانہ مشرق میں پھیلا ہوا تھا، اور مکہ میں بھی لوگ ان کے زمانہ میں اس پر یقین رکھتے تھے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصور (معاذ اللہ) صرف یہ ہے کہ انھوں نے اسکو وحی الٰہی کی صورت میں پیش کیا، حالانکہ اس کی حیثیت سینٹ جارج اور "ڈریگن" رستم اور اس کے سفر ہفتخواں کے حیرت افزا فسانوں سے زیادہ نہیں،

ڈاکٹر صاحب کے کلام پر تنقید

معاندت اسلام کے جوش، اور تنقیح کے ولولہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں بہت سی باتیں ایسی لکھدیں جو ان کے دامن علم پر بدنما دھبہ ہیں، وہ لکھتے ہیں قرآن مجید کے اسلوب بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ واقعہ حیص بیص کیساتھ بیان کیا گیا ہے، حالانکہ ایسا کہنا واقعہ کے خلاف ہے، قرآن مجید نے اس واقعہ کی ابتداہی میں یہ پر زور دعویٰ کیا ہے، " نحن نقص علیک نباهم بالحق " اب اس دعوے پر غور کیجئے، اور جرمنی کے مشہور فلسفی کینٹ کی کتاب "تنقید ادراک خالص" کے آخری اوراق الٹ کر دیکھئے جہاں اس نے انسانی علم، اعتقاد، اور رائے وغیرہ سے عالمانہ بحث کی ہے، کینٹ کے نظریہ میں کوئی شخص دوسرے کو اپنے انکار کا شریک اور معتقد نہیں بنا سکتا، جب تک وہ خود اس پر یقین نہ رکھتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی اعتراض کیا ہے، کہ قرآن مجید میں اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق کوئی قول فیصل نہیں، نہ زمانہ عدوث کا پتہ ہے نہ مقام کا، بیشک زمانہ اور مقام کی تعین نہیں، کیا ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ زمانہ اور مقام کی تعین ہوتی تو جھے اور بھی دل کھول کر زہر افشانی کا موقعہ ملتا، قرآن مجید کا یہ ایک معجزہ ہے کہ اُس نے ایسی باتیں ہی نہیں بیان کیں جن کے متعلق جمہور کا اتفاق نہ ہوسکے، تعداد اصحاب کے متعلق قرآن مجید میں یہ مذکور ہے،

سیقولون ثلٰثۃ رابعھم کلبھم ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم

رجماً بالغیب ویقولون سبعۃ و ثامنھم کلبھم قل ربی

اعلم بعدتھم ما یعلمھم الا قلیل

ثلٰثۃ رابعھم کلبھم نجران کے ایک جاکوبائٹ مسیحی، السید کی رائے ہے خمسۃ سادسھم کلبھم نسطوری مسیحیوں کا عقیدہ ہے سبعۃ و ثامنھم کلبھم کو جارج سیل صحیح بتایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جارج سیل کے نزدیک اصحاب کہف کا قصہ بالکل غلط نہیں، سات کی تعداد کو صحیح تسلیم کر لینا، صاف بتا رہا ہے، کہ تسلیم کرنے والا واقعہ کا منکر نہیں۔

اب باقی رہجاتی ہے یہ بحث کہ قرآن مجید نے تعداد کے متعلق کوئی قول فیصل نہیں بیان کیا، اس کا جواب یہ ہے، کہ قرآن مجید

اگر یہ تعداد بیان بھی کر دیتا، تو اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا کیونکہ عرب میں تعداد کے متعلق اس وقت مختلف خیالات تھے۔ حقیقی تعداد ایک ہی ہو سکتی ہے، اگر بتایا جاتا تو دوسری جماعتیں جن کے عقیدہ میں مختلف تعداد کی روایتیں تھیں، ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے کہیں ایسا واقعہ بیان نہیں کیا، جو تاریخ کی روشنی اور عقل کے توازن میں ناقابل تسلیم ہو۔ مشہور روایتیں سات کی تعداد متعین کرتی ہیں، چنانچہ یورپ میں "سات سونے والے" کے نام سے یہ قصہ مشہور ہے، قرآن مجید اگر کلام الٰہی نہ ہوتا، تو اس میں اسی مشہور روایت "سبعۃ" کا ساتھ دیا جاتا، اور آج ڈاکٹر ٹسڈل جیسے معاند اسلام جب "برٹش میوزیم" میں شامی زبان کے ایک قلمی نسخہ کے اندر سات کی بجائے آٹھ کی تعداد لکھی ہوئی دیکھتے، تو نہ معلوم کیا طوفان اٹھاتے، ابھی تک ارباب تحقیق کا اجماع نہیں ہوا، کہ تعداد کتنی تھی، قرآن مجید ایسا واقعہ بیان ہی نہیں کرتا، جس کو تسلیم کر لینے میں نظر تحقیق ساتھ نہ دے، تعداد کے متعلق قول فیصل نہ ہونے کا ایک یہ بھی راز ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید نے اصحاب کہف کے غار میں رہنے کے متعلق تین سو نو برس کی تعیین کی ہے، یہ تو میں پیچھے بتاؤں گا کہ آیا "ولبثوا فی کھفھم ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعا" قول الٰہی ہے یا نقل روایت، ابھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بیان کیسا پر لطف تضاد واقع ہوا ہے، وہ دو انکار کی ہٹ دھرمی میں اقرار کی کیسی لذت بخش شکل پیش کر رہے ہیں۔

حضرات! جب آپ اس "تین سو نو" کی مدت کو حقیقت سے گری ہوئی پاتے ہیں، تو بتائیے حقیقت ہے کیا؟ کیا وہی دقیانوس اور تھیاڈوسیس کا درمیانی زمانہ یعنی ۱۹۶ سال، اگر آپ کے نزدیک "ایک سو چھیانوے" کی تعیین صحیح ہے، تو پھر آپ واقعہ اصحاب کہف کو مسیحیوں کی ایجاد، تمثیل اور مذہبی فسانہ سے کیوں تعبیر فرما رہے ہیں، اب آپ ہی فرمائیے آپ کس قول کو صحیح مانا جائے، اس جغرافیائی طریقہ تعبیر کو، یا ایک سو چھیانوے کی تعیین کو، اگر غار میں رہنے کی اس مدت کو ایک سو چھیانوے تک محدود رکھتے ہیں، تو پھر حقیقت کو فسانہ کہنا کیسا، اور اگر فسانہ اور ایجاد ہے، تو پھر قرآن مجید کے بیان "ثلثۃ مائۃ سنین وازدادوا تسعا" پر اعتراض کیسا؟ اگر آپ کہیں میرے نزدیک ۱۹۶ کی تعیین بھی غلط ہے، تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ۳۰۹ کے جزوی بیان کو حقیقت سے دور بتائیں، کیونکہ قرآن مجید نے تو یہ بیان نہیں کیا کہ اصحاب کہف دقیانوس کے ظلم سے غار میں چھپ گئے اور تھیاڈوسیس کے زمانہ میں نکلے، جس کا اعتراف آپ نے بھی کیا ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۳۰۹ کی تعیین جو قرآن مجید میں ہے وہ اصحاب کہف کی تعداد کی طرح صرف نقل روایت ہے، قرآن کا قول فیصل نہیں، ہاں بعض روایات ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ یہ قرآن مجید کا بیان ہے، چنانچہ سنہ شمسی و قمری کی تحقیق میں قاضی القضاۃ علامہ نجم الدین کا ایک قلمی رسالہ میرے پاس ہے، جس میں مذکور ہے،

یکے از اہل کتاب نزد امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام آمد و گفت کہ شما در کتاب خودی خوانید "ولبثوا فی کھفھم ثلثۃ مائۃ سنین وازدادوا تسعا" یعنی درنگ کردند اصحاب کہف در غار خود سہ صد سال و زیادہ کردند نہ سال دیگر و مانیافتہ ایم بر سہ صد سال در کتاب خود نیافتہ ایم، پس مخالفت میان ہر دو کتاب از چہ راہ ہست حضرت امیر المومنین امیر علیہ السلام فرمود، سہ صد در کتاب شما جز آں

یونانیان است، و در کتاب ما بر حساب عرب سہ صد سال بحساب یونانیان سہ صد و نہ سال بحساب عرب می شود، کتابی متعجب شد و ایمان آورد"

اسی طرح جلالین میں بھی ہے:- "ذالثلاثمائۃ الشمسیۃ ثلاثمائۃ وتسع قمریۃ" یعنی شمسی مہینہ کے حساب سے ۳۰۰ برس اور قمری مہینہ کے اعتبار سے ۳۰۹ برس ہوتا ہے، جس کا حوالہ جارج سیل نے اپنے نوٹ میں دیا ہے۔ لیکن سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن مجید کا قول فیصل نہیں بلکہ دوسروں کا قول نقل کیا گیا ہے، چونکہ اس آیت کے اوپر ہے "ولا تقولن (الی) ذالک غدا" اور اس آیت کے اختتام پر حرف عطف ہے "ولبثوا فی کھفھم الخ" جس سے صاف ظاہر ہو کہ اس کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے اور "ولا تقولن" کا منشائی فرمان "ولبثوا فی کھفھم" کو بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کے بعد والی آیت اس کو بالکل صاف کر دیتی ہے:- "قل اللہ اعلم بما لبثوا"۔ نہ معلوم ڈاکٹر صاحب نے جان بوجھ کر قرآن کے سر ۳۰۹ کی تعیین مدت کا الزام کیوں لگا دیا۔ اب رہ جاتی ہے جلالین اور قاضی نجم الدین کی روایات کی حقیقت، تو انہیں مان لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں، چونکہ قرآن جس زبان میں پیش کیا جا رہا تھا وہ عربی زبان تھی، اس لئے نقل روایت جب عربی میں ہوئی، تو ایسی ہوئی جو صحیح صحیح نقل تھی۔ یہ کی متداول روایت ہی نقل کر دی جاتی، تو اعتراض ہو سکتا تھا کہ عرب قمری مہینہ کے حساب سے سنہ کا شمار کرتے ہیں اور نصاریٰ شمسی ماہ کے حساب سے۔ اختلاف ہونا لازمی تھا، اس لئے اس روایت میں انتہائی صحت کا خیال ہے کہ "وازدادوا تسعا" اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ علمائے ریاضی نے قرآن کی اس نکتہ رسی کو تسلیم کر لیا ہے کیا مسئلہ ریاضی میں ایک امی شخص کی یہ دقیقہ سنجی کے ملہم باللہ ہونیکی دلیل نہیں، یہی ایک واقعہ آپ کی حقانیت کے لئے کافی ہے۔ اب باقی رہ جاتی ہے یہ بحث کہ "یا تین سو برس" کی مدت اس وقت تک نصاریٰ کرتے تھے یا نہیں؟ یہ بھی قیاس سے بعید نہیں، چونکہ جارج سیل نے ترجمہ قرآن میں نوٹ کے اندر لکھا ہے کہ مسٹر اسٹس کا قول ہے کہ اصحاب کہف ۳۷۲ برس غار میں رہے، گو اکثر قول ۱۹۲ برس کی مدت کے متعلق ہے، لیکن یہ بات بھی ایک کایہ تھا، بلکہ اور مثالیں ایسی ہی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تین سو سے بھی زیادہ مدت کے متعلق لوگوں کا خیال تھا، اس لئے حضرت کے زمانہ میں نصاریٰ کا قول تین سو کی تعیین مدت کے متعلق عقلی پہلو سے بھی قابل وثوق ہے، اور قرآن مجید نے یہی روایت نقل کی ہے؛

تاریخی اور قرآنی واقعات کا موازنہ

اصحاب کہف کے متعلق تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جنہیں خلاف قیاس اور بعض اوقات خلاف عقل کہا جا سکتا ہے، قرآن مجید نے ایسی تمام باتیں نظر انداز کر دیں؛ تاریخ، زمانہ اور مقام کی تعیین کرتی ہے، اور بتاتی ہے کہ یہ واقعہ دقیانوس کے عہد ۲۵۰ء میں ہوا، اور اصحاب کی بیداری کو تھیاڈوسیس ثانی کے عہد کی طرف (یعنی ایک سو چھیانوے سال کے گزرنے کے بعد) منسوب کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شہر افسس میں یہ واقعہ حادث ہوا، قرآن مجید نے یہ تمام باتیں نظر انداز کر دیں، غار میں انقضائے مدت کے متعلق صرف "فضربنا علی آذانھم فی الکھف سنین عددا" کہہ دیا جس میں کمال بلاغت اور انتہائے معقولیت پائی جاتی ہے۔

تاریخ کی مشہور روایت، تعداد کو سات تک متعین کرتی ہے، قرآن مجید نے مختلف روایات تعداد کو بیان کرکے "قل ربی اعلم بعدتهم" کہکر فیصلہ کردیا، تاریخ کہتی ہے یہ عیسائی تھے، قرآن مجید کہتا ہے "انهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى" اگر ثابت ہوجائے کہ یہ عیسائی تھے تو یہ آیت اس نظریہ کے بھی مخالف نہیں ہے، ورنہ ایک مسلم قرآنی استناد کی بنا پر انہیں پیروان مسیح نہ کہے تو کوئی مضائقہ نہیں

تاریخ نے بیان کیا ہے کہ ان میں سے ایک شخص نان بائی کی دوکان پر گیا، اور جب دقیانوس کے زمانہ کا ایک سکہ پیش کیا، تو لوگوں نے اسے مشتبہ خیال کیا اور اسکو پکڑ کر حکام کے نزدیک لائے، قرآن مجید نے بھی کھانا خریدنے کے لئے جانے کا واقعہ بیان کیا ہے، اور ان کے پتہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ اُن کی گرفتاری اس روپیہ کے دینے کے باعث ہوئی چونکہ یہ روپیہ دقیانوس کے زمانہ کا تھا، سبحان اللہ قرآن مجید نے کیسی معقول روشنی ڈالی ہے، دقیانوس کے سکہ کا واقعہ لاکر تاریخ نے واقعہ میں عجوبگی پیدا کردی ہے قرآن مجید نے اس عجوبگی کو دور کردیا، ہوسکتا ہے، لوگوں نے "سنین عددا" کے قیام غار کے باعث انکی غیر معمولی ہیئت کذائی سے شبہ کیا ہو، اللہ اللہ کیا بلیغ اسلوب بیان ہے "فابعثوا احدکم بورقکم هذه الى المدينة فلينظر ايها ازكى طعاما فليأتكم برزق منه وليتلطف ولا يشعرن بكم احدا انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذا ابدا" قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصحاب کہف نے اپنے رفیق کو مذہبی خیالات کے اظہار سے ڈرایا تھا، اور اس لئے "رجم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے --- جو مذہبی جرائم کی سزا ہے -- قرآن نے دقیانوس کے سکہ کا کہیں تذکرہ نہیں کیا، اور نہ اصحاب کہف کے رفیق کی گرفتاری کو سکہ کی عجوبگی سے متعلق کیا

واقعہ پر تحقیقی نظر

قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو مسلمات عقل کے منافی ہو، اور جس کے تسلیم کرنے میں وہم پرستی، عجوبہ نوازی، اور ماورائے طبیعیات عقائد کا الزام ہو، دو تین مقامات ایسے ہیں جو بادی النظر میں مخالف عقل معلوم ہوتے ہیں لیکن معمولی غور و فکر سے یہ مرحلہ بھی طے ہوجاتا ہے -

(۱) فضربنا على آذانهم في الكهف سنين عددا -

(۲) وترى الشمس اذا طلعت تزاور عن كهفهم ذات اليمين -

(۳) واذا غربت تقرضهم ذات الشمال وهم في فجوة منه

تیسرا مقام تھا "ولبثوا فی کہفہم ثلث مائة سنين وازدادوا تسعا" جسکی توضیح سطور بالا میں ہوچکی، پہلے مقام کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے کہ اس سے اصحاب کہف کا غار میں ایک سال سے زیادہ رہنا ثابت ہے، یہاں بھی کوئی بعید از عقل بات نہیں بہت سی قومیں ایسی ہیں جو غار میں اپنی زندگی بسر کردیتی ہیں، واقعات اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ بہت سے زہاد اور مرتاض ایسے پائے گئے ہیں جو مدت العمر عزلت نشین رہے اور دنیا اور اہل دنیا کو جھانک کر بھی نہ دیکھا، قرآن مجید نے یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ وہ ایک سال سے زیادہ نیند ہی میں پڑے رہے، بلکہ مجرد، مدت استقرار کی تعیین کی گئی ہے کیونکہ اگر قرآن مجید کا یہ مقصود ہوتا کہ وہ اتنی مدت تک نیند ہی میں پڑے رہے تو اس کے بعد جگانے کا لفظ آتا، حالانکہ اس کے بعد ہے "ثم بعثناهم لنعلم ای

"لفظ "بعث" صاف بتا رہا ہے، کہ وہ استغراق، مراقبہ وغیرہ سے ہوش میں آئے، اور مدت استقرار کے متعلق بحث و تمحیص کرنے لگے۔ اور اگر مفسرین کے قول کے مطابق "بعث" بیداری کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ جلالین میں ہے "لبعثناھم ای ایقظناھم" تو بھی موجودہ روشنی میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں، چنانچہ آج بھی زمانہ اس قسم کے واقعات سننے اور سنانے کا عادی ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کے انگریزی اخبار سٹیٹسمین میں، بمقام جوہنسبرگ ایک لڑکی کے خواب ہژدہ سالہ کے متعلق، عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں، یہ لڑکی جب بیس برس کی تھی تو اس کا عاشق ۱۹۱۰ء کے جنگ میں مارا گیا، اس واقعہ سے اس پر ایسا صدمہ ہوا، کہ وہ اٹھارہ سال تک مدہوشی میں پڑی رہی، کچھ دنوں تک لوگ اسے ٹیوب کے ذریعہ کھانا دیتے رہے، پھر اس سے بھی اس نے انکار کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسانی ڈھانچہ ہو کر رہ گئی، کچھ دنوں سے اسمیں بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور وہ بتدریج یکدم بیدار ہوگئی، اس کے مقابلہ میں "سنین عددا" اور بھی قرین قیاس ہے، "سنین عددا" ایک ایسا ٹکڑا ہے جس سے ایک سال سے زیادہ جتنی مدت کی تعیین عقل روا رکھ سکتی ہو، کر سکتے ہیں، قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں کہ اصحاب دو سو، اور تین سو برس تک سوتے رہے، یا دقیانوس کے زمانہ میں سوئے اور تھیاڈوسیس ثانی کے زمانہ میں بیدار ہوئے،

دوسرے مقام سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، چنانچہ "دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا" میں ہے کہ قرآن میں "سات سونے والوں کا قصہ" احترام کے ساتھ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب نے دن میں دو مرتبہ اپنا دائرہ گردش بدل دیا، تاکہ غار میں اس کی روشنی پہونچے" غالباً واقعہ نگار کو اسی آیت سے غلط فہمی پیدا ہوئی، حالانکہ الفاظ قرآن سے یہ معنی نہیں ظاہر ہوتے

جارج سیل نے لکھا ہے کہ غار کا دہانہ جنوب کی طرف کھلا ہوا تھا، اس صورت میں معنی صاف ہے، دہانۂ غار کو مرکز تصور کر لیا جائے تو آفتاب طلوع کے وقت غار کے داہنی ہی طرف اور غروب کے وقت بائیں جانب ہوگا، گردش شمسی کا تغیر کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں واقعہ تو صحیح ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، مسیحی روایات کے بعض حصوں کو مان لیا جائے، اور آیات بالا کے شان نزول کو مد نظر رکھا جائے جیسا کہ مفسرین بیان کرتے ہیں، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح اور عہد نبی صلعم کے درمیانی زمانہ میں حادث ہوا، گو قرآن مجید نے لفظاً یہ بھی نہیں بتایا کہ اصحاب کہف پیروان مسیح تھے، بلکہ انھیں صرف "مومن" کہا ہے۔

اسلامی اور مغربی تمام مصنفین نے اس واقعہ کا حدوث دقیانوس (رومی) کے زمانہ میں بتایا ہے، میری تحقیق میں یہ صرف تقلید روایت ہے، ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۵ کے مطالعہ سے ایک شیدائے تحقیق اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ اس عالمگیر نظریہ کا انکار کر دیا جائے، اس واقعہ کو دقیانوس ہی کی طرف منسوب کرنے کی یہ وجہ ہے، کہ تمام مورخین نے بالواسطہ یا بلا واسطہ ایک ہی راوی کی روایت نقل کی ہے گریگوری نے جو مغرب میں اس واقعہ کا سب سے پہلا ناشر ہے، ایک شامی سے سنکر یہ روایت نقل کر دی، (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا) حالانکہ اول تو دقیانوس کی سلطنت کے حالات ہی تاریخ میں نامکمل ہیں، دوسرے، صرف تین برس تک اس کی حکومت رہی، علامہ ابن خلدون نے پانچ برس تک اس کی مدت سلطنت بتائی ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے عہد میں نصرانیوں پر بڑا ظلم ہوا، شہر افسس میں اس نے ایک بڑا بت خانہ بنوایا، اصحاب کہف کا واقعہ بھی علامہ موصوف اسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے، دقیانوس کے متعلق اسی

شامی روایت کی بنا پر یہ واقعہ لکھدیا، حالانکہ ہسٹری آف دی ورلڈ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ اس کے زمانہ میں نصرانیوں پر کوئی ظلم نہیں ہوا، ہاں اسی زمانہ کے قریب ۲۸۶ء اور ۳۰۵ء کے درمیان ایک رومی بادشاہ دیاقلیطین ہوا، البتہ اُس نے مسیحیوں کا خون کیا، اس کے متعلق تاریخ میں ہے، کہ اُس کے ظالمانہ احکام کا اصدار عیسائیوں کے جان ومال کی بہ نسبت ان کے مذہب اور دین کے خلاف ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی مزید تحقیق اس امر سے ہوتی ہے، کہ اس نے رومی سلطنت کو دو حصوں پر تقسیم کردیا تھا اور ایک رومی شخص میکسیمین کو آگسٹس کا خطاب دیکر حکومت رومہ کے مغربی حصہ کا نظم ونسق سپرد کردیا، اور خود مشرقی حصہ پر متصرف رہا چونکہ اصحاب کہف کا واقعہ مشرقی روایت سے لیا گیا ہے، اس سے بہت ممکن ہے، کہ دیاقلیطین کی قہرمانی حکومت مشرقی، اور عداوت مسیحیت کے باعث مشرق ہی میں حادث ہوا ہو، دقیانوس کے دور حکومت میں مسیحیوں کے قتل وغارت کا کوئی معمولی واقعہ بھی نہیں، اس کی سلطنت تو بہت قلیل عرصہ تک رہی، وہ جی گا تھ قوم سے مجادلہ اور مقاتلہ میں صرف ہوئی، یہاں تک کہ وہ اسی قوم کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا اور اس کی لاش تک کا پتہ نہ لگا، دقیانوس کے متعلق اس واقعہ کی نسبت قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی، تھیا ڈوسیس ثانی کے زمانہ میں اصحاب کہف کی بیداری بعد کی ایجاد ہے، یا شامی نصرانیوں کی افسانہ تراشی، واقعہ صحیح ہے لیکن جیسا کہ فادر مرقی کا خیال ہے، اس کے بعض حصے، غلط ہیں،

یہ واقعہ عالم مسیحیت میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے، کہ دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا کی روایت کے مطابق مسیحیوں نے ہر سال ۲۷ جون کو اس واقعہ کی یاد منانا شروع کی، جان سیل لکھتا ہے کہ فادر مرقی "ہونگر" کو "درد ملحدین ست" خطاب کرتا ہے، چونکہ اس نے اصحاب کہف کے واقعہ کو کہانی سے تعبیر کیا۔

فرصت کی قلت اور فکر وشغل کے ہنگامہ سے نجات کہاں کہ ذوق کی رہنمائیوں میں بادیہ پیمائی کیجائے، لیکن راقم نے یہ جو کچھ لکھا، وہ ڈاکٹر ٹسڈل کی نظر عنایت کی بدولت، اور نگار دل کی نمائش، اور سوزش قلب کا گلہ کرکے جو کچھ خامہ فرسائی کی وہ ڈاکٹر موصوف ہی کی ناوک اندازی جفا سے

عبدالمالک

مرزا جعفر علیخاں اثر کی تنقید "روح نشاط" پر ایک نظر

اور

اہل لکھنؤ کے موجودہ ارباب سخن کو ایک صائب مشورہ

ملک کے مشہور شاعر جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے ـــــــ "نشاط روح" پر ایک مختصر تنقید لکھی ہے جو "مرقع" کے مارچ ۱۹۲۶ء نمبر میں شائع ہوئی ہے، میں نے اس تنقید کو اس لحاظ سے کہ ایک نامور اہل سخن کے قلم سے نکلی ہے، نہایت غور کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھا، مجکو توقع تھی کہ اصول تنقید کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر بحث ہوگی، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس تنقید کو پڑھنے کے بعد مجکو اس قول کی صداقت کا یقین کامل ہوگیا کہ شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل فن ہے۔ ع نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند،

حضرت اثر نے بجائے اس کے کہ وہ حضرت اصغر کے کلام کے محاسن و معائب پر نقد و بحث کرتے، زیادہ تر میرے ہی مقدمہ پر خامہ فرسائی فرمائی ہے، یہ کوئی غیر متوقع امر نہ تھا، ہر نقاد کو اس قسم کی بے باک اور آزادانہ جنبش قلم کے لیے بظاہر پرست مخالفین کے غوغائے بے آہنگ کے خیر مقدم کے لئے تیار رہنا چاہیے، مجکو مسرت ہے کہ اصغر کے "نعرۂ مستانہ" نے "بیماران" لکھنؤ کے مرگ نواز سکون میں بالآخر ہیجان پیدا کیا اور خلوت نشینان ماتم، کی طرف سے مخالفت کی صدائیں بلند ہونے لگیں، چنانچہ مرزا صاحب کی یہ صدائے احتجاج اس دلچسپ سلسلہ کی سب سے پہلی قسط ہے،

میرے مقدمہ پر مرزا صاحب کا سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ میں نے اکثر اشعار کے مطالب کی تشریح میں غلطی کی ہے، میرے مطالب کو نقل کرنے کے بعد مرزا صاحب نے خود اشعار کے معانی بیان فرمانے کی کوشش کی ہے، لیکن بقول ان کے باادب عرض کرونگا "مرزا صاحب شعر کی خوبیاں تو درکنار اس کا مطلب بھی نہیں سمجھے"

حضرت اصغر کا شعر ہے ؎

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے   میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

مرزا صاحب اس شعر کی تشریح یوں فرماتے ہیں،

"شاعر کہتا ہے، کہ جو کچھ علم و عرفاں کے دائرہ سے باہر جہل ہے"

"مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے"

باادب عرض کرونگا کہ یہ مرزا صاحب نے کہا ہے، شاعر نے کبھی نہیں کہا، مرزا صاحب کا دعویٰ ہے کہ "جو معنی عرض کرونگا، الفاظ سے مترشح ہوں گے، محض خیالی نہ ہوں گے"

اب ناظرین غور کریں، کہ یہ مفہوم کہ "جو کچھ علم و عرفان کے دائرہ سے باہر ہے جہل ہے" اس مصرعہ کے الفاظ سے کیونکر مترشح ہوتا ہے؟ "مقام جہل" اور "علم و عرفان کا اس کو نہ پانا" ان ٹکڑوں سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ جہل کوئی ایسا رفیع مقام ہے، جہاں تک علم و عرفان کی رسائی نہیں ہو سکتی "مقام" کا لفظ خود اس امر کی روشن اور بدیہی دلیل ہے کہ جہل کوئی ایسی چیز ہے، جو علم و عرفان سے بلند تر ہے، چنانچہ اس کی تشریح آگے آتی ہے، ابھی تو مرزا صاحب کا مطلب نقل کر رہا ہوں، اس کے بعد فرماتے ہیں؛-

"تحصیل علم و عرفان کا ذریعہ یہی عالم کون و فساد ہے، جو خود فریب شہود ہے، یعنی بے حقیقت و بے ثبات، لہذا ہم جسے علم و عرفان کہتے ہیں، بے خبری ہے، اور بے خبری بھی عجیب قسم کی جو علم و عرفان کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔

میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

جسقدر ہم پر فریب شہود کھلتا جاتا ہے، اسی قدر اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ ہمارا جہل کتنا شدید ہے۔ کبھی بھی اپنے جہل کی تھاہ نہیں ملتی، کیونکہ علم و عرفان کی مدد سے جہاں ایک حجاب آنکھوں کے آگے سے اٹھا اس کی جگہ ہزاروں حجاب قائم ہو گئے، مثلاً ایک قطرۂ آب کو لیجئے، جب تک یہ علم نہیں تھا کہ اسمیں ہزاروں جاندار مخلوق آباد ہیں، ہمارا جہل صرف قطرۂ آب تک محدود تھا، مگر اس علم نے ہزاروں نئے راستے جہل کے کھولدئے کیونکہ بجائے ایک قطرۂ آب کے اب اس کی دنیا کی معرفت درپیش ہوئی.........

حاصل یہ ہوا کہ جب موجودات عالم کے متعلق ہمارے علم و عرفان کی یہ حالت ہو کہ اپنے جہل کی بھی انتہا دریافت نہیں ہوتی تو ہم ذات و صفات باری تعالیٰ کا انحصار کیا کر سکتے ہیں"

افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے ثانی مصرعہ کا بھی مطلب بالکل غلط سمجھا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جسقدر فریب شہود کا اندازہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر ہمارے جہل کی شدت بھی محسوس ہوتی جاتی ہے، بلکہ اس کا مفہوم جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے صرف یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ مجھے فریب شہود کا اندازہ ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ جو کچھ نگاہوں کے سامنے ہے، محض سراب بے بود ہے، تاہم بے خبر ہوں، یعنی اس فریب میں مبتلا ہوں، اور یہی فریب شہود میں مبتلا ہو جانا دراصل وہ مقام جہل ہے، جس کی طرف مصرعۂ اول میں اشارہ کیا گیا ہے، شاعر نے اس کو علم و عرفان سے بلند تر اس لئے کہا ہے کہ یہ حقیقت میں "بساط آرائے شہود" کے منشاء کی تعمیل ہے، بزم شہود فریب سہی، اور میں جانتا ہوں کہ یہ فریب محض ہے لیکن پھر بھی اس فریب سے بے خبر ہوں، کیونکہ انقیاد و طاعت کا تقاضا ہے، کہ محبوب ازل کے ہر اشارۂ چشم و ابرو پر جبین نیاز جھکی رہے، عالم کائنات کے مشاہد و مظاہر سے چشم پوشی اختیار کرنا دراصل مشیت ایزدی کی خلاف ورزی کرنا ہے، اگر عالم موجودات کو فریب سمجھکر انسان اس سے بالکل بے تعلق ہو جائے، اور اس کی رنگینیوں کو نظر انداز کر دے، تو پھر اس کائنات ارضی کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اگر یہ فریب گاہ رنگ و بو انسان کی چشم تماشا کے لئے نہیں ہے، تو پھر کس کے لئے ہے؟ کیا ملائکہ قدسی اس کی ستم طرازیوں کا ناز اٹھائیں؟ البتہ انسان کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، وہ کوئی مستقل چیز نہیں، بلکہ صرف جمال ازل کا پرتو ہے، یہی وجہ ہے کہ عرفان حقیقت باوجود اس کے کہ ان کو دنیا کی بے ثباتی کا یقین کامل تھا، رزمگاہ حیات میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں، اس لئے کہ پیکر آرائے ازل کا یہی منشا ہے، اس بنا پر مقام جہل یعنی فریب شہود کا دلدادہ بنجانا علم و عرفان سے یقیناً ایک بلند تر مقام ہے، کیونکہ علم و عرفان متقاضی ہے کہ عالم کائنات

کو فریب نظر سمجھکر اس کی رنگینیوں سے آنکھیں بند کرلی جائیں، اور یہ قطعاً بساط آرائے شہود کے منشا کے خلاف ہے، لیکن مرزا صاحب کو حیرت ہے کہ :-

"فریب شہود کا بندہ ہونا علم و عرفان سے بلند مقام ہوا یا وہم پرستی ہوئی، جلوہ گاہ حقیقت کے محرمانِ خاص اور جہل کے دلدادہ! توبہ! توبہ!"

میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس نکتہ بینی اور بلاغت شناسی پر توبہ توبہ کروں۔ لیکن مرزا صاحب نے اپنی معذرت خود کردی ہے کہ

"شعر کی تمام خوبیوں کا اظہار مجھ ایسے بے بضاعت اور کم فرصت شخص کے لئے نا ممکن ہے، علاوہ بریں اس کے سمجھنے کے لئے ایک عارف کی ضرورت ہے، اور یہاں حال ہے،

رات اندھیری، سخت منزل، راستہ دور و دراز اے مرے اللہ تھوڑی روشنی میرے لئے"

اس لئے مجکو یہ شکایت نہیں کہ انھوں نے اشعار کے مطالب و معانی صحیح نہیں سمجھے، یا ان کی خوبیوں تک انکی نظر پہونچنے سے قاصر رہی، ظاہر ہے، کہ ذوق صحیح کسی کی میراث نہیں، جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے، یہ صرف عطیۂ قدرت ہے جس سے ہر شخص فیضیاب نہیں ہو سکتا، ہر نگاہ برق سر طور کے جلوؤں کی تاب نہیں لاسکتی، ہر دیوانہ مجنوں نہیں بن سکتا، ہر برہنہ جسم کو سرمد کی عریانی نصیب نہیں ہو سکتی، ہر دست طلب منصور کی طرح دار و رسن کی طرف بے باکانہ نہیں بڑھ سکتا۔ ہر سینہ سوز بلال سے منور نہیں ہو سکتا، برق جمال ہر قلب پر نہیں گر سکتی، گلشن قدس ہر طائر کا نشیمن نہیں بن سکتا،

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

لیکن ہمکو مرزا صاحب سے اس کی شکایت ضرور ہے، کہ انھوں نے لکھنؤ کے ظلمت کدہ میں بیٹھ کر صحیفۂ معرفت کی ورق گردانی کی کوشش فرمائی ہے، ظاہر ہے کہ ایک نگاہ جو صرف شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیوں کی فریب خوردہ ہے، حیات انسانی کے رموز قدس کی ادا شناس کیونکر ہو سکتی ہے؟ ایک ہاتھ جو مدت سے صرف رقیب کی زد و کوب میں مصروف رہا ہو، حریم محبت کے پردہ ہائے لطیف کو کیونکر الٹ سکتا ہے؟

حریف کاوش مژگان خونریز ش نۂ زاہد بدست آور رگ جانے و نشتر را تماشا کن

مرزا صاحب بھی روشنی کے طالب ہیں، افسوس ہے، کہ لکھنؤ کی فضا اس سے محروم ہے، کیا مرزا صاحب اس ظلمت کدے سے باہر قدم نکالنا چاہتے ہیں، کیونکہ بغیر اسکے انکی نگاہیں روح انسانی کی ان پر کیف حیات مخفیہ کی ادا شناس نہیں ہو سکتیں، جو در اصل صحیفۂ شاعری کے ابدی نقوش ہیں، معلوم نہیں، کہ لکھنؤ کے "خفتگان لحد" کی صبح حشر کب نمودار ہوگی،

مرزا صاحب نے شعر مذکورۂ بالا کا جو مطلب بیان کیا ہے، وہ حقیقت میں اس پامال مقولہ یعنی "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" کی صدائے بازگشت ہے، مرزا صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ بجائے خود بے شبہ ایک صحیح خیال ہے، لیکن وہ شعر زیر بحث کا مفہوم ہرگز نہیں ہے اس غلط فہمی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مقام جہل سے یہ مراد لیا کہ "جہل کی تھاہ نہیں ملتی" حالانکہ یہاں اس سے مطلب درجۂ و

کے ہیں، یعنی جہل فریب شہود ایک درجہ ہے جو علم فریب شہود سے بالاتر ہے، کیونکہ جہل میں انقیاد و طاعت کی تجلی نمایاں ہے، اور علم و عرفان ایک قسم کی سرکشی کی بو آتی ہے، دونوں میں ایک عاشق از خود رفتہ کے نقطۂ نظر سے جو عظیم الشان فرق ہے، اس کو ہر صاحب ذوق حس کر سکتا ہے، مرزا صاحب کو شاید یہ معلوم ہو کہ ارباب نظر کے نزدیک مجذوب کی عظمت ایک سالک سے نسبتہً کم ہے، کیونکہ ایک عالم ب میں دنیا اور اس کے تعلقات سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے، اور دوسرا دین و دنیا دونوں کو ساتھ لیکر چلتا ہے، کیونکہ اس کے خالق کا حکم ہے، اسلام نے بے شبہ حیات دنیاوی کو لہو و لعب قرار دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ "لاتنس نصیبک الدنیا" یعنی دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے، اس کو مت بھولو، اس کا مقصد یہ ہوا کہ دنیا کو کوئی مستقل چیز سمجھکر اس کے دام حرص میں مبتلا نہ ہو جاؤ جہاں تک ہو سکے جائز حدود میں رہ کر اس کی رنگینیوں سے بہرہ اندوز ہو، اور اپنے فرائض منصبی سے غافل نہ رہو، حضرت اصغر نے دراصل شعر میں اسی لطیف حقیقت اسلامی کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کو مرزا صاحب سمجھ نہ سکے، دو انسانوں کی فطری استعداد و صلاحیت کا لاف دیکھو کہ اصغر نے ایک لطیف حکیمانہ نکتہ بیان کیا، اور توقع کی کہ دنیا اس کی لطافت پر وجد کریگی، لیکن اثر کی جدت طرازیوں نے کھینچ تان کر کو ایک عامیانہ خیال بنا دیا اور پھر اس فقیر پر شعر نہ سمجھنے کا الزام بھی ہے"۔

مرزا صاحب میری تشریح کو اصغر کے "فلسفیانہ وحدت آشنا" دماغ کے لئے توہین سمجھتے ہیں، لیکن معلوم نہیں جناب اصغر مرزا صاحب کی اس ظالمانہ جدت کو اپنے لئے کہاں تک سرمایۂ فخر و عزت خیال کرتے ہیں!

مرزا صاحب کو حیرت ہے کہ جس کے دماغ سے یہ شعر نکلا ہو،

میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود　　میرا ہی کچھ غبار ہے، دنیا کہیں جسے

"اور جو دنیا کے متعلق یہ کہے کہ میرا ہی کچھ غبار ہے، وہ اور فریب شہود کے سامنے سر جھکائے!"

لیکن میں باادب عرض کرونگا، کہ جو شخص اپنی عالی نظری سے عرصۂ وجود کو محض اپنی گرم روی کا غبار سمجھتا ہے، اسی کی نکتہ رس نگاہوں س غبار کے ذروں میں انوار ازل کی جھلک بھی نظر آسکتی ہے، وہی اس رمز لطیف سے بھی واقف ہو سکتا ہے کہ دنیا کی لطافتیں اسی کے ل و دماغ کی ضیافت کے لئے ہیں، اور کسی کے لئے نہیں ہیں، البتہ اسکو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان سب مناظر و مظاہر کا حقیقی مبدا و انیت کہیں اور ہے،

سر رشتۂ روشنی بدست دگر است　　پروانہ و شمع را تماشا کردم،

مرزا صاحب کے استعجاب کی ایک وجہ غالباً یہ بھی معلوم ہوتی ہے، کہ انھوں نے فریب شہود سے شاید دنیاوی حرص و طمع مراد لے رکھی ہے یسا ہے، تو بے شبہ اصغر کے حقیقت شناس دل و دماغ کی توہین ہے، لیکن یہاں اس سے حیات انسانی کی رنگینیوں اور لطافتوں سے د ہے، جو فریب اس لئے ہیں کہ وہ کوئی مستقل چیز نہیں، تاہم وہ انسان ہی کے لئے ہیں، اصغر کا سر نیاز فریب شہود کے سامنے اس لئے ں جھکتا، کہ خود اس میں کوئی لذت ہے، بلکہ اس لئے جھکتا ہے کہ نقاش قدرت کا یہی منشا ہے، علم و عرفان کا تقاضا چونکہ یہ ن ہی اس لئے وہ اس کو جہل سے فروتر سمجھتا ہے،

مرزا صاحب کو فریب شہود کے سامنے سر جھکانے پر حیرت ہے، لیکن خود تحریر فرماتے ہیں؛

"یہ تمام رنگینیاں اور لطافتیں صرف انسان کے واسطے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے فریب سے ان کے طلسم میں گرفتار نہ ہو جائے ان کو محبوب نہ بنائے، بلکہ یہ سمجھے کہ عہد الست کی یاد دلانے والی نشانیاں ہیں"

ناظرین خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے ہمارے خیال کی کس حد تک تائید ہوتی ہے، اصغر نے یا میں نے کب یہ کہا کہ انسان دنیا کو مستقل محبوب بنائے اور "عہد الست" کو بھول جائے، میں نے "بھی برابر عرض کیا ہے کہ گو مجھے اس کا احساس ہے، کہ دنیا فریب محض ہے، لیکن چونکہ مصور ازل نے یہ تمام نقش آرائیاں میرے ہی چشم شوق کے لئے کی ہیں، اس لئے مجھے ان سے کیف اندوز ہونا چاہئے لیکن فتور فہم کا کیا علاج ہے؟ مرزا صاحب کو جب یہ تسلیم ہے کہ "تمام رنگینیاں اور لطافتیں صرف انسان کے واسطے ہیں" تو پھر ان کو نظر انداز کرنا کیا "مشیت الٰہیہ" کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

افسوس ہے کہ جناب اثر نے شعر زیر بحث کے بعد کا شعر ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ وہ ہرگز اس افسوسناک غلطی میں مبتلا نہ ہوتے، وہ شعر یہ ہے؛

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہے اک جبین سجود

یہ مسلسل نظم کے اشعار ہیں جو اصغر نے نعت میں لکھی ہے، ایک مسلسل نظم میں ہر شعر کو دوسرے شعر سے ایک خاص معنوی تعلق ہوتا ہے اسلئے کسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس کے قبل و بعد کے اشعار پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے، کیونکہ اس سے اصل مفہوم کے سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، غزل میں چونکہ ہر شعر بجائے خود ایک مستقل خیال ہوتا ہے، اس لئے وہاں گرد و پیش کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن ایک مربوط اور مسلسل نظم میں اشعار کے ربط باہم کا لحاظ نہایت ضروری ہے؛

اب ناظرین دونوں اشعار کو پیش نظر رکھکر غور کریں کہ در اصل جناب اصغر کا کیا مفہوم ہے، اگر مرزا صاحب کا مطلب تسلیم کر لیا جائے تو دوسرے شعر کا مفہوم بالکل بے کار ہو جاتا ہے، اور نہ اشعار میں باہم کوئی معنوی ربط باقی رہ جاتا ہے بلکہ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ پر مستقل خیال بن جاتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ ایک مسلسل نظم میں پریشان گوئی کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی، لیکن جو مطلب میں نے عرض کیا ہے اگر اس کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو دونوں اشعار میں ایک خاص ربط پیدا ہو جاتا ہے، اور نظم کی کوئی کڑی ٹوٹنے نہیں پاتی، بلکہ دونوں شعر کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہوئے میں باادب یہ عرض کرنیکی جرأت کروں گا، کہ جو کچھ میں نے تشریح کی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا مفہوم ممکن ہی نہیں اور اگر ممکن ہے تو وہ صرف ایک یاد رہوا حدیث ہوگی، جیسا کہ مرزا صاحب نے کی ہے؛

غور کرو دوسرے شعر نے میرے مفہوم کو کس قدر واضح اور روشن کر دیا ہے، انسان کا وجود سرتاپا انقیاد و طاعت ہے، نیاز و بندگی فطرت میں داخل ہے، اس نے روز ازل بلی کہکر ہمیشہ کے لئے اپنی گردن میں حلقۂ عبودیت ڈال لیا ہے، اس لئے وہ فطرۃً مجبور ہے کہ [illegible] کے سامنے [illegible] خم کرتا رہے، ایک نیاز مند کی شان نیاز اسی کی متقاضی ہے، کہ وہ اپنی ہستی کو سرتاپا [illegible] چشم [illegible] اس کا اندازہ ہے کہ بزم شہود فریب محض ہے [illegible]

لطافتوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں، کیونکہ میں سرتاپا نیاز و بندگی ہوں، اور بساط آرائے شہود کے اشاروں کے سامنے جھکنے کے لئے مجبور
ں، اس موقع پر ناظرین ایک مرتبہ اور دونوں شعروں کو ایک ساتھ پڑھیں۔

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفان نے   میں بے خبر ہوں یا ندازۂ فریب شہود

کیوں؟ اس لئے کہ

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے   کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہے اک جبین سجود

اور انصاف کریں کہ مرزا صاحب نے جو مفہوم بیان کیا ہے، وہ کس حد تک دونوں شعروں کی مجموعی ترکیب سے مترشح ہوتا ہے، دوسرا
عر جس کے مطلب پر مرزا صاحب کو اعتراض ہے، یہ ہے،

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا   اس رُخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

اس کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب فرماتے ہیں:-
پہلے مصرعہ میں لفظ اس کی ضمیر نظر کی طرف نہیں (جیسا غالباً مرزا صاحب کا خیال ہے، اگرچہ انھوں نے اس امر کو مبہم ہی رہنے دیا) بلکہ
رخ کی طرف پھرتی ہے، معشوق کے رُخ میں جہان اور جلوے تھے وہاں ایک ایسا بھی جلوہ تھا جو میری نظر کی نورانی شعاعوں سے
مشابہ تھا،

میرا مطلب بھی ناظرین پیش نظر کرلیں، وہ یہ ہے،
"اکثر انسان میں مخصوص صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو مخفی اور غیر محسوس رہتی ہیں، لیکن جب کوئی خارجی اثر محرک ہوتا ہے، تو وہ دفعۃً چمک
اٹھتی ہیں، جب تک رُخ رنگیں سے نظر فیضیاب نہیں ہوئی تھی، اس وقت اس کی معجز نمائیوں کا احساس نہ تھا"
مرزا صاحب فرماتے ہیں،
عاشق کو رخ پر نور کا جلوہ دیکھنا نصیب ہوا، شوق کی بے تابی اور جلوے کی خیرگی نے خد و خال کو دم بھر کے واسطے نمایاں کر کے
آنکھ سے اوجھل کر دیا فقط ایک تار شعاعی چہرۂ معشوق سے عاشق کی نظر تک قایم ہوگیا"..........
افسوس ہے کہ جناب اثر باوجود ادعائے شعر فہمی کے اصلی مفہوم تک نہ پہونچ سکے، بلکہ جو کچھ انھوں نے سمجھا وہ بالکل الٹا دماغی ساخت
[illegible]ز ہوتی ہے، مرزا صاحب نے اپنے مفہوم کی تائید میں پہلے مصرعہ میں لفظ "بھی" اور دوسرے مصرعہ میں لفظ "اب" پر زور دیا ہے لیکن
[illegible]ل گا کہ انھی الفاظ سے ان کی نزاکت آفرینی کی تردید ہوتی ہے؛ "لفظ اب" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظر میں کوئی خاص رنگینی پیدا
[illegible] پہلے موجود نہ تھی، یا اگر موجود تھی، تو کم از کم اس کا احساس نہ تھا، اور اب کسی خارجی محرک نے محسوس کرا دیا ہے، اسی لئے شاعر کہتا ہے
[illegible] اپنی نظر کو دیکھتا ہوں کہ اس میں کیا کیا جلوے ٹپک رہے ہیں، اور اس کو یک گونہ حیرت ہے کہ میری نظر میں یہ سحر کاریاں بھی موجود
[illegible] اب مجھے ہوا ہے، یعنی جب رُخ رنگیں سے فیضیاب ہوئی اگر پہلے مصرعہ میں "اس" کی ضمیر جیسا کہ مرزا صاحب کا خیال
[illegible] راجع ہے، تو شاعر کو رخ ہی کو دیکھنا تھا، وہ رخ پر اپنی نظر کو کیوں دیکھ رہا، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ نظر کو

کوئی خاص کیفیت پیدا ہوگئی ہے، جو اب تک غیر محسوس تھی، ورنہ پھر نظر کو دیکھنے کے کیا معنی؟ اگر وہ جلوہ رخ کا ہے، جو نمودار ہوا ہے، تو دیکھنے والے کو اسی میں محو ہوجانا چاہیے تھا، اپنی نظر کے دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ نظر تو پہلے بھی موجود تھی، لیکن اس نے نہیں دیکھا، اب اس میں کیا خاص رنگینی پیدا ہوگئی ہے، کہ شاعر بجائے رخ کے اپنی نظر کو دیکھ رہا ہے، اگر اس کی رنگینی کا اس کو پہلے سے احساس موجود تھا تو لفظ "اب" بالکل بے کار ہوجاتا ہے اس سے قطعی طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ کسی خارجی اثر کے پرتو فیض نے نظر کی کوئی خاص کیفیت بے نقاب کردی ہے جس کی لذت میں وہ اس وقت محو ہے اور وہ خارجی اثر یقیناً جمال محبوب کا پرتو ہے۔

اگر اس کی ضمیر رُخ کی طرف راجع ہے جیسا کہ مرزا صاحب کا خیال ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخصوص جلوہ کون سا ہے، جسکو مرزا صاحب کے ذوق نظر نے عریاں کردیا ہے، مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ "وہ جلوہ میری نظر کی نورانی شعاعوں سے مشابہ تھا" اگر یہ صحیح ہے، تو یہ خود آپ کی نظر ہی کا جلوہ تھا، جو رخ محبوب پر منعکس ہوا، خود رُخ محبوب کا وہ جلوہ کہاں ہے، جو اب تک چھپا ہوا تھا، اور جس کو آپ کے کیف نظر نے بے نقاب کردیا؟

علاوہ اس کے اگر مرزا صاحب کا ارشاد صحیح مان لیا جائے، تو اس سے ان پر ضعف عشق کا الزام عائد ہوتا ہے۔ کمال عشق کا تقاضا ہے کہ محبوب کی ذات کو ہر قسم کے جلووں کا جامع تصور کرکے اس سے اظہار محبت کیا جائے، معشوق سراپا حسن ہے، اس میں ہر قسم کا جلوہ پہلے سے موجود ہے، وہ ہر حیثیت سے کامل ہے، اسکی معجز طرازیوں کا ظہور عاشق کے ذوق نظر کا رہین منت نہیں ہے، بلکہ خود ذوق نظر کی رنگینیاں اس کے فیضان جمال کی محتاج ہیں، اصغر کا دل ہمہ تن نیاز عشق سے لبریز ہے، وہ حریم حسن کے آداب کا محرم خاص ہے، اس کے نزدیک جمال محبوب تمام روحانی فیوض وبرکات کا سرچشمہ ہے اس کی نظرت اپنی حقیقی نشو ونما کے لئے اسی کے نگاہ کرم کی محتاج ہے، وہ اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہوسکتا کہ اس کا ذوق نظر جمال یار کے جلووں کو بے نقاب کرے، یہ ہمت صرف اثر صاحب ایسے عاشق کی ہوسکتی ہے، جن کی نگاہیں ابھی تک لب بام سے آگے نہیں بڑھ سکیں، اور غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کی تشریح کے وقت لب بام ہی کا سماں اثر صاحب کے پیش نظر تھا، یعنی عاشق کوٹھے کے نیچے کھڑا ہے، دفعتہً معشوق لب بام آکر جلوہ فرما ہوتا ہے، نگاہیں چار ہوجاتی ہیں، اور نظر بازی کا ایک پر لطف سماں بندھ جاتا ہے، اور پھر غور کرو کہ اس میں کون سا لطیف پہلو ہے، جسپر ذوق سلیم وجد کرے،

طبیعتوں کی اثر پذیری کا فرق مراتب دیکھو جمال یار کی شعاعیں اثر اور اصغر دونوں پر جلوہ فگن ہوتی ہیں، لیکن ایک محض لطف نظر اٹھاکر رہ جاتا ہے اور دوسرے کی مخفی استعداد سے فطرت کا آئینہ دفعتہً چمک اٹھتا ہے، اور اس کو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ذرۂ ناچیز میں بھی یہ جلوہ طرازیاں پنہاں ہیں۔

ان تصریحات کے بعد اب ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ میں نے جو مطلب عرض کیا تھا وہ کس حد تک خود شعر کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، اور مرزا صاحب کی جدت طرازی نے مفہوم کی لطافت کو کہاں تک پامال کردیا ہے،

اس کے علاوہ دو اشعار اور ہیں، جن پر مرزا صاحب کا اعتراض ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں کے مطالب میں اختلاف کیا ہے، بجز اس کے کہ میں نے جس مفہوم کے متعلق چند فقروں میں اجمالاً اشارہ کیا تھا، اس کو مرزا صاحب نے متعدد سطروں میں پھیلا کر لکھدیا،

ورنہ غور سے دیکھا جائے، تو بات ایک ہی ہے، جو مختلف الفاظ میں ادا کی گئی ہے، ناظرین خود ملاحظہ کر سکتے ہیں، طوالت کے لحاظ سے ہم دوبارہ ان کو نقل کرنا نہیں چاہتے،

یہ سب تو ضمنی باتیں تھیں، اب میں اپنی اصلی جرم کی جوابدہی کی طرف رجوع کرتا ہوں، جو غالباً خاص طور پر اثر صاحب کی اس پرغیظ تنقید کا محرک ہوا ہے، میرا حقیقی جرم یہ ہے، کہ میں لکھنؤ کے مذاق شعری کا مخالف ہوں؟ میں نے لکھنؤ کے گزشتہ اور موجودہ شعرا پر اصغر کو ترجیح دی، میں نے گریۂ وزاری، فریاد و ماتم، اور یاس و حسرت ایسے مقدس جذبات کی مذمت کی؟ اور سب سے بڑھکر یہ کہ میں نے نشاط روح شائع کر کے اساطین لکھنؤ کے اقتدار و عظمت کی شاہنشاہی کو متزلزل کر دیا؟ لیکن اثر صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شاعری لکھنؤ کی میراث نہیں، جہاں تک روزمرہ اور عام بول چال کا تعلق ہے حضرات لکھنؤ جس قدر چاہیں، زباندانی پر فخر کریں لیکن علمی اور ادبی رزمگاہ میں ان کو دوسرے حریفان فن کے لئے اب جگہ خالی کرنی پڑیگی، ——— آپ جزئی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو نمایاں کر کے روح نشاط کی اہمیت کو کسی قدر گھٹانا چاہیں، لیکن ارباب نظر کے نزدیک اس کی عظمت مسلم ہے، آپ رنج و تعب میں جس قدر چاہیں خاک اڑالیں، لیکن اصغر کے آفتاب کمال کی شعاعیں اس پردۂ کثیف میں سے بھی چھن چھن کر گزرتی رہیں گی، اور لذت آشنا قلوب کو منور کرتی رہینگی، اب آپ اپنے زنگ آلودہ آئینۂ سخنوری کو کسی قدر محفوظ رکھنے کی کوشش فرمائیں، لیکن اب اصغر کی مستانہ جنبش قلم اس کو پیام شکست دے چکی ہے، آپ کسی قدر بلند آہنگی کے ساتھ مخالفت کا شور مچائیں، لیکن اصغر نے جو ترانۂ سرمدی چھیڑ دیا ہے اس سے فضائے آسمانی ہمیشہ گونجتی رہیگی، دنیائے ادب اسی وقت تک طلسم باطل کے سامنے سرنیاز خم کر سکتی تھی، جب تک جمال حقیقت اس کی نگاہوں سے مخفی تھا، لیکن اب اصغر کے ظہور نے ان تمام پردہ ہائے فریب کو دفعتہً الٹ دیا اور تشنگان ذوق کو نظر آگیا کہ اب تک جو کچھ ان کے سامنے تھا اس میں کوئی مستقل کیفیت یا لذت نہ تھی، بلکہ محض تصنع اور تکلف کا ایک طلسم بے ثبات تھا، اس بنا پر معتقدین لکھنؤ کو اگر نشاط روح کی اشاعت نے پریشان و سراسیمہ بنا رکھا ہے، تو کچھ محل تعجب نہیں، ان کو معلوم ہے کہ ان کی وہ شان انانیت جو صرف تحسین ناشناس کے بل پر قائم تھی اب اس کی بربادی کا وقت آگیا ہے، اس لئے فطرت مقتضی ہے کہ وہ مخالفت میں اپنا سارا زور طبع صرف کر دیں، چنانچہ اصغر پر جو طعن و تعریض کی جا رہی ہے مجھکو اس سے کوئی شکایت نہیں اور نہ اصغر کو اس کی پروا ہونی چاہئے کیونکہ ہم دونوں مجرم ہیں، اصغر کا جرم یہ ہے کہ ان کی شاعری حضرات لکھنؤ کی دماغی سطح سے اس قدر بلند کیوں ہے؟ اور میری خطا یہ ہے کہ میں نے ادبی دنیا کو اس سے روشناس کیوں کرایا، بہرحال اب تو غلطی سرزد ہو چکی، اور مجرموں کو اس کا اعتراف بھی ہے، آئندہ اس کا جو کچھ نتیجہ ہو اس کا ہم کو کوئی اندیشہ نہیں، لیکن اس کا افسوس ضرور ہے، کہ مخالفت کے جوش میں اکثر اصحاب کے ہاتھ سے تہذیب و متانت کا سررشتہ چھوٹ گیا ہے، اور بجائے آزادانہ تنقید کے علانیہ گالیاں دیگئی ہیں، چنانچہ عرصہ ہوا کہ "نیرنگ خیال" میں ایک مضمون "ادب آموز" کے نام سے شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا! "نشاط روح پر وکیلوں کی مقدمہ طرازی یا بھینڈیتوں کی بھینڈیتی" اس مضمون میں جسقدر رکیک، مبتذل اور بازاری تلے ہو سکتے تھے، وہ سب میر سہیل، اور اصغر کی ذات پر کئے گئے تھے، تنقید میں ذاتیات پر اتر آنا، اور محض ذاتی بغض کی بنا پر محاسن کی پردہ پوشی کرنا سب سے زیادہ انتہائی دنائت، کم ظرفی، اور پست خیالی کی دلیل ہے، مضمون کو پڑھنے کے بعد مجکو ہنسی آئی، کہ نام تو "ادب آموز" رکھا ہے، لیکن خود جناب کی

تہذیب و شائستگی کا یہ حال ہے کہ ایک مہذب اور شریفانہ فقرہ بھی قلم سے نہ نکل سکا، اکثر احباب نے تحریک کی کہ اس کا جواب دیا جائے، لیکن میں اس قسم کی ہرزہ سرائیوں سے اعتنا کرنا اپنے قلم کی توہین سمجھتا ہوں، ان کا جواب صرف بے نیازانہ سکوت ہے، البتہ اثر صاحب جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک حد تک متانت و سنجیدگی پر مبنی ہے، اس لئے اس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوا،

حقیقت یہ ہے کہ حضرات لکھنؤ نے اب تک تغزل کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، یعنی اس کے عناصر اصلی کیا ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے؟ اور غزل میں کس قسم کے جذبات ادا ہونے چاہئیں؛ مجکو اس سے انکار نہیں، کہ درد و غم بھی تغزل کے دائرہ سخن کے اندر داخل ہے، لیکن افسوس اس کا ہے، کہ حضرات لکھنؤ نے غلطی سے درد و غم اور سوز و گداز کا مفہوم نوحہ خوانی اور گریہ و زاری سمجھ لیا، حالانکہ در اصل ان چیزوں کو عشق سے کوئی تعلق نہیں، سوز و گداز فی نفسہ ایک لطیف و دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جس سے ایک ادا شناس محبت کا قلب معمور ہوتا ہے، اس کے نزدیک عشق مجسم لذت ہے جس کی ہر ادا ہر کیفیت، خواہ وہ خوشی کی ہو یا غم کی، سرمایۂ حیات ہے، وہ اپنے درد دل کا اظہار ضرور کرتا ہے، لیکن وہ روتا نہیں، کبھی کبھی جوش بے تابی میں اس کی آنکھوں سے کچھ دو قطرے بے محابا ضرور ڈھلک پڑتے ہیں، لیکن وہ سینہ کوبی نہیں کرتا، کیونکہ اس کے نزدیک خود درد و غم میں ایک ابدی لذت پنہاں ہے، جس میں وہ ہر وقت محو رہتا ہے، اس لئے اس کو فریاد و ماتم کی فرصت نہیں، چنانچہ اصغر نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہاے درد و الم درد و غم کی لذت ہے ۔۔۔ وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

لیکن افسوس ہے، کہ لکھنؤ کی بد مذاقی نے درد عشق کو ایک مستقل مادی مرض بنا دیا جس کی تکلیف سے کبھی مریض بستر پر کروٹیں بدلتا ہے کبھی نالہ نیم شبی سے ہمسایوں کی نیند حرام کر دیتا ہے، کبھی اعضا میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے، کبھی رگیں کھنچنے اور ٹوٹنے لگتی ہیں، کبھی چہرہ زرد پڑ جاتا ہے کبھی ہچکیاں آتے آتے دم گھٹنے لگتا ہے، بالآخر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے، بے وفا معشوق کا اب بھی پتہ نہیں، روح پرواز کر جاتی ہے، جنازہ نکلتا ہے، نوحہ خوانی ہوتی ہے، اور آزار محبت سے نجات مل جاتی ہے، حضرات لکھنؤ کے گداز محبت اور درد عشق کی یہی کل سرگذشت ہے، جس پر ان کو دعا ہے، کہ وہ تغزل کے رمز شناس ہیں، کیا گریہ و بکا، آہ و زاری، اعضا شکنی، جنازہ و میت وغیرہ اسی مقدس درد محبت کے آثار و علائم ہیں، جس کی فیضان بخشی کی نسبت حافظ نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ۔۔۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کیا یہ تمام مصیبتیں، یہ تمام بے چینیاں، اسی عشق کے جور و ستم کی نشانیاں ہیں جس کو ایک لذت شناس حقیقت نے تمام علتوں کا طبیب قرار دیا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ۔۔۔ اے طبیب جملہ علت ہائے ما

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ عشق روح انسانی کے نشو و نما کا حقیقی سرچشمہ ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ بجائے خود ذوق و وجد کا ایک مستقل عالم ہے اگر یہ صحیح ہے کہ اس کے فیضان جمال سے ایک مشت خاک تجلیات ربانی کا آئینہ بن جاتی ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ روح کی تسکین اور دل کا نور ہے، اگر یہ صحیح ہے، کہ اکسیر محبت کفر کو ایمان بنا سکتی ہے تو یقیناً اس کی شان آہ و بکا گریہ و زاری ہجر و وصل کے حدود سے کہیں زیادہ ارفع

اور اعلیٰ ہے۔

اس میں شبہ نہیں، کہ سوز و گداز تغزل کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن حضرات لکھنؤ کے نزدیک شعر میں سوز اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک اسمیں کچھ نوحہ گری کی شان نہ ہو، اثر صاحب کو کم از کم اسقدر تسلیم ہے کہ سوز و گداز آہ و بکا کا نام نہیں، لیکن پھر فرماتے ہیں،

"مگر اس کی کیا دلیل کہ آہ و بکا میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا، نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی جو ہو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہو شعر تاثیر سے خالی ہے وہ شعر نہیں، اگر خالی الفاظ ناچتے ہیں، تو وہ پریاں نہیں، بلکہ پرچھائیاں ہیں، اگر نالہ و شیون اثر سے خالی ہے، تو ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد نہیں بلکہ کرایہ کے نوحہ گر کی آہ و بکا ہے،

اس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے، کہ تاثیر شعر کی جان ہے، لیکن یہی ایک وہ شے ہے جو اساطین لکھنؤ کے یہاں مفقود ہے، چونکہ قلب کیف سے خالی ہے، اس لئے جو کچھ زبان سے نکلتا ہے، اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی، لاکھ فریاد و ماتم کرتے ہیں، لیکن بقول اثر صاحب کے صرف کرایہ کے نوحہ گر کی آہ و بکا ہوتی ہے، کسی کا کوئی عزیز دوست مرجائے تو بے شبہ اس کے لئے آہ و بکا زیبا ہے، لیکن عشق جو اول سے آخر تک ہمہ تن ذوق و وجد ہے، اس کے لئے یہ مبتذل ادا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتی، اس کی شان نیاز عاشق کے قلب میں صرف ایک لطیف پُر درد کیفیت کی جویاں ہے، جس سے حضرات لکھنؤ کا کلام ابتک تقریباً ناآشنا ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ باوجود لفظی خراش تراش کے اثر کا پتہ تک نہیں ہوتا غم آمیز اور پُر درد اشعار کو میں بُرا نہیں سمجھتا، لیکن سوال یہ ہے، کہ کیا بغیر فریاد و ماتم، آہ و بکا، جنازہ و میت، تشنج اعضا، عالم نزع وغیرہ کے شعر میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا؟ کیا یہی چیزیں درد محبت کا سرمایہ ہیں؟ اثر صاحب کا یہ ارشاد صحیح ہے، کہ اصغر کے کلام میں پر گداز اشعار کی کمی نہیں، چنانچہ بطور نمونہ کے انھوں نے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں، جو حسب ذیل ہیں،

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا کہاں ہے آج تو اے آفتاب تیرہ شبی

اک شورش بے حاصل اک آتش بے پروا آتشکدہ دل میں اب کفر نہ ایماں ہے

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

خاک پروانے کی برباد نہ کر باد صبا یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

پہلے شعر پر اثر صاحب کا نوٹ ہے کہ "اک نشتر ہے جو روح کو تڑپاتا ہے" لیکن باوجود اس کے شعر میں کہیں نوحہ و ماتم کا اثر تک نہیں ہے،
دوسرے شعر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "حرمان و افسردگی کا ایک مکتوب ہے" لیکن کہیں نالہ و بکا سے کام لیا گیا ہے؟
تیسرے شعر کے متعلق سوال ہوتا ہے کہ "کون صاحب اس پر بجائے دل تھامنے کے رقص کریں گے" لیکن کہیں جنازہ و میت کا تذکرہ اس شعر میں آیا ہے؟

آخری شعر اثر صاحب کے نزدیک "عبرت کا ایک مستقل درس ہے" لیکن کہیں نزع وجانکنی یا قبرستان کی وحشت کا سمان نظر آتا ہے، خود مرزا صاحب کی پیش کردہ مثالوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے، کہ سوز و گداز دراصل گریہ و بکا، نالہ و ماتم، جنازہ و میت وغیرہ سے بالکل علیحدہ شے ہے اور جس چیز کو حضرات لکھنؤ نے درد و غم سمجھ رکھا ہے، وہ درد و غم نہیں، بلکہ نوحہ گری ہے، جو مرثیہ میں زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے، لیکن تغزل کی لطافت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی،

اثر صاحب بھی کم از کم اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ جذبۂ حزن طاری کرنے کے لئے لازم نہیں کہ سینہ کوبی و آہ و زاری ہی سے کام لیا جائے" لیکن جو چیز ایک مدت سے جزو فطرت بن گئی ہے اس کا اثر کہاں جا سکتا ہے" اس کے بعد ہی یہ فقرہ قلم سے نکل جاتا ہے،

"مگر یہ بھی فرض نہیں کہ انھیں ایکدم خارج کر دیا جائے"

کیوں؟ جب آپ کو یہ تسلیم ہے، کہ جذبۂ غم کے اظہار کے لئے سینہ کوبی ضروری نہیں، تو پھر ایک غیر ضروری اور بیکار چیز کیوں قائم رکھی جائے؟ یہ منطق میرے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اس سلسلہ میں ایک امر اور دریافت طلب ہے، کہ کیا "جذبۂ حزن طاری کیا جاتا ہے" یا خود ایک فطری کیفیت ہے جو پہلے سے شاعر کے دل کے اندر موجود رہتی ہے، اگر اثر صاحب کو شعر کہنے سے قبل اپنے اوپر جذبۂ حزن" طاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہو تو بے شبہ وہ کبھی سینہ کوبی و آہ و زاری کو خارج نہیں کر سکتے، کیونکہ ایک شخص جس کے دل میں درد نہیں، اگر غمگین صورت بنانا چاہتا ہے، تو خواہ مخواہ اس کو آہ و زاری سے کام لینا پڑے گا، لیکن ایک دردمند ازلی کو اس تصنع و تکلف کی ضرورت نہیں، اسپر تو ہر وقت ایک اضطراب پیہم کی کیفیت طاری رہتی ہے وہ فطرتاً غم آشنا ہے، اس کی ہر ادا درد محبت میں ڈوبی ہوئی ہے، اس لئے اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے تیر و نشتر کا کام دیتا ہے،

ایک دوسرے مقام پر اثر صاحب میرے خیال کی ان الفاظ میں تائید فرماتے ہیں،

"یہ سچ ہے کہ اگر حیات کا نام محض خوشی و مرگ کی نشانیاں صرف اعضا کا اینٹھنا بدن کا پھڑکنا، پتلیوں کا پھرنا، نبضوں کا مٹنا ہے تو ایسی شاعری کو دور سے سلام، اگر حیات و مرگ کے اسرار بیان کئے گئے ہیں تو ایسی شاعری قابل قدر ہے، عام اس سے کہ اسے پڑھکر یا سنکر ہمیں خوشی ہوتی ہے یا رنج"

"شاعری خوشی کی خوشی اور غم کا غم نہیں کرتا، بلکہ ان کا فلسفہ بیان کرتا ہے، حقیقت ایک ہے، صورتیں مختلف ہیں، خوشی ہو کہ غم ہو، حیات ہو کہ ممات ہو، شاعر کا کام شاہد حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے ...."

ان اقوال کی صداقت سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن سوال تو یہی ہے، کہ حضرات لکھنؤ کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے؟ کیا ان کے آئینۂ کلام میں اسرار حیات کی جھلک نظر آتی ہے؟ کیا سینہ کوبی و آہ و زاری ہی کا نام فلسفۂ غم ہے؟ کیا لب بام ہی شاہد حقیقت کی جلوہ گاہ ہے؟ کیا رگوں کے اینٹھنے اور پتلیوں کے پھرنے ہی میں اسرار فنا پنہاں ہیں؟ کیا اعضا شکنی ہی کو اضطراب محبت کہتے ہیں؟ کیا فلسفۂ سکوت عالم نزع ہی کی خاموشی کا نام ہے؟ کیا درد عشق کی لذت کا یہی تقاضا ہے، کہ گریہ و زاری کیجائے؟ کیا دل جو انوار ربانی کا گہوارۂ رقص ہے، بس کی یہی حقیقت ہے جو حضرت عزیز نے اس شعر میں بیان فرمائی ہے،

فطرت کو بھی خیال مکافات عشق تھا　　دل نام اک فرشتہ بنایا عذاب کا

بہرحال ہمارے لائق دوست کو اپنی رونق محفل کے لئے جنازہ و میت، نالہ و ماتم، شور و بکا وغیرہ کی کسی قدر ضرورت ہو، لیکن کم از کم میرا یہ خیال راسخ ہے، کہ اس قسم کے مبتذل اور عامیانہ خیالات کو تغزل سے بالکل خارج کر دینا چاہئے۔ لیکن اثر صاحب کا ذوق سینہ کوبی اسکو کب گوارا کر سکتا ہے، چنانچہ غضبناک انداز میں ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ خیال وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ غزل میں حسرت و یاس، مرگ، میت، جنازہ، نزع اور اس قبیل کے مضامین نظم نہ کرنا چاہئے اثر صاحب اگر اس خیال کو وبا سمجھکر ڈر رہے ہیں، تو بالکل حق بجانب، کیونکہ اگر یہ خیال عملی صورت اختیار کرے تو بیچارے لکھنؤ والوں کی کل کائنات شاعری ہی برباد ہو جاتی ہے، بہرحال نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن مذاق شعری کی صلاح کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس مبارک خیال کو پھیلانا چاہئے، تاکہ اردو شاعری کو اس وبا سے نجات ملے، جو لکھنؤ کی بدمذاقی نے ایک مدت سے پھیلا رکھی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لطیف بات جو اثر صاحب نے کہی ہے، وہ یہ ہے:

"مجھے اس پست ہمتی پر سخت افسوس ہے، اس قوم کے افراد اپنی بات اور اپنے ایمان کے واسطے خوشی خوشی کیا جان دیں گے جو موت کا نام سنکر کانپتے ہیں، جو اس قدر عیش و راحت کے حریص ہیں، اور درد و غم کے منتشر کرنے والے جذبات پر عمل پیرا ہونا تو کیسا ان کے ذکر سے گھبراتے ہیں..........."

ہمارے لائق دوست کا معیار شجاعت قابل داد ہے! کیا گریہ و زاری، فریاد و ماتم بہادروں کا کام ہے؟ ایک شخص جسکی زندگی آہ و بکا میں گزری ہو، کیا اس سے جانبازی کی توقع کیجا سکتی ہے؟ کیا حضرات لکھنؤ جن کی شاعری کا کل ماحصل صرف نوحہ و ماتم ہے، سرفروشانہ موت کے لئے تیار ہو سکتے ہیں؟ اگر وہ موت کا نام سنکر کانپتے نہیں، تو پھر یہ رونا چلانا کس لئے ہے؟ غمگین اور مایوس صورت بنا کر روتے رہنا عالی ہمتی کی دلیل ہے، یا پستی اور بزدلی کی؟ موت کو مصیبت سمجھنا بزدلوں کا شیوہ ہے، یا بہادروں کا؟ اثر صاحب کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ موت سے ڈرنے والا جانبازی نہیں کر سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسی قسم کے مضامین کسی قوم کے جذبات شجاعت کو برانگیختہ کر سکتے ہیں؟ کیا یہی حسرت و یاس، گریہ و بکا کی تعلیم ہم میں تہور و سرفروشی کے انداز پیدا کر سکتی ہے؟ کیا یہی جنازہ، میت، نزع، مرگ، آہ و بکا وغیرہ، درد و غم کے منتشر کرنے والے جذبات ہیں؟ کیا انہی چیزوں سے روح میں وہ درد و گداز پیدا ہو سکتا ہے، جو اصل بقاء حیات کا سرچشمہ ہے؟ کیا یہی آہ و فغاں کا شیوہ پامال ایثار نفس اور بلند نظری کا ثبوت ہے؟ اگر ان مبتذل اور بزدلانہ ادائوں سے اجتناب پست ہمتی ہے تو مجکو اپنی اس پست ہمتی پر خوشی ہے، لیکن میں اس فلسفہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، کہ ایک نوحہ گر بھی جانبازی کے جوہر دکھا سکتا ہے، یہ اسی نالہ و زاری کا اثر ہے، کہ لکھنؤ کی غزلیہ شاعری اب تک جوش اور کیف سے خالی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دماغ جس کو ایک مدت کے نوحہ پیہم نے افسردہ کر دیا ہو، اس میں پرکیف خیالات کی کیونکر گنجائش ہو سکتی ہے؟ وہ اگر رقص بھی کرنا چاہیگا، تو بسبب ضعف کیوجہ سے دو چار قدم پر لڑکھڑا کر گر پڑے گا، چنانچہ غزل کی غزل پڑھتے جائیے۔ بجز میت و جنازہ، یاس و غمگینی، سینہ کوبی، گریہ و ماتم کے ایک شعر بھی مشکل سے نہیں مل سکتا، جسکو پڑھکر روح پر کوئی خاص وجدانی کیفیت طاری ہو جائے، حالانکہ دراصل شعریت اسی کا نام ہے

اصغر نے نہایت سچ کہا ہے:

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

مرزا صاحب کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ:

"میدانِ غزل محض ماتم نہیں، بلکہ جذبات کی مصوری اور حقیقت کی ترجمانی ہے"

لیکن نالہ و بکا، جنازہ و تربت وغیرہ کے عامیانہ جذبات ادا کرکے ہیں ان کو "محفل عزا" بھی بنانا نہیں چاہتا، بے شبہہ غزل میں جذبات کی مصوری ہوتی ہے، لیکن اس قسم کے پست و کیف اور سطحی جذبات کی نہیں بلکہ بلند اور لطیف جذبات و احساسات کی، جن سے روح کو لذت حاصل ہو، بے شبہہ حقیقت کی ترجمانی چہرۂ غزل کا اصلی آب و رنگ ہے، لیکن یہ لب نوحہ گری کی قوت سے ماورا ہے، اس سے وہی سوختہ جان آگاہ ہو سکتا ہے، جو اس نکتہ سے واقف ہے،

شرح و بیانِ غم ہے اک مطلب مقید — خاموش ہوں کہ معنی صد ہا ہیں خامشی کے

کیا اثر صاحب اس فلسفۂ سکوت کی نزاکت پر غور فرما سکتے ہیں؟

بہر حال اگر حضرات لکھنؤ یہ چاہتے ہیں، کہ ان میں اتنی عالی ہمتی پیدا ہو کہ وہ "اپنے ایمان کے لئے خوشی خوشی جان دے سکیں" یا اسرار و معارف کی بزمِ تجلی سے فیضیاب ہو سکیں، یا انکی جنبشِ قلم خوابیدہ روحوں اور افسردہ دلوں کو مشتعل اور بیدار کرسکے، تو ان کو حزن و ملال یاس و حسرت، نزع و میت، آہ و بکا وغیرہ ایسے ولولہ شکن خیالات کو قطعاً ترک کر دینا چاہئے، کیونکہ اس قسم کے جذبات کی اشاعت سے قوم میں افسردگی پھیلتی ہے، اور نشاطِ روح کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جاتا ہے، چنانچہ لکھنؤ کی شاعرانہ فضا میں جو ایک عام افسردگی کی کیفیت طاری ہے، وہ اسی گریہ و ماتم کی عادتِ کہن کا نتیجہ ہے، اس بنا پر اخلاقی حیثیت سے بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے تمام جذبات جن سے دل و دماغ میں پستی، طبیعت میں انقباض، روح میں حزن و ملال پیدا ہو، تغزل سے قطعاً خارج کر دئے جائیں، میرے نزدیک وہ شاعری نہایت ادنیٰ درجہ کی ہے جو ہمارے بلند اور شریفانہ جذبات کو برانگیختہ نہ کر سکے یا پست کو بلند، اور بزدل کو شجاع نہ بنا سکے

یہ خیال بالکل غلط ہے، کہ شاعر تمام اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے، یا قطع نظر اس سے کہ اس کے نتائج افکار کا عوام کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اس کو اختیار ہے کہ جس قسم کے خیالات چاہے ادا کرے میرے نزدیک اس کو سوسائٹی سے گہرا تعلق ہے، وہ قوموں کے اخلاق کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے، اس لئے جو شعرا قوم کے سامنے مردہ دلی اور کم ہمتی کے جذبات پیش کرتے ہیں، وہ اگر دار و رسن کے نہیں، تو کم از کم ذوقِ سلیم کی نفرین کے ضرور مستحق ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مرزا صاحب کی عالی حوصلگی اس قسم کی تنقید گوارا نہیں کر سکتی چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ یہ مان لیجئے کہ سب نے ہذیان بکا، اگر آپ کی دلآزاری نہیں ان کے ہذیان سے کم دماغ کو پراگندہ کرنے والی نہیں ہیں"

میں نے مقدمہ میں جو کچھ لکھا تھا، اس سے ہرگز ارباب لکھنؤ کی دلآزاری مقصود نہ تھی اور نہ مجھکو اثر صاحب یا کسی اور بزرگ کی ذات سے کوئی تعلق ہے، میرے پیش نظر صرف کلام ہے، اگر اس کے معائب کی پردہ دری سے کسی کو صدمہ پہنچتا ہے، تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، اور نہ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو ان حضرات کو اساتذۂ فن ہونے کا

ادعا ہے اور ملک وقوم پر اپنی استادی کا سکہ جمانا چاہتے ہیں، لیکن دوسری طرف کم نظری اور خود بینی کا یہ حال ہے، کہ ایک معمولی سی تنقید ناگوار ہوتی ہے، اور دماغ پراگندہ ہوجاتا ہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ کہیں ان کے طلسم باطل کا راز فاش نہ ہوجائے اور عوام کے قلوب سے ان کا رعب جاتا رہے، اگر آپ بجز ارادتمندانہ تحسین وآفرین کے کوئی مخالف آواز سننا نہیں چاہتے، تو آپ منظر عام پر کلام کو کیوں لاتے ہیں؟ اور پھر تنقید سے کیوں ڈرتے ہیں؟ ایک مصنف، ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک صناع جب اپنے نتائج افکار کو بحیثیت فن دنیا کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے تو اس کو صاحبان فن کی تنقید کیواسطے بھی تیار رہنا چاہئے اگر وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا تو اسکے لئے سکوت بہتر ہے، اس انانیت کی کوئی انتہا ہے کہ آپ غرض اپنا شوق پورا کرنے کے لئے جو کچھ چاہے کہئے اور سننے والا سر نیاز خم کئے ہوئے دم بخود بیٹھا رہے! اثر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس قسم کے جبر استبداد کا دور ختم ہوچکا، اور اب دنیا پرشوکت خطابات سے مرعوب نہیں ہوسکتی وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ کس نے کہا، بلکہ یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ کیا کہا اور کیونکر کہا؟ جو کچھ کہا گیا اگر اس میں کوئی رنگینی اور لطافت ہے، تو بے شبہ وہ قدر وعظمت کا مستحق ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا مصنف کون ہے محض شخصیت اور عام شہرت کی بنا پر کسی کا کلام لازم سے خراج تحسین وصول نہیں کرسکتا۔

ہر جلوۂ مرا نتواند فریب داد   پروانۂ چراغ سر طور بودہ ایم

طبیعت کی افتاد بھی کیا چیز ہوتی ہے! باوجود ان تمام امور کے اعتراف کے کہ غزل میں لطیف اور مہذب جذبات کی مصوری اور حقیقت نگاری ہونی چاہئے، اسرار حیات بیان ہونے چاہئیں، اور سوز وگداز کے لئے سینہ کوبی ضروری نہیں پھر بھی مرزا صاحب کو لکھنو کی ادائے ماتم اس قدر عزیز ہے کہ اسپر وہ کسی قسم کا حملہ قطعاً پسند نہیں کرتے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں،

"جن لوگوں کے دل بجھے ہوئے ہیں، جن کو زمانے نے مٹا ڈالا، جن کے آداب واخلاق جن کی تعلیم جن کا پاس وضع جن سے قدیم روایت بارہا کی طرح جدھر ہوا کا رخ ہو پھرنے سے ان کو روکتے ہیں" ان سے آپ یہ توقع کیسے ہیں کہ "لیس نقر کہیں" وہ آپ کے قہقہوں میں شریک ہوں ان کو ان کے ماتمکدوں میں رہنے دیجئے اور آہ وزاری و نالہ وبکا کرنے دیجئے اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک ہونا نہیں چاہتے، تو آپ کا کیا نقصان ہے"

اگر اثر صاحب نے بجائے فلسفیانہ استدلات کے شروع میں صرف انہی فقروں پر اکتفا کیا ہوتا تو چنداں جواب کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ جب ایک شخص کو رونے ہی کی تعلیم دی گئی ہے گریہ وزاری جب اس کی محفل کے آداب ہی میں داخل ہے آہ وبکا ہی جب اس کے پاس وضع کا تقاضا ہے، جب اس نے یہ طے کرلیا ہے کہ بجز فریاد و ماتم کے اور کوئی اس کا مقصد حیات نہیں ہے، جب وہ اپنے ماتمکدے سے سر باہر نکال کر افق عالم کی گوناگوں رنگینیوں پر نظر ڈالنا نہیں چاہتا، تو پھر بقول اثر صاحب کے اس سے کیف و انبساط کی توقع رکھنا فضول ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ وہ اپنے کو زندہ انسانوں میں کیوں شمار کرتا ہے؟ اس کو پھر ایسی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کیا حق ہے جو قدم قدم پر قدرت کی رنگینیوں اور لطافتوں سے معمور ہے؟ اس کو تو ٹوٹی ہوئی قبر کی آغوش وحشت میں بیٹھ جانا چاہئے، تاکہ عرصہ گاہ دنیا کی دلچسپی دلآویزی اور دلفریبی اس کے مقدس شغل سینہ کوبی میں ایک لمحہ کے لئے بھی حارج نہ ہوسکے، آپ دنیا سے الگ کسی ماتمکدے میں بیٹھکر جسقدر

چاہئے، گریہ و بکا کیجئے، اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے، اور نہ اس مبارک ارادے سے میں آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن خدا کیلئے اپنے نوحۂ ماتم کو دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچائیے، قوم اور ملک کو کیوں افسردہ بناتے ہیں؟ اپنی پاس وضع اور قدیم روایات کی خاطر مذاق شعری کو کیوں پامال کر رہے ہیں؟ اگر زمانہ نے آپ کو پیس ڈالا ہے، اگر آپ کے دل بجھے ہوئے ہیں، اگر آپ کے آداب و اخلاق کی بنا صرف گریہ و زاری پر قائم ہے تو آپ کے اظہار مصیبت کے لئے اور بہت سے میدان ہیں، مرثیے لکھئے، محفلیں منعقد کیجئے اور دل کھولکر خوب روئیے کسی کو خردہ گیری کا حق نہیں، لیکن تغزل کی بزم لطیف میں بیٹھکر آپ اپنے گھر کی بربادی کا افسانہ کیوں چھیڑتے ہیں؟ وہاں تو نشاط حسن و محبت کی رنگینیاں ہر طرف چھائی ہوئی ہیں، لطیف اور پُرگداز نغموں سے فضا گونج رہی ہے، ذوق و وجد سے تمام منظر سرشار ہے، جمال ازل رقص میں ہے، اور ہر ہر قدم پر بجلیاں گر رہی ہیں، اس لئے اگر آپ کی آنکھیں بجز مصنوعی اشکباری کے نشاط حسن کی رنگینیوں کی تماشائی نہیں ہو سکتیں، اگر آپ کا دل بجز شور ماتم کے ساز محبت کی ترنم ریزیوں سے لطف اندوز ہونیکی صلاحیت نہیں رکھتا، اگر آپ کا دماغ بجز حزن و ملال کے ذوق و وجد کے احساس لطیف سے قطعاً محروم ہے، اگر آپ کا سینہ بجز دست ماتم کی زد و کوب کے برق جمال کی شرر باریوں کی تاب نہیں لا سکتا تو بے شبہ ایسے دل و دماغ کو تغزل سے کوئی فطری مناسبت نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے، کہ لکھنؤ کی غزلیہ شاعری میں بجز تصنع و تکلف کے شعریت اور تاثر کا عنصر کم اور نہایت کم ہے، چونکہ طبیعت ایک مدت سے، نالۂ و ماتم کی خوگر ہو چکی تھی، اس لئے تغزل میں بھی فطری طور پر وہی شان نوحہ گری آگئی، اور چونکہ تغزل کا کوئی صحیح نمونہ پیش نظر نہ تھا، اس لئے عام طور پر خیال پیدا ہو گیا کہ تغزل صرف آہ و بکا اور گریہ و زاری ہی کا نام ہے -

لیکن ہمکو مسرت ہے کہ مذاق لکھنؤ کے استیلا نے تغزل کی نورانی فضا میں جو ظلمت اور تاریکی پھیلا رکھی تھی، اس کو اصغر کے آفتاب کمال نے دفعۃً مٹا دیا، اور کیف و سرور و نفس کا ایک ایسا عالم ہمارے سامنے بے نقاب کر دیا جس سے اردو تغزل ابتک نا آشنا تھا، اصغر فیضی کی طرح بجا طور پر فخر کر سکتا ہے:

بانگ قلمم دریں شب تار　　بس معنی خفتہ کرد بیدار
دروازۂ صبح بر رخم باز　　کلکم ز شگاف بر تو انداز

میں نے اصغر کی اس قابل فخر خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"وہ (یعنی اصغر) اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں، جو سرتاپا نشاط حیات سے مخمور ہے، اس لئے ان کی زبان سے جو حرف زبان سے نکلتا ہے کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے"

اس کی تردید میں مرزا صاحب چند "غم انگیز" اشعار انتخاب کر کے جن کو میں نے کہیں اوپر نقل کر دیا ہے، حسب ذیل نوٹ دیتے ہیں،

"اہل نظر اندازہ کر لیں کہ مرزا صاحب کا یہ قول کہ حضرت اصغر کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے، کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے، کہاں تک قابل پذیرائی ہے"

افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے کیف و سرور کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، اور در اصل یہ ان کے سمجھنے کی چیز بھی نہ تھی، گریہ و بکا کا ایک

خوگر اس لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اگر مرزا صاحب کے نزدیک کیف و سرور سے مراد ناچنا، تھرکنا، اور قہقہہ لگانا ہے، تو میں انکی اس نکتہ سنجی اور بلاغت شناسی کی داد دیتا ہوں، اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اصغر کا کلام جذبات غم سے خالی ہے۔ یا ان کے تمام اشعار مرقع مسرت ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، خواہ وہ غم کا پہلو ہو یا انبساط کا اسمیں ایک کیف ہوتا ہے۔ ایک سرور ہوتا ہے۔ ایک جوش ہوتا ہے ایک وارفتگی ہوتی ہے۔ ایک اثر ہوتا ہے۔ تصنع اور منافقت سے پاک ہوتا ہے۔ کیف ایک عام لفظ ہے جس کا مفہوم غم اور مسرت دونوں پر حاوی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اثر صاحب جن کے نزدیک غم گریہ و بکا کا نام ہے۔ کیف غم، سرور غم، انبساط غم کی لطیف ترکیبوں کو سمجھ نہیں سکتے، اور نہ میں ان کو سمجھا سکتا ہوں کیونکہ اسکا احساس صرف وجدان سلیم سے وابستہ ہے۔

میرے مذکورہ بالا قول کی تردید میں جو اشعار مرزا صاحب نے نشاط روح سے انتخاب کئے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے دو ایک شعر اس موقع پر دوبارہ نقل کر دوں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ باوجود غم انگیز ہونے کے انہیں کس حد تک کیف کا عنصر موجود ہے۔

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا　　کہاں ہے آج تو اے آفتاب تیغ بھی

اسپر مرزا صاحب کا نوٹ ہے کہ "اک نشتر ہے جو روح کو تڑپا تا ہے" لیکن میں مرزا صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک بے کیف چیز بھی روح کو تڑپا سکتی ہے؟ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک شورش بے حاصل اک آتش بے پروا　　آتشکدۂ دل میں اب کفر نہ ایماں ہے

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی　　اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں　　جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

بے شبہہ ان اشعار میں غم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، لیکن کیا اس غم میں کیف موجود نہیں ہے؟ کیا ایک درد آشنا قلب کو ان اشعار سے سرور حاصل نہیں ہو سکتا؟ مرزا صاحب کو حیرت ہوگی، کہ غم کو کیف و سرور سے کیا تعلق؟ کیونکہ ان کی بزم عشق میں تو غم رونے چلانے اور سینہ کوبی کرنے کا نام ہے، اور کیف و سرور ناچنے تھرکنے اور قہقہہ لگانے کو کہتے ہیں، لیکن ارباب ذوق کے نزدیک بزم محبت کی فضا سراپا کیف و سرور سے معمور ہے۔ اس کا ہر منظر اثر آلود اور مرقع انبساط ہے، ممکن ہے کہ حضرات لکھنؤ کو درد و غم مصیبت معلوم ہوتا ہو اور اسلئے وہ اس سے متکیف نہ ہو سکتے ہوں، لیکن اداشناس محبت کے لئے تو وہی سرمایۂ حیات ہے، اس کے لئے غم ہی پیام سرور ہے وہ درد ہی کو ابدی لذت کا سر چشمہ سمجھتا ہے۔

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے　　غرض کہ نشو و نما روح کی اسی میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے پہلو میں زندہ اور بیدار دل رکھتا ہے۔ اس کے لئے غم اور مسرت یکساں کیف انگیز ہیں۔ اس کے لئے عشق ماتمکدہ نہیں، بلکہ "خمخانۂ نشاط" ہے۔ اس کی نگاہ شوق کی پرواز لب بام تک صرف محدود نہیں ہے بلکہ اس حریم قدس کی محرم خاص ہے

ں کی لطافت اور رنگینی کے احساس کے لئے چشم تحیر کی ضرورت ہے'

مرزا صاحب کو غالباً معلوم ہو کہ شاعر صاحب شعور کو کہتے ہیں، شعور کے معنی احساس کے ہیں، یعنی شاعر دراصل وہی ہے جس کا
ساس قوی اور مشتعل ہو، اس بنا پر کسی کے کلام پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں شعریت کس حد تک موجود
یعنی وہ خود کہاں تک متاثر ہے، اور دوسروں کے احساس کو کہاں تک مشتعل کر سکتا ہے، میرے نزدیک اسی تاثر کا نام کیف و سرور ہے
م اور مسرت دونوں میں موجود ہے، اور اس لحاظ سے اصغر کے متعلق یہ کہنا کہ جو حرف اس کی زبان سے نکلتا ہے کیف و سرور سے لبریز
تا ہے، میرے خیال میں بالکل مبالغہ نہیں، اور نشاط روح کے مطالعہ کے بعد ہر صاحب ذوق میرے اس خیال کی تصدیق کریگا'
ں نے اس سلسلہ میں آگے چل کر یہ لکھا تھا کہ'

"اردو کا تغزل باوجود گوناگوں اوصاف کے اب تک رقص و مستی کی کیفیت سے نا آشنا تھا . . . . موجودہ زمانہ میں یہ فخر صرف
حضرت اصغر کو حاصل ہے کہ ان کی سحر طرازیوں نے تغزل کے قدیم قالب بیجان میں رقص و مستی کی ایک جدید روح پھونک دی اور لوگوں کو نظر
آ گیا کہ تغزل اگر فی الواقع تغزل ہے تو وہ کس حد تک مضطرب قلوب کو متاثر کر سکتا ہے'

مرزا صاحب کے نزدیک یہ بھی غلط ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں'

تمام اساتذۂ سابق و حال کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ملیں گے جو طرب انگیز ہیں یا جن میں جوش و خروش موجود ہے میرے متعلق
عام خیال ہے کہ اس کے کلام میں درد ہی درد ہے ملاحظہ ہو'

لطف گر یہ ہو بتان صندل پیشانی کا حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

گل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا

اور اسی کے ساتھ

دل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب شمع تک تم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

صحت مذاق اور وجدان سلیم کے فقدان کا ماتم کہاں تک کیا جائے! مرزا صاحب نے یہ اشعار رقص و مستی کے ثبوت میں مثالاً پیش
کئے ہیں، لیکن افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے رقص و مستی کا بھی مفہوم صحیح سمجھا، مجھے میر یا دیگر اساتذۂ فن کی عظمت سے انکار نہیں ہے
لیکن باادب اپنے لائق دوست کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ صندل پیشانی، دیر نشینی، قشقہ کشی، ترک اسلام وغیرہ کو رقص
و مستی سے کوئی تعلق نہیں، رقص و مستی دراصل روح کی بیداری، دماغ کی بلندی، نشۂ محبت کی کیف انگیزی کے مستانہ جوش و اثر کا نام ہے جسکے

ساتھ ساتھ الفاظ کے شکوہ و تناسب، فقروں کے دروبست، انداز بیان کی ندرت کی بھی ضرورت ہے، ان سب چیزوں کے مجموعی اثر سے شعر میں جو ایک خاص ولولہ انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام جوش و خروش اور رقص و مستی ہے، جس طرح مرزا صاحب نے مثالیں پیش کی ہیں، میں بھی اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے چاہتا ہوں کہ چند اشعار اس موقع پر نشاط روح سے پیش کردوں، تاکہ ناظرین صحیح طور پر رقص و مستی کی نوعیت کا اندازہ کرسکیں، ملاحظہ ہوں،

انوار کی ریزش ہو، اسرار کی بارش ہو　　ساغر کو جو ٹکرا دوں اس گنبد مینا سے
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں　　سو حسن کریں پیدا ایک ایک تمنا سے

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ　　اڑ جائے دھواں بنکر کعبہ ہو کہ بتخانہ
یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بتخانہ　　اک اور قدم بڑھکر ہے ہمت مردانہ

بیخود و محو جسم و جاں مست زمین و آسماں　　میں نے دست ناز سے چھیڑ دیا ہے ساز عشق
سرشک شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز　　ابھر ابھر کے اک بحر بیکنار ہوا
مانا حریم ناز کا پایہ بلند ہے　　لیجائیگا اچھال کے درد جگر مجھے
کچھ اس انداز سے چھیڑا اتھا میں نے نغمۂ رنگیں　　کہ ذوق سے جھومی ہوئی شاخ آشیاں ہو
رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
سرمستیوں میں شیشۂ مے لیکے ہاتھ میں　　اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

ہنگام ہے یہ مستی یہ فکر فلک پیما　　ایک ایک ستارے کو آئینہ دکھا آئی
بیدار ہوا منظر اس مست خرامی سے　　غنچوں کی کھلیں آنکھیں دامن کی ہوا آئی

پھر ان لبوں پہ موج تبسم ہوئی عیاں　　سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے
مستی سے ترا جلوہ خود عرض تماشا ہو　　آشفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا

ارباب ذوق ان اشعار کا مرزا صاحب کے پیش کردہ اشعار سے موازنہ کریں، تو ان کو بخوبی اندازہ ہوجائیگا کہ دراصل رقص و مستی اور خوش بیانی کا کیا مفہوم ہے، اور اصغر نے کس حد تک تغزل کو باکیف بنا دیا ہے، اور باوجود مرزا صاحب کی ان مثالوں کے میں اب بھی یہ کہنے کے لئے طیار ہوں کہ رقص و سرور کا جو عالم اصغر کے کلام میں موجود ہے، وہ مجھکو کسی اور اردو غزلگو شاعر کے کلام میں نظر نہیں آیا

زا صاحب یہ مستانہ کیفیت کہیں اور دکھا سکتے ہوں، تو مجکو نہایت مسرت ہوگی، حضرات لکھنؤ سے تو اس کی توقع نہیں ہوسکتی بقول مرزا صاحب کے "زمانہ نے ان کو پیس ڈالا ہے، اور ان کے دل بجھے ہوئے ہیں"۔ رہے اور شعرا، تو ممکن ہے کہ تلاش کرنے سے دو چار ایسے نکل آئیں، جن میں کچھ طرب انگیز الفاظ استعمال کئے گئے ہوں، لیکن میرے نزدیک صرف اس کا نام رقص و مستی نہیں، بلکہ دیکھنا ہے کہ پورا کلام عام طور پر کہاں تک اس نشے سے سرشار ہے،

خوش بیانی اور رقص و مستی کا مفہوم اگر مرزا صاحب سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہم اُن کو مشورہ دیں گے کہ دیوان حافظ کا مطالعہ فرمائیں نمونہ کے چند اشعار اس موقع پر پیش کرتا ہوں، ممکن ہے کہ ان کو پڑھ کر مرزا صاحب کسی حد تک تبدیل خیال پر آمادہ ہو جائیں

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند　　گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم ستر عفاف ملکوت　　با من راہ نشین بادۂ مستانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ان اشعار کو پڑھو، معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف نشۂ حیات میں رقص کر رہا ہے، یہی وہ چیز ہے جو ہمارے غزل گو شعرا اور خصوصاً رات لکھنؤ کے یہاں مفقود تھی اور جس کے بغیر تمام لفظی طلسمکاریاں بالکل بے اثر تھیں، چنانچہ اسی بنا پر مذاق جدید کو اردو کے فرسودہ از تغزل سے یک گونہ نفرت پیدا ہو چلی تھی، اور ایک عام خیال قائم ہو گیا تھا، کہ تغزل ایک بے کیف اور ولولہ شکن صنف شاعری جس کا قطعاً خاتمہ کر دینا چاہئے۔ لیکن اصغر کی مستانہ اور کیف بر در جنبش قلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا، اور اب لوگوں کو آ گیا، کہ افسانۂ محبت باوجود اعادۂ پیہم کے اب بھی اپنے اندر کیف و سرور کی ایک زبردست برقی کشش رکھتا ہے۔ بشرطیکہ قدرت ذوق صحیح اور وجدان سلیم عطا کیا ہو،

لیکن مرزا صاحب کو اصغر کی یہ ادائے رقص و مستی کچھ بہت زیادہ پسند نہیں معلوم ہوتی اور نہ وہ اس بات سے خوش ہیں، کہ تغزل میں رقص سے کام لیا جائے ظاہر ہے، کہ ایک افسردہ اور ماتم زدہ دل ولولہ انگیز اور روح افزا جذبات کا کیونکر خیر مقدم کر سکتا ہے؟ چنانچہ غضبناک لہجہ میں سے متعلق ارشاد ہوتا ہے،

> مرزا صاحب کا خیال ہے، کہ شاعر کو صرف ایسے اشعار رکھنا چاہئے جن سے سامع پر انبساط طاری ہو، انقباضی اشعار ٹکسال باہر، گویا شاعری خصوصاً تغزل ہمارے نفس، ہمارے جذبات، ہماری امیدوں ہماری آرزؤں اور ہماری حسرتوں کا آئینہ نہیں ہے، بلکہ ایک سانچہ ہے جسمیں خوشی ڈھلتی ہے"

تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے میرے کن فقروں کی بنا پر خیال میرے متعلق قائم فرمایا ہے، میں نے اس میں شبہ نہیں کہ گریہ وزاری
سینہ کوبی اور آہ و بکا کی ضرور مذمت کی ہے اور میں ان چیزوں کو کم نظری اور پست خیالی کی دلیل سمجھتا ہوں، لیکن میں نے کہیں یہ نہیں کہا کہ جذبات
م کی مصوری تغزل کے دائرہ سے خارج ہے، یا شاعر کو درد انگیز اشعار کبھی نہ کہنا چاہیے، البتہ شرط اتنی ضرور ہے کہ جو جذبہ ادا کیا جائے اس میں
ستی اور ابتذال نہ آنے پائے اور کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہو، میرے نزدیک اصغر کا یہی خاص کمال ہے، جو کبھی مذاق لکھنو کو نصیب نہیں

اگر مرزا صاحب کے نزدیک "انبساط" کے معنی ہنسنے اور قہقہہ لگانے کے ہیں، تو بے شبہ میں ایسے اشعار کو کبھی پسند نہیں کر سکتا
و صرف قہقہہ انگیز ہوں، لیکن اگر انبساط سے یہ مطلب ہے کہ شعر سنکر روح میں کوئی اضطراب اور بیداری کی کیفیت پیدا ہو، اور میرے نزدیک انبساط
سی کو کہتے ہیں، تو یقیناً میرا یہ خیال ہے کہ شاعر کو صرف اسی قسم کے اشعار کہنا چاہیے جن سے روح میں تازگی اور لطافت پیدا ہو، میں پردرد شعر
کو بھی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک درد و غم بھی ایک پرکیف چیز ہے جس میں ایک مضطرب روح کو خاص انبساط ور
لذت محسوس ہوتی ہے، لیکن میں "انقباضی اشعار" کو بہر صورت تغزل کے دائرہ سے خارج سمجھتا ہوں، میرے نزدیک وہ شعر شعر نہیں
جس سے قلب میں تنفر اور انقباض پیدا ہو، یہ سب مادی درد کی علامتیں ہیں، لیکن درد محبت جو ایک لطیف روحانی کیفیت کا نام ہے
اس کا کبھی یہ اثر نہیں ہو سکتا، ایک شخص جو حضرات لکھنو کی طرح اگر کسی مادی درد میں مبتلا ہے تو بے شبہ اس کی آہ و فغاں سے سامع کے
قلب میں ضرور تنفر اور انقباض پیدا ہوگا، لیکن ایک دردمند محبت کا ترانۂ فریاد مرغان چمن کی زمزمہ سنجیوں سے کہیں زیادہ دلفریب
اور کیف انگیز ہوتا ہے،

میں بے شبہ تغزل کو صرف خوشی کا سانچہ نہیں بنانا چاہتا، وہ آپ کے قلب کی گوناگوں لطیف کیفیتوں کا ضرور آئینہ ہے، لیکن میں کم از کم
ایسے خیالات کی مصوری کو جن سے تنفر اور انقباض پیدا ہو کبھی تغزل میں جائز نہیں سمجھ سکتا، اب تک ارباب فن کے نزدیک شعر کی
مصوری حیرت و استعجاب، درد و غم، کیف و انبساط کے برانگیختہ کرنے والے جذبات تک محدود تھی، لیکن انقباضی کیفیت کا اضافہ ہمارے
دوست کی ایجاد ہے، (یعنی) یہ کلیہ اگر مان لیا جائے تو اب جرکین کو بھی مرزا صاحب کی صف میں کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے، کیونکہ ان کے
اشعار سے طبیعت میں کم از کم تنفر اور انقباض کی کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے، اس لئے مرزا صاحب کے قول کے مطابق اس کا کلام
شاعری کے "ٹکسال" سے خارج نہیں ہے، لکھنو کے حلقۂ ادبی کے مذاق شعری کی لطافت کا اندازہ اسی سے کر سکتے ہو کہ وہاں نفرت
اور انقباض بھی شاعری کے حدود و جذبات میں داخل ہیں، یہ اسی تخیل کا اثر ہے کہ جناب عزیز جو مقدسین لکھنو کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں
ان کے قلم سے بھی یہ شعر نکل جاتا ہے،

زہر آب چشم کا کوئی قطرہ گرا تھا کیا　　　بستر ترے مریض کا دیکھا تو زرد تھا

اس شعر کو پڑھکر جس رکیک اور مبتذل مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، کیا وہ ننگ تغزل نہیں ہے؟ ممکن ہے کہ اثر صاحب
کی عقیدت مند نگاہ کو جناب عزیز کے "زہر آب چشم" کے قطروں میں آب حیات کی جھلک محسوس ہوتی ہو، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے
کہ لکھنو کے چمنستان تغزل پر جو زردی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے، وہ اسی اشک زہر آلود کی سمیت کا اثر ہے،

مرزا صاحب کا ارشاد ہے کہ

"شعر کی خوبی یہ ہے کہ جس جذبہ کی تصویر ہو مکمل ہو"

صحیح ہے، لیکن وہ جذبہ کس قسم کا ہونا چاہئے؟ اگر کوئی شخص شعر میں جذبۂ شہوت کا اظہار کرے، تو کیا کوئی صاحب ذوق اس جذبہ کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھیگا، مثلاً داغ کا یہ مصرعہ "مٹی کی بھی ملے تو برا ہے شباب میں" بے شبہہ جذبۂ نفسانی کی شدت کی مکمل تصویر ہے، لیکن کیا اثر صاحب اس قسم کے جذبات کو شاعری کے لئے مناسب خیال کرسکتے ہیں؟ اگر شعر کی صرف اتنی ہی خوبی ہے کہ جس جذبہ کی تصویر ہو مکمل ہو قطع نظر اس سے کہ وہ جذبہ کسی قدر عامیانہ، بیہودہ، رکیک، پست، اور مبتذل ہو، تو پھر ایک فحاش، ایک ہجوگو، ایک بازاری ہوس پرست کو بھی شاعر تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر شاعری صرف رنگ کی پختگی کا نام ہے، تو پھر جس طرح آپ میر و غالب کو صاحب کمال شعرا میں شمار کرتے ہیں، اسی طرح جرأتین اور میر زٹلی کو بھی ارباب فن ماننا پڑے گا، کیونکہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں اور مذاق میں پختہ تھے، لیکن میں معیار شاعری کو اس قدر پست نہیں کرسکتا، میرے نزدیک شعر کی خوبی کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے یعنی انداز بیان میں ندرت ہو، خیال لطیف اور عام سطح سے بلند تر ہو، ابتذال کی آلائش سے پاک ہو، کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہو، اگر شعر ہمارے قلب کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا، یا اس کو پڑھکر روح میں تکرار اور تموّج کی کیفیت پیدا ہو، تو وہ میرے نزدیک شعر نہیں، شاعر کا اصلی کمال یہ ہے، کہ اس کی نگاہ کس حد تک نکتہ رس، کیف شناس، اور حقائق سنج واقع ہوئی ہے، اگر اس کی جنبش قلم روح انسانی کے حیات خفیہ کو بیدار نہیں کرسکتی، اگر اس کی نگاہ شوق جمال معنوی کے رموز رنگین کی ادا شناس نہیں ہے، اگر اس کا دست طلب ساز محبت کے پردہ ہائے لطیف کو برانگیختہ نہیں کرسکتا، اگر اس کا قلب سوز و گداز کا آتشکدہ نہیں ہے، اگر اس کا دماغ ذوق و وجد کے نشے سے خالی ہے، اگر اس کی روح فیضان اضطراب سے محروم ہے، اگر اس کے ترانہ ہائے سخن ہمارے دل و دماغ کو مشتعل نہیں کرسکتے، اگر اس کا تخیل اسرار و معارف کی بزم تجلی تک پہنچنے سے قاصر ہے، اگر اس کی پرواز فکر اس فریب گاہ ہوس سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اگر اسکے داغ جگر میں لالہ زار طور کے جلوے نظر نہیں آسکتے، اگر تراوش افکار تشنگان ذوق کے لئے آب حیات کا کام نہیں دیسکتی، اگر اس کی زبان دردمندان محبت کو نشاط روحانی کے فتح باب کا مژدہ نہیں سنا سکتی، تو بے شبہہ وہ شاعر نہیں بلکہ ایک بوالہوس ہے، جس کا وجود ادب کے لئے، تمدن کے لئے، اخلاق کے لئے ایک عظیم الشان مصیبت ہے"

ممکن ہے کہ اثر صاحب کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو، کیونکہ یہ معیار اگر تسلیم کرلیا جائے تو حضرات لکھنؤ کو اپنی شان استادی کے قیام میں سخت مصیبت کا سامنا ہوگا، اور خطرہ ہے کہ ایک صاحب بھی اس امتحان میں کامیاب نہ ہوسکیں، اس سے میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کے دل و دماغ میں صلاحیت نہیں ہے، لیکن افسوس ہے، کہ قدامت پرستی ان کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کرگئی ہے کہ قدمانے جو شاہراہ سخن کھولدی تھی، وہ اس سے قطعاً ہٹنا پسند نہیں کرتے، وہی مضامین ہیں، جن کو الٹ پھیر کرکے انھی الفاظ میں ادا کرتے رہتے ہیں اس عادت سیئہ کا یہ نتیجہ ہوا، کہ طبیعتیں جدت اور لطافت سے خالی ہوگئیں اور ان پر ایک قسم کی افسردگی چھاگئی، جس نے رفتہ رفتہ ان کے انداز خیال میں پستی اور ابتذال پیدا کردیا، چنانچہ وہ نگاہیں جن کو حسن نامحدود کی اداؤں کا رمز شناس ہونا چاہئے تھا، محض شاہدان

لب بام کی عشوہ طرازیوں کے دام فریب میں پھنسکر رہ گئیں، وہ ہاتھ جس کو جمال حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹنا چاہیے تھا، رقیب کی زد و کوب میں مصروف ہوگیا، وہ قلب جس کو اسرار و معارف کی تجلی گاہ ہونا چاہیے تھا، حسن جلوہ گاہ ہوس بنکر رہ گیا، وہ آنکھ جسکے ہر قطرۂ آب سے انوار محبت کی بارش ہونی چاہیے تھی، بستر غم پر زہر فشانی کرنے لگی، وہ لب جسے نوائے حیات کی ترنم ریزیوں سے معمور ہونا چاہیے تھا، صرف آہ و بکا کے لئے وقف ہوگیا، وہ دماغ جس کو نشاط امید سے مخمور ہونا چاہیے تھا، یاس و ملال کا دہشتکدہ بنکر رہ گیا، لیکن افسوس ہے، کہ باوجود اس کے کہ دنیا کا مرقع الٹ گیا، افق حیات مختلف قسم کی رنگینیوں سے معمور نظر آتا ہے، طبیعتیں آہ و بکا سنتے سنتے گھبرا اٹھی ہیں، حضرات لکھنؤ اسی ماتمکدے میں بیٹھے ہوئے اب تک مصروف ماتم ہیں اور آئندہ بھی اسی روش پامال پر قائم رہنا چاہتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لئے کہ پاس وضع کا خیال ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری کو پاس وضع سے کیا تعلق؟ یہ کیا ضرور ہے، کہ آباؤ اجداد نے صدیوں پہلے جو ایک انداز اختیار کرلیا ہے ہم بھی اسی پر ہو بہو قائم رہیں، اور موجودہ حالات و واقعات سے قطعاً آنکھیں بند کرلیں، کیا شاعری میں ترمیم و تغیر جرم ہے؟ متداد زمانہ کی وجہ سے تغزل میں جو پستی اور ابتذال آگیا ہے، کیا اس کی اصلاح کوئی گناہ ہے؟ میں تغزل کا مخالف نہیں لیکن لکھنؤ کی بدمذاقی سے جو معائب اس میں پیدا ہوگئے ہیں، اُن کی اصلاح نہایت ضروری سمجھتا ہوں، نالہ و ماتم کی انتہا ہوچکی، اب ضرورت ہے کہ مذاق شعری میں کچھ لطافت اور بلندی پیدا کیجائے اور عشق و محبت کے ایسے جذبات ادا کئے جائیں جن سے روح کو خاص لذت حاصل ہو، اور شریفانہ اخلاق کے نشو و نما میں مدد ملے، حزن و افسردگی زندگی کا نام نہیں بلکہ راز حیات صرف اسی اضطراب پیہم میں پنہاں ہے جس سے ایک عاشق کا قلب معمور ہوتا ہے، میں نے نشاط روح کو اسی حیثیت سے ملک کے سامنے پیش کیا ہے، کہ وہ ذوق محبت کی ابدی رنگینیوں کا ایک ایسا شاداب چمن ہے، جس کا ہر منظر ارباب درد کیلئے پیام راحت ہے۔ اگر فرصت ملی، تو آئندہ ہم تفصیل سے یہ دکھائینگے، کہ اصغر نے موجودہ عام روش سے الگ ہوکر تغزل کی سطح سخن کو اپنی نکتہ سنجیوں سے کس حد تک لطیف، بلند اور پرکیف بنا دیا ہے، لیکن ہم موجودہ بزم ادب سے یہ توقع ضرور رکھتے ہیں، کہ وہ اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے بعد اس ضلالت کی تاریکی سے بچنے کی ضرور کوشش کریگی، جس کی طرف حضرات لکھنؤ ملک کے مذاق شعری کو لیجا رہے ہیں،

مرزا احسان احمد بی اے۔ ال ال بی (علیگ)

(نگار) یہ مضمون میرے پاس صرف "روح نشاط پر ایک نظر" کے عنوان سے آیا تھا اور اس عنوان کو دیکھ کر (مطالعہ مضمون سے قبل ہی) میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ نگار میں اس کی اشاعت مناسب ہے نہ ضروری، کیونکہ نشاط روح پر اس سے قبل کافی نقد و تبصرہ ہوچکا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ جبکہ اس سے زیادہ مفید موضوع پر بھی گفتگو ہوسکتی ہے، کم از کم نگار کی روایت ترتیب کے منافی تھا لیکن یہ مضمون اس قدر خوشخط لکھا ہوا تھا کہ نگاہ بے اختیارانہ متوجہ ہوئی اور جب دو تین صفحے پڑھ چکا تو مضمون کی دلچسپی نے دامن پکڑا یہاں تک اس کو اول سے آخر تک پڑھنا ہی پڑا، اور پڑھنے کے بعد "جواز اشاعت" کا فتوی دینے پر مجبور ہوگیا، صرف عنوان میرا تجویز کیا ہوا ہے، باقی جو کچھ ہے اس کی ذمہ داری فاضل مقالہ نگار پر ہے۔

جناب مرزا احسان احمد صاحب کے اس مضمون کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک مختصر حصہ جس میں جناب اثر کی تنقید روح نشاط سے اختلاف کیا گیا ہے اور دوسرا زیادہ طویل حصہ جس میں لکھنؤ کے عام ذوق سخن کو قابل سرزنش ثابت کیا گیا ہے، چونکہ مجھے اس مضمون کے حصۂ اول سے اختلاف ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہیں ظاہر کر دوں تاکہ اثر صاحب یا ان کے کسی ادبی ہم خیال کو جواب دینے کی ضرورت ہی نہ ہو، اور آئندہ نگار کے صفحات اس بحث کی بازیگاہ بننے سے محفوظ رہیں۔

مضمون کے اول حصہ میں آصغر کے صرف یہ دو شعر مابہ النزاع ہیں :-

مقام بہیں کو پا یا نہ علم و عرفاں نے ۔۔۔ میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا ۔۔۔ اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

احسان صاحب نے مقدمۂ روح نشاط میں جو مفہوم ان اشعار کا ظاہر کیا ہے اس سے اثر صاحب کو اختلاف تھا جسے انھوں نے اپنے مضمون "روح نشاط پر ایک نظر" میں بیان کیا ہے، اسی اختلاف سے ناراض ہو کر احسان صاحب نے یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے جناب اثر کا اصل مضمون جس کا یہ جواب دیا گیا ہے، میری نگاہ سے گزر چکا ہے، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مضمون اپنے الفاظ اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایسا نہ تھا کہ اس کے جواب میں احسان صاحب کا لب و لہجہ اتنا خشم آلود اور طرز ادا اس قدر تلخ ہو جاتا۔

جہاں تک ذاتیات کا تعلق ہے اثر صاحب نے صرف یہ جملے ایسے استعمال کئے ہیں جن کو سخت کہا جا سکتا ہے :-

"مرزا احسان احمد صاحب نے بعض اشعار کے معانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی، دیگر شعرائے ماضی و حال کے متعلق جس رائے کا اظہار فرمایا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے"

"مرزا صاحب کی شرح کس قدر توہین ہے اس فلسفیانہ دماغ کی جس سے ایسا شعر نکلا ہو"

"میں بہ ادب عرض کرونگا کہ مرزا صاحب شعر کی خوبیاں تو درکنار اس کا مطلب بھی نہیں سمجھے"

ان تین ٹکڑوں کے علاوہ کوئی اور فقرہ یا جملہ مجھے ایسا نہیں ملا جس کے ذریعہ سے اثر صاحب نے احسان صاحب کے ذوق سخن یا شعر فہمی پر حملہ کیا ہو، لیکن احسان صاحب نے اس جواب میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور جو فقرے استعمال کئے ہیں وہ میرے نزدیک زیادہ تلخ و سخت ہیں۔ ان کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں۔ مضمون دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے، یہ ہے میری رائے اس مضمون کے لب و لہجہ پر صرف ان جملوں کے متعلق جو اثر صاحب کے لئے لکھے گئے ہیں، ورنہ عام لکھنوی رنگ تغزل کی نسبت جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کو میرے نزدیک اور زیادہ تند ہونا چاہئے تھا۔

اب رہ گیا اصل مسئلہ جس پر نزاع ہے، سو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس باب میں مجھے اثر و احسان دونوں سے اختلاف ہے، اور میرے نزدیک یہ دونوں شعر (جن کے مفہوم کے تعین میں اختلاف ہے) منجملہ ان چند اشعار کے ہیں جن میں اصغر اپنے مدعا کو صحیح طور پر ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور صرف خوبصورت الفاظ کی خوبصورت نشست سے فریب کھا گئے

اپنی جگہ مطمئن ہو گئے۔

جب کوئی شاعر کسی خاص جذبہ سے مغلوب ہو کر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو وہ فرطِ محویت و انہماک میں بعض رفعت پسند بلند سے بلند خیال کو اس قدر آسان، اس درجہ عام فہم اور اور اتنا سریع الانتقال الی الذہن سمجھ لیتا ہے کہ محض اشارات و کنایات ہی کو اس کے اظہار کے لئے کافی جانتا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی اور اس کی تعبیرات ناکافی ہوتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اصغر صاحب نے ان دونوں شعروں میں کوئی مفہوم نہیں رکھا۔ یقیناً انھوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ان کو لکھا ہوگا لیکن خیال کی وسعت کے لحاظ سے الفاظ ان کو نہیں ملے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی کچھ سمجھنے لگا، وہ کوئی کچھ۔ اسی قبیل کے بعض شعر اصغر صاحب کے یہ ہیں جن کو میں تعبیر ناقص کہوں گا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی　　تمام شعبدہ ہائے طلسم ہے جس بھی

ابھی تک تمام فکر و نظر پر محیط ہے　　شکل صفات معنی اشیا کہیں جسے

مستی سے نرا محو خود عرض تماشا ہو　　آشفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا

غزل کی سب سے بڑی خوبی خواہ وہ کسی رنگ کی ہو یہ ہے کہ اس کا شعر سنتے ہی ایک کیفیت طاری ہو جائے اور ذہن سامع اس فکر میں الجھ کر نہ رہ جائے کہ کہنے والے کا کیا مطلب ہے۔ غزل کا شعر وہی ہے جو ایسے ہی مفہوم کے لئے لکھا گیا ہو اور ویسے ہی معنے اس سے پیدا ہوتے ہوں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ایک ذرا تاویلات اس سے متعلق ہو سکتی ہیں تو بلندی خیال کی وجہ سے آپ اسے الہام، وحی، نطق خداوندی جو چاہے کہہ دیجئے لیکن غزل میں اس کو شامل نہیں کر سکتے۔

میں نے انھیں دونوں شعروں کے متعلق بشیر احسان و اثر میں اختلاف ہے، مہر صاحب ذوق سے جو اس زمانہ میں مجھے ملا رائے حاصل کی، لیکن سب نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اثر و احسان کی تاویلیں اپنی اپنی جگہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہوں لیکن کم از کم اصغر صاحب کے اشعار سے وہ معنی پیدا کرنا "تمام معنی" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

میں نے خود اصغر صاحب سے بھی تحریک کی کہ وہ ان کا مطلب تحریر فرماویں، لیکن ان کا کوئی جواب نہ آیا۔ ممکن ہے کہ جواب کے آنے پر مجھے اپنی رائے بدلنی پڑتی۔

اصغر صاحب کی شاعری اس میں کلام نہیں کہ بالکل وہبی، الہامی ہے اور لطافت احساس، ندرت ذوق، بلندی نظر، ندرت خیال، علوئے فکر، رسائی ذہن اور پاکیزگی تخئیل کے اعتبار سے وہ اردو تغزل میں بالکل انوکھی چیز ہے۔ لیکن احسان صاحب کا یہ دعویٰ کہ وہ یکسر نقائص و معائب سے پاک ہے، اور وہ ہر قسم کے خط و لغزش سے منزہ ہے، غالباً صحیح نہیں۔ کہیں احسان صاحب کی یہ برہمی اس وجہ سے تو نہیں کہ اثر صاحب نے اپنی تنقید کے سلسلہ میں کلام اصغر کی کچھ غلطیاں بھی ظاہر کی تھیں۔ بہرحال اس وقت میرے سامنے جناب اثر کی وہ تنقید موجود نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنے اعتراضات پیش کئے ہیں اور نہ یہ خبر کہ احسان صاحب نے ان کا کوئی جواب بھی دیا ہے یا نہیں۔ لیکن روح نشاط ضرور میرے سامنے ہے اور صرف چند منٹ کی سرسری نگاہ سے چند

شعر ایسے مل گئے ہیں جن سے جناب احسان کا یہ دعویٰ باطل ہو سکتا ہے۔

رب ارنی کہتے چیخ اٹھوں تو برق طور ہو

عشق متبسم کہ یہ راز جہاں کے کائنات

مضراب محبت سے اک زخمۂ لاہوتی ہو

بڑا غضب یہ دل شعلۂ آرزو نے کیا

پہلے مصرعہ میں ارنی کی یے کا سکون دوسرے مصرعہ میں متبسم کی ت کا سکون تیسرے میں مضراب و زخمہ کو علیحدہ سمجھکر زخمہ کو نغمہ کی جگہ استعمال کرنا، چوتھے میں دل شعلۂ آرزو لکھنا، کیا کھلے ہوئے لفظی نقائص نہیں ہیں۔

اب رہگئی تنقید معنوی و تنقید بلاغتی۔ سو اس کا یہ موقع نہیں ورنہ میں بتاتا کہ اس لحاظ سے بھی اصغر کے کلام پر کافی بحث کی جا سکتی ہے۔ اسی شعر کو لے لیجئے جس میں جہل و عرفان کی بحث ہے اور جو احسان صاحب کے نزدیک "لطیف حقیقت اسلامی کی طرف اشارہ" ہے۔

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے
میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

شاعر پہلے مصرعہ میں جہل کا مرتبہ علم و عرفان سے بلند ظاہر کرتا ہے، حالانکہ دوسرے مصرعہ میں "میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود" کہکر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں اپنے اس "جہل یا بے خبری" کا علم رکھتا ہوں نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مصرعہ سے پھر علم و عرفان کی منزلت بڑھ گئی۔ اصغر کا ایک شعر ہے۔

عشق ہے اک کیف پنہانی مگر رنجور ہے
حسن بے پروا نہیں ہوتا مگر دستور ہے

دونوں مصرعوں کا عدم توازن نہ صرف بلاغت کا نقصان ہے بلکہ مفہوم کے لحاظ سے بھی ذہن کو مشوش کر دیتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں دو فقرے ہیں۔ "ہے اک کیف پنہانی" اور "رنجور ہے" ان دونوں کا فاعل عشق واقع ہوا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ کے دوسرے فقرہ کا فاعل وہ نہیں ہو سکتا جو پہلے فقرہ کا ہے۔ یعنی یوں نہیں کہہ سکتے کہ حسن بے پروا نہیں ہوتا مگر حسن دستور ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب شاعر نے یہ رکھا ہے کہ حسن بے پروا نہیں ہوتا مگر اس کی بے پروائی دستور ہے۔ اول بے پروائی سے انکار اور پھر اس کا دستور کی صورت میں اقرار تضاد معنوی کا نقص رکھتا ہے اور اگر اس سے قطع نظر کر لیں تو بھی ژولیدگی بیان ظاہر ہے۔

احسان صاحب اثر پر نہیں بلکہ حقیقتاً ان کی شاعری اور ذوق سخن گوئی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "انھوں نے لکھنؤ کے

شاما

میرزا شاہ مراد عرف شاما کی حیثیت سے قصر شیریں (ایران) کی ایک عجیب ہستی تھے یوں تو کُردی، فارسی، ترکی، عربی میں بے تکلف گفتگو کر لینا سرحد ایران و عراق کے قرب و جوار کے لوگوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ یہ چاروں زبانیں وہ اپنے ماں کے گہوارہ ہی میں سیکھ لیتے ہیں مگر استاد شاما ان میں اس حیثیت سے ممتاز تھے کہ (بقول خود) انکے علاوہ اور وہ پانچ سات زبانوں میں کے ماہر تھے اور جن میں انگریزی و ہندی بھی شامل تھی اور اسی لئے ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے سلسلۂ نسب میں وہ تمام قومیں شامل ہیں جن کی زبان میں وہ گفتگو کر لیتے ہیں۔ یہ ویسا خالی خولی دعویٰ نہیں تھا جیسے ہمارے ہندوستان کے مسلمان بغیر عربی کا ایک حرف جانے ہوئے صدیقی و فاروقی و عثمانی بن بیٹھے ہیں۔

کُردوں میں وہ شاما کے نام سے نام سے مشہور تھے نہ اس لئے کہ ان کی آواز و شکل و شبہ کو کوئی دور کی تشبیہ بھی ہندوستان کے اس پرندے سے دی جا سکتی تھی بلکہ یہ صرف ان کے نام کی ایک مسخ شدہ صورت تھی جس کی ذمہ داری کُردوں کی اس بری عادت پر تھی کہ وہ دال کے حرف کو ہضم کر جاتے ہیں مثلاً وہ بغداد کو بغا، احمد کو احمہ، محمد کو محمہ کر دیتے ہیں، اور اس لحاظ سے شاہ مراد کا مخفف شاما ہو گیا۔

پہلی بار جب وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے خود اپنی تعریف مجھ سے اس طرح کی کہ "آقا من دوا قراط ہستم۔ اگر شما نمیدانی دوا قراط چہ ہست کسے کہ در پالتیک سررشتہ دارد و من در پالتیک خیلے تیز میزم" یہ محض زبانی دعویٰ نہ تھا بلکہ میں نے ان کو بارہا دیکھا کہ جب وہ بازار میں اپنے کباب کی دوکان کے آگے سفید چاند تارا بنے ہوئے لال کپڑے کو کمر سے نیچے اور اپنے شلوار کے اوپر باندھے سیخوں سے گرما گرم کباب اتارنے میں مشغول ہوتے اور منہ پھیلائے ہوئے خاطرجی زکا رواجی کی ایک جماعت ان کے پیچھے میز پر بیٹھی ہوتی تو وہ اپنی پالتیکس میں اس درجہ محو ہو جاتے کہ ان بے صبروں کو انقلاب کی سوجھنے لگتی اور آخر میں جب مسئلہ وطنیت و استبدادیت کی نزاع طول پکڑتی تو مقامی جندرمہ کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑتی اور استاد شاما کشاں کشاں بارہا سرائے حکومت میں لائے جاتے جہاں وہ کئی گھنٹے رئیس جندرمہ سے سیاست کے اس مخصوص پہلو پر جس کا تعلق رعایا کی مالیت و معیشت ذاتی سے ہوتا ہے تبادلۂ خیالات کر کے اپنے گھر واپس آتے اور پھر تازہ ہو کر اور تلخیٔ اوقات کو ایک دو جرعۂ عرق میں غرق کر کے اپنی مشہور پارہ خانے والی قبا اور بھورے رنگ کی کلاہ کے ساتھ میرے کاشانہ میں جلوہ افروز ہوتے اور آتے ہی دو چار صلواتیں رئیس شرطہ کو سنا کر کہتے "بابا چہ کنم۔ پدر سوختہ ہا ہیچ نگذاشتند برائے ما کہ نان و زرات برائے خودم و برائے بچہ ہا بخرم۔ تو میدانی کہ من عائلہ دارم یک زن یک مادر زن ہشت تا دختر و پسر آخر چہ

چہ کنم از گرسنگی بہ میرم یا این حرامزادہ رئیس را بہ خنجر بکشم" خنجر ہمیشہ ان کے کمر میں رہتا تھا اور جوش میں خنجر نکال کر کبھی اپنے داہنے اور کبھی اپنے بائیں ہاتھ میں پھراتے۔ اور جب تک میرے جیب کے دو چار قران (سکہ) ان کے حساب میں درج نہو جاتے مشکل سے ان کا جوش ٹھنڈا ہوتا

اسی پالٹیک دانی ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کو ترکوں سے اور ان کی سلطنت سے بے انتہا نفرت ہوگئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب رؤف بک نے روسیوں کو نکالکر قصر شیریں پر قبضہ کر لیا۔ تو استاد شاما اپنی دوکان بند کر کے اپنی چار خانہ دار قبا اور بھوری کلاہ کے ساتھ توماندان کے پاس جا پہونچے بازار میں انھوں نے کہیں یہ سن لیا تھا کہ توماندان ترکیہ کے ساتھ ایک جرمن کپتان ترکی لیروں (سکہ) کے کئی بکس لیکر آیا ہے۔ اور جو ایرانی اس کو پالٹیک ایران میں سب سے بہتر مشورہ دینگے وہ ان کا منہ لیروں سے بھر دیگا۔ استاد شاما ابھی توماندان کے پاس پہونچے بھی نہیں تھے کہ ان کو اپنے کسی ساتھی سے معلوم ہوا کہ سارے لیرے ان کے سب سے بڑے حریف و دشمن یہودی خواجہ عزرا و خواجہ ہارون پہلے ہی لے اڑے ہیں۔ انھوں نے قبا اور ٹوپی کو اسی جگہ چھوڑ، یہودیوں کے محلے کی طرف اپنا رُخ کر دیا۔ اور راستے میں لوگوں کو مختصراً اپنی مہم کے مقصد سے آگاہ کرتے ہوئے ایک بڑی فوج کے خود توماندان بنکر یہودیوں کے مکانوں پر تاخت بولدی۔ ترکی لیرے تو ہاتھ نہ لگے مگر مال غنیمت کی صورت میں اس کی کافی تلافی ہوگئی۔ ابھی وہ مال غنیمت کو سڑک پر کھڑے اپنی فوج میں تقسیم کر رہے تھے کہ یہودیوں کی نہیب و غارت کی شکایت توماندان ترکیہ کے پاس پہونچی اور ہمارے دوست اسی حالت میں گرفتار ہو کر توماندان کے سامنے پیش ہوئے۔ اور ان کو اپنی غلط فہمیوں کا ایسا سخت خمیازہ بھگتنا پڑا کہ جب کبھی وہ اس قصے کو مجھ سے ان الفاظ میں دہراتے کہ این یہود پرست در فراموش خانہ بہ زن شان رقصیدند۔ چرا خاطر شان عزیز نہ دارند۔ مسلمانان را چار چوب کردند شلاق زدند تف حرامزادہ" تو جس وقت وہ آخری لفظ پر آتے تو میں ان سے ذرا دور کھسک کر بیٹھ جاتا کیونکہ شدت جذب میں وہ میرے وجود کو بالکل اسی ترک کا وجود سمجھ لیتے۔

مگر جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں اسوقت بیچارے ترک عراق و ایران میں ایک قصۂ پارینہ ہوگئے تھے۔ اور استاد شاما کی اب بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی پالٹیک دانی سے انگلیس کو فائدہ پہونچائیں۔ اس لئے جب میری اور انکی پہلی ملاقات ہوئی تو اگرچہ اس کی تقریب یہ نہ تھی کہ وہ اپنا تعارف ان الفاظ میں کرتے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں انھوں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کہ اپنی پالٹیک دانی اور دماغ قراط ہونے کا ثبوت نہ دیا ہو۔ میری۔ ان کی ملاقات کی تقریب یہ تھی کہ ہوائے قصر شیریں نے مجھے بیمار ڈالدیا۔ جب بیماری نے طول کھینچا اور مجھے کوئی طبیب میسر نہ آیا تو میرے ملازم ایرانی ایک حکیم باشی بلالائے۔ جو ہمارے استاد شاما تھے۔ ان کی تنقیح مرض سے تو میں اتنا نہ گھبرایا مگر جب انھوں نے میرے کمر اور گردن کو داغنے کا ارادہ کیا تو باوجود نقاہت و ضعف کے میں ایسا سراسیمہ ہوا کہ یکبارگی اُٹھ بیٹھا۔ اس حالت اضطرار نے طبیعت میں ایک ایسا ہیجان پیدا کیا کہ وہ بجائے خود ازالۂ مرض کا سبب ہوگیا اور محض حضرت شاما کے قدم رنجہ فرمانے کی برکت سے

میں شفایاب ہوگیا۔ میرے صحت پانے کے قصہ نے خود مجھکو سارے قصر شیریں کی سوسائٹی میں مشہور کردیا کیونکہ استاد شاما کا یہ کارنامہ کئی بار قہوہ خانوں میں دہرایا گیا حتی کہ معزول گورنر قصر شیریں کو میری زیارت کا ولولہ اُٹھا اور جہاں کہیں بھی میں جاتا۔ استاد شاما میرے پہلو میں ہوتے اور ہر طرف سے انگشت نمائی ہوتی۔ مگر بظاہر انکی پالتیک دانی کا کوئی اثر انگلیس پر نہ ہوا کیونکہ یہاں بھی ان کے یہودی حریف پہلے سے نمبر لے گئے تھے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ تنزاقط (کنٹریکٹ) سب یہودیوں کو مل چکے ہیں۔ تو انھوں نے مجھسے بہت ہی رازدارانہ مشورہ یہودیوں کے قتل عام کے بارے میں کیا۔ عامۂ خلائق کے تمام کاموں میں سب سے بڑا فخر مجھے اپنے اس مشورہ اور دور اندیشی پر ہے جس نے بہت بڑے حادثہ سے قصر شیریں کو بچا لیا۔ ہر چند اسطرح ہمارے دوست کو کباب بیچنے ہی پر قناعت کرنا پڑی یا پھر اس عرق پر جو وہ خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے تھے اور جس کے بیچنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی۔

استاد شاما باوجود حسرت کے نہایت زندہ دل حاضر جواب تھے۔ سنی تھے اور ایرانی رسم قدیم کے مطابق یا اپنی حفاظت خود اختیاری کے خیال سے جس کی اب ضرورت باقی نہ تھی) وہ اپنے کمر میں ہمیشہ ایک خنجر لگائے رہتے تھے اور اس کے دستہ میں ایک بڑے دانوں کی تسبیح لٹکی رہا کرتی تھی۔ جسکو وہ اکثر ہاتھ میں لیکر مشغلہ کے طور پر پھیرایا کرتے تھے۔ ایک بار تو ان کی حاضر جوابی نے غضب ہی کردیا۔ معزول گورنر کے پاس ہم اور وہ اور کئی ایک ایرانی بیٹھے ہوئے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا۔ ان کے ایوان کے آگے میدان میں قلعہ جوانمیر تھا۔ اور اس کے گرداگرد ایک بڑا قبرستان تھا۔ جس میں جوانمیر کے ساتھی مدفون تھے سلطان ناصر الدین شاہ کے زمانے میں کردوں کا سردار جوانمیر پاشائے بغداد سے بگڑ کر قصر شیریں کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اور بہت مدت تک شاہ کی فوج کو پریشان رکھا آخر میں شکست کھائی اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے یہ سب سنی تھے۔ کردستان میں قبر عجیب طرح اونچے میناروں کی شکل میں بنائی جاتی ہے۔ ایک آوارہ کتے نے ایک قبر کے قریب آکر جیسا کتوں کی عادت ہوتی ہے ٹانگ اٹھاکر پیشاب کرنا شروع کیا۔ شاما نے چاہا کہ کتے کو للکاریں۔ ایک ایرانی بزرگ بولے۔ "عیبے ندارد قبرستان سنّی ہست" شاما نے جواب دیا "مگر این سگ ہم شیعہ باشد" نہایت قہقہہ لگا۔ شاما سے میں نے راستہ میں کہا کہ آج تم نے پٹوا دیا تھا۔ "تنگ کر بوئے حکومت انگلیس ہست چہ باک دارم"

بہرحال جب میں سال ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد قصر شیریں سے آرمینیا و شمالی کردستان کے مشن پر روانہ ہوا تو استاد شاما کی یاد بہت دنوں تک باقی رہی اور جسوقت وہ مجھے الوداع کرنے آئے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان کے بدبر چار خانہ دار قبا نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہاں گئی، کہنے لگے "دیروز بہ چند قران فروختم تا از گرسنگی نہ میرم" یہ وہ سین تھا کہ سنگدل سے سنگدل شخص بھی اُن کی مدد کرتا میں نے علحدہ لیجا کر دس تومان ان کے ہاتھ پر رکھے اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ پالتیک پر گفتگو کم کیا کریں، اور اللہ کا نام لیکر اس سے قند اور چائے کی تجارت شروع کریں۔ کیونکہ ایران میں پالتیک اور کباب سے زیادہ اس کی مانگ ہے۔ صاحب مند تھے بلا عذر اُس کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ ہم نے

ایک دوسرے کی پیشانی کا بوسہ لیا اور خدا حافظ کہا۔

معلوم نہیں میں کس بری ساعت میں قصر شیریں سے روانہ ہوا تھا کہ دریائے سیروان کے قریب پہونچنے میں عراق کی عام بغاوت شروع ہوگئی۔ دوشن کے جو انگریز افسران کردستان و آرمینیا کی استقلالیت اور سلطنت کی تشکیل کے لئے جا رہے تھے ان میں سے دو تو اسی جگہ مارے گئے اور تین کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔ میں اپنی قیامت گاہ پر بے خبر سو رہا تھا کہ یکایک توپ اور بندوقوں کی گرج سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر آکر دیکھتا ہوں تو فضا پر تاریک دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اور دھواں صاف ہونے کے بعد سرائے حکومت پر بجائے یونین جیک کے سُرخ چاند تارے کا جھنڈا نظر آ رہا ہے۔ اتنا موقع نہ تھا کہ کسی سے دریافت کرتا کہ کیا معاملہ ہے اور نہ میں اپنے اسباب کو اُٹھا کر سکا میرے بکس میں کوئی سات آٹھ ہزار روپیہ کے انگریزی نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کو بچانے کا بھی موقع نہ ملا۔ اتفاق سے تمنچہ اوپر ہی رکھا ہوا تھا وہ فوراً ہاتھ میں آگیا۔ مگر کپڑا، ٹوپی، جوتا پہننے کی نوبت نہ آئی۔ درجنوں ہی اور امانی کرد میری طرف سنگینیں لگائے ہوئے دور سے نظر آئے۔ میں نے اپنے کرتے پائجامے میں عادلہ خانم جان کے محل کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ عادلہ خانم اور ان کے خاندان کے امرا ہمارے معاون تھے اور کردوں کے نزدیک غدار۔ اور اس وقت مقابلہ شیخ محمود بک (معاون مصطفیٰ کمال) اور عادلہ خانم جان کی پارٹی میں تھا۔

راستے میں مجھے بہت سے یہودی و کرد بدحواسی سے بھاگتے ہوئے ملے۔ اور میں انکی سرگردگی میں اور پستول کے ہوائی فیر کرتا ہوا افتاں و خیزاں اپنے دوستوں کی پناہ میں پہنچ ہی گیا۔ اس وقت کا سین مجھکو کبھی نہ بھولیگا۔ محل چاروں طرف سے محصور تھا۔ بوڑھی عادلہ خانم ان کی لڑکیاں اور پوتیاں اور خاندان کی جتنی عورتیں محل میں موجود تھیں وہ بالاخانہ میں اوپر کھڑی ہوئی اپنے ساتھیوں کو اس بے خوفی اور دلیری سے ابھار رہی تھیں کہ اگرچہ میں کبھی بہادری کا مدعی نہ تھا اور نہ میں نے کسی انسان کے اوپر گولی چلائی تھی۔ میں بھی ان محافظین کے زمرے میں کھڑا ہو گیا۔ جتنے شاگرد پیشہ میں مورچہ بند تھے اور تمنچہ کے اپنے باقی کارتوس خالی کر دئے۔ رات تک برابر ہم نے مدافعت کی مگر جب مایوسی نظر آئی تو بوڑھی عادلہ خانم نے ہم سبھوں کو ایک مشورہ میں بلایا اور یہ طے پایا کہ شیخ محمود سے صلح کر لیجائے اور انگریزوں کا ساتھ بالکل چھوڑ دیا جائے۔ جب انگریزوں کی فوج کبھی واپس آئیگی تو دیکھا جائے گا۔ مخالفین سے فوراً ہی نامہ و پیام شروع ہوا اور آٹھ بجے رات کو لڑائی بند کر دی گئی۔ مخالف جماعت کے سردار حمید بک نے کہلا بھیجا کہ وہ کل صبح عادلہ خانم سے ملاقات کریں گے۔ صبح صلح کی کانفرنس ہوئی۔ حمید بک خود عادلہ خانم کے پاس آئے قہوہ کا دور چلا۔ اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عادلہ خانم ان کے خاندان اور ان کے ساتھیوں سے کوئی سروکار نہ رکھینگے البتہ وہ کسی انگریز کو پناہ نہ دیں۔ اور اگر اسوقت کوئی موجود ہو تو اس کو حوالہ کر دیں۔ اس وقت میں ہی ایک انگریزیت کا مجرم تھا۔ اور میرے حوالہ کئے جانے پر صلح منحصر تھی۔ میں نے خانم سے کہا کہ آپ کچھ نہ گھبرائیں اور میرے خاطر اپنے اور اپنی قبیلہ کو زحمت میں نہ ڈالیں۔ میں موقع پاتے ہی یہاں سے نکل جاؤنگا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہرگز نہ جانے دونگی خواہ کچھ ہو۔ مگر میں نے ارادہ

کر لیا تھا کہ رات کو میں چپ چاپ نکل جاؤنگا۔ شام کے وقت میں نے کردی لباس پہنا اور چپکے بغیر کسی اطلاع کے کوہستان اورامان کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ارادہ تھا کہ بیارہ کے شیوخ جنکا اورامان کے کردوں پر بہت ہی روحانی اثر ہے ان کے پاس پہونچکر ان کی مدد سے سناء اور کرمانشاہان کی طرف سے بغداد واپس پہونچ جاؤنگا مگر اندھیری رات میں بھٹکتا بھٹکتا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ اور صبح کو دلماں کردوں میں پڑکر پھر واپس پاگیا۔ اور حمید بک کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے مجھے تا صدور حکم قاضی محبوس کرنے کا حکم دیا۔ اور میری رہائی اس وقت ہوئی جب انگریزوں کے ریلیف فورس نے سلیمانیہ کو دوبارہ فتح کیا۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ جسوقت میں ٹرکی سے بغداد کو واپس ہوا تو میرے پاس سوائے ایک اوورکوٹ اور تین مہینے کی تنخواہ کے جو قصر شیرین آتے آتے تک ادھیا گئی تھی دنیا کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جسکو میں اپنی کہہ سکتا

بغداد واپس ہونے ہوتے یکایک مجھے خیال آیا کہ ایران ہوتے ہوتے ہندوستان کو براہ بلوچستان واپس ہوں۔ ورس واسطے اپنی اس خاص جبلی طبیعت سے مجبور ہوکر کہ میرے دل میں جب کوئی منصوبہ خواہ کیسا بھی خطرناک یا ناممکن کیوں نہ آجائے اسپر بلا سوچے سمجھے عمل کرنے لگتا ہوں۔ میں فوراً ہی قصر شیرین روانہ ہوگیا جب قصر شیرین پہونچا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی مالی حالت کا جائزہ پہلے سے کیوں نہ کر لیا تھا۔ اور ایران سے ہندوستان تو ہزاروں میل دور ہے۔ بہرحال قصر شیرین میں تو آہی گیا ہوں لاؤ اپنے پرانے دوستوں سے ملتا چلوں اور اگر ممکن ہو تو ان سے قرض لیلوں میں سیدھا استاد شاما کی دوکان پر پہنچا مگر قصر شیرین اس مدت میں بہت کچھ بدل گیا تھا ان کی دوکان جسکے آگے ایک پیتل کا گھنٹا لٹکا کرتا تھا اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی دوکان کا اشتہار دیا کرتے تھے اس کی ہیئت بالکل بدلی ہوئی تھی اور ان کی دوکان پر ایک زلاک قابض تھا۔ آس پاس کئی ایک نئے قہوہ خانے بن گئے تھے۔ جہاں بڑا مجمع تھا اور ہر طرف ایسی چہل پہل تھی اور ایسی اجنبی صورتیں نظر آرہی تھیں کہ استاد شاما کا پتہ لگانا مشکل تھا۔ میں ان کے مکان پر گیا وہ بھی دوسروں کے قبضے میں پایا۔ تلاش وجستجو کے بعد ایک بوڑھے ہمسایہ کرد سے معلوم ہوا کہ استاد شاما کئی سال ہوئے کرمانشاہان چلے گئے ہیں اور ان کا قیام وہیں ہے۔

اب میرے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ قصر شیرین سے بغداد واپس جانا سخت پریشان تھا میرزا حسین خاں متوفی جو اس وقت انگریزوں کی طرف سے قصر شیرین میں وکیل تھے ان کے پاس گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ گمرگ خانہ انگریزی میں ارمنی مدیر جو عراق کی بغاوت کے دوران میں بہت سا روپیہ لیکر فرار ہوگیا ہے اس کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ میں وہاں پہونچا انگریز کلکٹر آف کسٹمس سے ملا اور بغداد سے چند روز کے بعد میر اتقرر گمرگ خانہ کے قائم مقام مدیریت پر منظور ہوگیا۔

ایک دن میں بغداد کے مال درآمد کا جائزہ لے رہا تھا کہ قند اور چائے کی متعدد بوریوں پر جو بغداد سے کرمانشاہان بھیجی گئی تھیں۔ مجھے یہ پتہ لکھا ہوا نظر پڑا "مرزا شاہ مراد خاں خیابان لالہ زار۔ کرمانشاہان۔ میں اس نام پر غور کر رہا تھا کہ پیچھے سے میری پیٹھ پر کسی نے بڑی زور سے تھپکی دی مڑکر دیکھتا ہوں تو استاد شاما خود زرق برق لباس میں موجود ہیں۔ جب وہ ہماری پیشانی کو کئی بار چوم چکے تو اپنی سرگزشت ان مختصر الفاظ میں سنائی۔

چوں عربها در عراق شلوق کردند۔ من خانقین رفته بودم که قند و چلے بخرم۔ پس گردن ما در قصر شیریں بود که همه راه تجارت بر ایران بسته شد و قند به دو توماں ایک کلہ شد بجان شما چلے فائدہ بردم۔ وحالا من زنگیں ہستم"

اگر استاد شاما چند روز پہلے مجھ سے ملے ہوتے تو میں ضرور ان سے دس تومان۔ دولا کر اُن سے کچھ مالی امداد کی درخواست کرتا مگر اب مجھکو اس کی حاجت نہ تھی اور نہ میں نے اس دس تومان یاد دلانے کی ضرورت سمجھی۔ بعد کو جب میں مادام مسریکو دچ میگریڈیشن کی زلف میں بند ہکر بادکوبہ روس گیا اور راستے میں کرمانشاہان پڑا تو استاد شاما کا پتہ لگانے کرمانشاہاں کے خیابان میں دو بار گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

ابن السبیل

فلسفۂ مذہب

(سلسلۂ ماسبق)

قدیم یونانیوں میں سب سے پہلے تناسخ کے عقیدہ پر جس نے کلام کیا ہے وہ فرمکیڈیس ہے اور اس کے بعد فیثاغورث جو فرلیڈیس کا شاگرد ہے اور اس عقیدہ کا سب سے بڑا مشہور حامی ہوا ہے۔ غالباً فیثاغورث نے اس خیال کو نہ خود پیدا کیا ہے اور نہ کسی غیر اقوام کے خیالات سے اخذ کیا ہے، بلکہ اس نے ارفیس کے مذہب کو تھریس سے لاکر یونان میں رواج دیا اور اس خیال کو پھیلانے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی اس کے بعد افلاطون نے اس کی مزید تائید کی اپنی کتاب جمہوریت (The Republic) میں افلاطون نے اس مسئلے کو واضح کرنے کے لئے ایک تمثالی قصہ بیان کیا ہے کہ ارمینیس (Armmius) کا لڑکا اپنے مرنے کے بارہ دن کے بعد معجزانہ طریقے سے زندہ ہو گیا اور اس نے اس عالم کی کیفیت بیان کی۔ وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوسروں کے ساتھ دار القضا میں پہونچا اور اس نے وہاں روحوں کو دیکھا کہ وہ اعراف اور بہشت سے نکل نکل کر واپس جا رہی ہیں وہ ان کے ساتھ اس جگہ پر پہونچا جہاں یہ روحیں جا جا کر انسان یا حیوان کی صورت اختیار کرتی تھیں۔ وہاں اس نے ارفیس کی روح کو راج ہنس کی صورت میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تھمیراس (Thymmyras) کو بلبل کی شکل میں اور اٹلانٹا (Atlanta) کو پہلوان کی صورت میں اس نے دیکھا کہ انسان جانوروں کی صورت میں منتقل ہو رہے ہیں اور وحشی و پالتو جانور ایک دوسرے کی صورت میں اس کے بعد یہ روحیں چشمۂ حیات (Lethe) سے سیراب ہو کر ستاروں کی طرح اپنی پیدائش کی جانب طلوع ہونے کے لئے نکل گئیں۔ افلاطون نے اسی طرح کی اور بھی اوہامی اور فرضی باتیں اس کتاب اور اپنی دوسری کتابوں میں درج کی ہیں۔ افلاطون کے نزدیک ارواح کی ایک مقررہ تعداد موجود ہے اور دنیا میں جو پیدائش کا سلسلہ جاری ہے وہ محض انھیں روحوں کے تناسخ کا نتیجہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے عوام کے اوہام کو حسب عادت زیادہ وقعت دیکر اپنے خیالات کے مطابق بنانے کے لئے تھوڑی بہت ترمیم کر دی ہے۔ مگر ارسطو جو عوام کے اوہام کا دشمن تھا اس کا خیال معاد کی نسبت تناسخ کے بالکل خلاف ہے۔ یونان کے ازمنۂ مابعد کے ادب و فلسفہ میں کہیں کہیں تناسخ کا پتہ چلتا ہے۔ رومیوں میں بعض کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال ان لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا مثلاً اینس (Ennius) نے ایک جگہ کہا ہے کہ اس نے ہومر کو خواب میں دیکھا اور ہومر نے اس سے کہا کہ اس کی روح پہلے جنم میں مور کے اندر تھی۔ تناسخ کا خیال کہیں کہیں پلاٹینس (Platinius) اور اشراقیین (Neo-Platonists) کے آخری زمانہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بعض فرقوں میں بھی تناسخ کے خیال کا پتہ چلتا ہے۔ اور مسلمانوں کے بعض فلاسفہ اور صوفیہ میں بھی یہ خیالات پائے گئے ہیں اور موجودہ زمانے میں تھیوسوفسٹ

کے ماننے نے اس خیال کو اپنا خاص عقیدہ بنا لیا ہے۔ مگر سوائے تھیوسوفسٹ اور ہنود کے مذہب سے علیحدہ ہو کر کوئی صاحب فراست تناسخ کے مسئلے کو ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا تعلق ہے وہ اوہام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا (یعنی انسان اپنے اعمال کی بدولت کبھی نباتات کبھی حیوانات میں جنم لیتا ہے) کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نظام عالم کے لئے ضرورت ہے کہ انسان لازمی طور سے بدی کرے تاکہ نباتات وجمادات وحیوانات (جن کے بغیر عالم کا وجود ممکن نہیں) پیدا ہوتے رہیں۔ البتہ تھیوسوفسٹ جو انسان کی روح کو دوسرے جنم میں انسان ہی کے اندر منتقل ہونا تسلیم کرتے ہیں اور جمادات وحیوانات ونباتات کو غیر ذی روح جانتے ہیں ان کے خیالات ایک حد تک قابل توجہ ہیں یہ ضرور ہے کہ دنیا میں سوسائٹی کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ خدا کے انصاف پر انسان کو بادی النظر میں مشتبہ کر دیتا ہے۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک کوڑھی یا مادرزاد اندھے کا کیا قصور ہے کہ وہ کوڑھی یا اندھا پیدا کیا گیا۔ یا ایک شخص غریب گھرانے میں کیوں پیدا کیا گیا۔ اور دوسرا راجہ کے یہاں کیوں پیدا ہوا۔ مگر یہ تناسخ کے ماننے سے بھی حل نہیں ہو سکتا۔ انسان نہیں جانتا کہ وہ پہلے کیا تھا اور اس نے کیا کیا تھا جب اس کو اپنے پہلے جنم کی خبر ہی نہیں تو اس کا اس پاداش میں مبتلا ہونا لغو اور بے معنی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان کو اپنے پہلے جنم کی کچھ خبر نہیں تو تناسخ کا مسئلہ سرے سے حیات بعد الممات کو ہی ختم کر دیتا ہے اور مرنے کے بعد انسان بالکل اسی طرح گم ہو جاتا ہے جیسا مادئین خیال کرتے ہیں۔ ہم دکھلا چکے ہیں کہ حیات بعد الممات ہی پر مذہبی خیال کی ابتدا ہے اور ہماری ہستی ہماری گزشتہ یا دپر موقوف ہے اگر ہم کو پچھلی یاد کچھ بھی نہیں تو ہماری موجودہ ہستی کو کسی پچھلی ہستی سے ملانا محض بے سود وعبث ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ عقیدہ محض انسان کی تسلی کیلئے ہے تاکہ وہ قناعت پسند ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی وہ بڑی مصیبتیں جن پر اس کی ترقی کا دارومدار ہے وہ بیکار ہو جائیں گی۔ اور روح کا اس طرح چکر دیا جانا بے نتیجہ ہوگا۔ بدی دنیا میں ویسی ہی موجود ہے جیسے پہلے تھی۔ اگر ایک نیک شخص مرنے کے بعد راجہ بن کر دوسرے جنم میں پیدا ہوا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ راجہ اب کی بار اور زیادہ نیک بنکر دوسرے جنم میں مہاتما پیدا ہوگا۔ بہت ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ پھر برائی کرے اور دوسرے جنم میں پھر ذلت ونکبت میں مبتلا ہو۔ غرضکہ اس چکر نے ابنائے دنیا کے مکروہات میں کوئی کمی نہیں کی۔ اگر اس چکر کا کوئی آخری نتیجہ ہے تو وہ دنیا کی ایک ہی زندگی کے بعد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے اور اگر اس کی کوئی انتہا نہیں ہے تو انسان کی فطرت جو راحت دائمی کی خواہش مند ہے۔ یہ صورت مشکل سے پسند کریگی۔

ایک اور بڑی فاحش غلطی جو تناسخ ــــــــــ کے ماننے والوں کے ساتھ بعض وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو صرف حشر روح بلا جسم کے قائل ہیں وہ یہ ہے کہ روح جیسا ان کا خیال ہے بالکل ایک علیحدہ اور خود مختار چیز نہیں ہے روح کی حالت یقیناً ایسی نہیں ہے کہ اس کا تعلق اپنے جسم سے محض لباس کی طرح ہو موجودہ سائیکالوجی کے اصول سے جسم وروح کے لگاؤ کے ساتھ ہی انسان کی ہستی پیدا ہوتی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ روح ایک جسم (مثلاً جان کی جسم) سے نکل کر دوسرے جسم (بیوی کے جسم) میں چلی جائے تو وہ اپنی موجودہ حالت میں اس کی بیوی کے بجائے اس کی ماں ہو جائیگی اور اس کے ادراک میں فرق نہ ہوگا۔ حالانکہ اگر جسم محض روح کا لباس ہو تو ایسی صورت میں ایک فلاسفر کی روح کتے کے جسم میں داخل ہو کر اس کتے کو بہت بڑا نکتہ رس فلسفی بنا دے

مگر جیسا ہم نے دکھلایا ہے تناسخ کا عقیدہ انسان کے ایام وحشت کے ادنیٰ خیالات سے پیدا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو مذاہب تناسخ کو اصولاً مانتے ہیں ان کے ہاں بھی بہشت و دوزخ کا خیال موجود ہے۔ تناسخ کے مسئلے کو ترک کرنے کے بعد دنیا کے تمام مذاہب ما، کی نسبت ان تین خیال پر متفق ہیں

(۱) روز قیامت

(۲) حشر

(۳) سزا و جزا۔ یعنی ایک دن تمام تمام انسان خدا کے سامنے حاضر ہوں گے۔ خدا ان کے درمیان فیصلہ کریگا اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو بہشت و دوزخ میں بھیجیگا۔ بہشت وہ جگہ ہے جہاں دنیا کی تمام مسرتیں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں نیک انسانوں کو عطا ہونگی، اور دوزخ وہ جگہ ہے جہاں بدکار درخ سخت عذاب سے دوچار ہونگی۔ سب سے زیادہ صراحت قیامت دوزخ و بہشت کی قرآن کی آیات کریمہ میں ہے تالمود۔ بائبل اور مجوسیوں میں بھی یہی خیالات ہیں اگرچہ فروع میں کچھ فرق ہے اور دوزخ کی سختیوں کو تقریباً ان تمام کتب نے آگ میں جلنے سے مشابہت دی ہے بلکہ قرآن میں اس کثرت کے ساتھ جہنم کی آگ کا ذکر ہے کہ اس کے لئے اور کوئی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور اس کی ہولناکی سے انسان کے بدن میں رعشہ پڑجاتا ہے اور خدا کی نسبت یہ وہم گزرتا ہے کہ وہ ہماری دنیا کے ایک جابر اور بدلہ لینے والے خونخوار کینہ پرور شخص کے مانند ہے۔ جو ہماری کمزوریوں کو اس سختی سے گرفت کریگا گویا کہ ہمارے ان اعمال نے اس کو کسی طرح کا نقصان پہونچایا ہے اور اس کے دل میں ہماری طرف سے ایسا بغض ڈالدیا ہے کہ ابدالاباد تک ہم کو جلا کر خاک سیاہ کرنے پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر قرآن میں اگر کوئی اور معنی نہیں رکھتا ہے تو ہم مجبوراً اس بات کا اعتراف کریں گے کہ عقل و فطرت انسانی ایسے بغض رکھنے والے اور ہم کو جلا کر تسکین پانے والے سنگدل سے ضرور ابا کریگی اور اس حیثیت سے یا تو خدا کی صفات رحم و کرم بے معنی ہوجائیں گے یا پھر خدا کی نسبت یہ تصور لامحالہ ہوگا کہ اس کا یہ قہر اس کے خود ضعف و کمزوری کا نتیجہ ہے اور گویا انسان اس کا ایک مدمقابل دشمن ہے۔ نعوذ باللہ۔

جہاں تک قیامت کا سوال ہے وہاں تک تو عقل اس کو تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں پاتی کہ دور انقلابات عالم ایک وقت میں دنیا کو غیر آباد و منجمد بنا دیگا جبکہ یہ عظیم الشان پہاڑ ذرے ذرے ہوجائیں گے اور ستارے آفتاب ماہتاب بلکہ تمام نظام عالم درہم برہم یا آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہوجائیگا۔ اس کے بعد پھر ایک نئے آسمان اور نئے زمین کی بنیاد پڑیگی اور اس عالم میں ہم اپنی ہستی کو گم کئے بغیر لاکر کھڑے کئے جائیں گے۔

اس وقت ہمارے پچھلے اعمال تولے جائیں گے۔ اور ہماری کوتاہیاں جو دنیا میں باقی رہ گئی ہیں وہ دارالجزا میں پوری کیجائیں گی مگر عقل جس امر سے منحرف ہوتی ہے وہ سزا و جزا کی وہ صورت ہے جو علماء نے بیان کی ہے (اور احادیث کی روایت سے) اور جن کی بنا پر

۵؎ حاشا و کلا میں حدیث پر تمسخر نہیں کرتا۔ صرف اپنے فقہا کی سمجھ پر ہنسی آتی ہے۔ ابوہریرہ کی یہ روایت کہ اللہ تعالےٰ ایسے شخص کی طرف نظر اٹھا کر رحمت سے نہ دیکھیگا جو اپنی ازار کو اس قدر لانبا بناتے ہیں کہ گھسٹ کر چلے وغیرہ یہ درحقیقت یہودیوں کے متعلق ایک کنایہ ہے (باقی صفحہ آئندہ)

خدائے تعالیٰ ہمارے پائجامے اور ازار کے لانبے ہونے پر بھی آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور محض اس تصور پر مجکو دوزخ میں جھونکنے تیار ہوجاتا ہے، قبل اس کے کہ ہم اس کے جواب میں کچھ اپنی طرف سے کہیں ہم علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے کتاب الکلام سے انکی بحث اس مسئلہ پر یہاں نقل کریں گے

"سزا اور جزا کے متعلق تمام اہل مذاہب کا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ انسان جب خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تو خدا ناراض ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ دنیا دار العمل ہے اس لئے یہاں تو انسان کو سزا نہیں ملتی۔ لیکن جب قیامت میں خدا مسند حکومت متمکن ہوگا تو تمام معاملات اس کے حضور میں پیش ہوں گے۔ اور خدا حسب مراتب لوگوں کو انکی نافرمانیوں کی سزا دیگا۔ اسیطرح لوگوں نے اطاعت اور فرمانبرداری کی ہے۔ ان کو علی قدر مراتب انعام ملیں گے۔

یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے اور عام لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے اس سے بہتر طرز نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ عذاب و ثواب کی اصلی حقیقت نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنے کا ایک پیرایہ ہے۔ اصل حقیقت ہے کہ جس طرح عالم جسمانیات میں اسباب و علل اثر و تاثر کا سلسلہ ہے مثلاً سنکھیا قاتل ہے۔ گلاب محرک نزلہ ہے۔ املتاس مسہل اسی طرح یہی سلسلہ روحانیات میں بھی قائم ہے نیک و بد جس قدر افعال ہیں ان کا نیک و بد اثر روح پر مرتب ہوتا ہے اچھے کاموں روح کو انبساط ہوتا ہے برے افعال سے انقباض اور آلودگی اور نجاست کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ نتائج ہیں جو اس سے جدا نہیں ہوسکتے۔ فرض کرو کہ ایک شخص نے کسی کی ایک چیز چرائی۔ اب اگر وہ شخص جس کی وہ چیز تھی صاف بھی کردے تو چوری کرنے سے شخص کی عزت پر جو داغ آگیا ہے وہ کسی حالت میں ضائع نہیں ہوسکتا۔ غرض اچھی روح میں جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے اور کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے اسی کا نام عذاب و ثواب ہے اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہے۔ امام غزالی مضنون غیر اہلہ میں لکھتے ہیں۔

"امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئیگا اور وہ انتقام لیگا۔ بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے پاس نہ جائیگا۔ اس کے اولاد نہ ہوگی۔ طاعت و معصیت کی وجہ سے قیامت میں جو عذاب و ثواب ہوگا اس کی بالکل یہی مثال ہے۔ لہذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں ہوتا ہے۔ گویا یہ سوال کرنا ہے کہ زہر کھانے سے جاندار کیوں مرجاتا ہے۔"

امام صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی تصریح کردی ہے کہ خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن باتوں سے روکا ا

جو آنحضرت کے زمانے میں تھے۔ اور دولت کے غرور میں اپنے ازار کو عربوں سے زیادہ لانبی رکھتے تھے۔ یہودیوں کا یہ تفاخر تھا۔ جس کو غالباً ابوہریرہ دیکھ کر آنحضرت کا ایک قول حسب عادت بیان کردیا۔ یہودیوں کی اس عادت کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں ہے۔ میں حدیث کی اکثر روایا صحیح جانتا ہوں۔ لیکن صرف تاریخ و سیر و مغازی میں مذہبی اصول میں قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کی سند نہیں لیتا۔ کیونکہ قرآن کے سوا کتاب میں صحیح و غلط روایت کا احتمال ہے۔ س۔ م۔ ا

مثال یہ ہے کہ جس طرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مریض اگر طبیب کے حکم کے موافق عمل نہیں کرتا تو اس کو ضرر ہوتا ہے۔ یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مریض نے بد پرہیزی کی۔ لیکن عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی۔ اس لئے ضرر ہوا۔ حالانکہ ضرر کی اصلی علت بد پرہیزی ہے۔ فرض کرو کہ طبیب بد پرہیزی سے منع نہ بھی کرتا تاہم بد پرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا۔ اسی طرح خدا گناہوں کے ارتکاب سے منع نہ بھی کرتا۔ تاہم ان گناہوں کے ارتکاب سے روح کو وہی صدمہ و عذاب ہوتا۔

ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا کو گناہ پر عذاب دینے سے کیا حاصل۔ یا سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے جس کو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو یا پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ اور خدا اس سے بری ہے۔ اگر تمام عالم فسق و فجور میں پڑ جائے یا نماز روزہ بجا نہ لائے تو اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ اس صورت میں انتقام لینا بے فائدہ ہے۔ ملاحدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت تمام اہل مذاہب نے خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا ہے اور چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بادشاہوں کو احکام کی نافرمانی سے سخت طیش دلاتی ہوتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سخت سزائیں دیتے ہیں۔ اس لئے اہل مذاہب نے خدا کی نسبت بھی یہی خیال قائم کیا کہ وہ گناہوں سے ناراض ہوتا ہے اور قیامت میں گنہگاروں کو دوزخ میں گوناگوں عذاب دیگا۔ لیکن عذاب و ثواب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے تو ملاحدہ کا اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے۔

اسلام نے عذاب و ثواب کے متعلق عام طور پر اگرچہ بیان کا وہی پیرایہ اختیار کیا ہے جو تمام اہل مذاہب کا تھا اور عام طبائع کے لئے وہی طریقہ ناگزیر بھی تھا۔ لیکن اس باب میں اسلام کو جو ترجیح ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام نے اصل حقیقت بھی صراحتاً و کنایۃً ظاہر کردی یہ ہی وہ خصوصیت ہے جو ہر موقع پر اسلام کو تمام اور مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ تمام اگلے مذاہب میں صرف عوام کی تلقین و ہدایت کا لحاظ ہے۔ اصل حقیقت سے یا خود بانیان مذہب بے خبر تھے یا اگر باخبر تھے تو وہ خواص کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصد نہیں قرار دیتے تھے بخلاف اس کے اسلام تمام دنیا کی ہدایت کے لئے آیا جس میں عالم و جاہل۔ احمق و نادان، عارف و عامی۔ زاہد و صوفی۔ ظاہر پرست و فہیم سب داخل تھے۔

عذاب و ثواب اور معاد کی اصل حقیقت کی طرف قرآن مجید میں جا بجا اشارے ہیں بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں۔

"كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ" ہاں اگر تم کو علم یقین ہوتا تو تم دوزخ کو دیکھ لیتے۔ امام غزالی جواہر القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ "اى ان الجحيم في باطنكم" یعنی دوزخ خود تمہارے اندر موجود ہے۔

ایک اور مقام پر ہے۔ "وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ" (کفار تجھ سے کہتے ہیں کہ عذاب جلدی آیا حالانکہ دوزخ نے کافروں کو ہر طرف سے چھا لیا ہے)

امام غزالی اس آیت کے متعلق جواہر القرآن میں لکھتے ہیں۔ "ولم يقل انها ستحيط بل قال هي محيطة" (خدا نے یہ نہیں کہا کہ دوزخ آئندہ محیط ہو جاویگی۔ بلکہ یہ کہا کہ ابھی اسوقت محیط ہے)

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے

"اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا" ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ مہیا کر رکھی ہے جس کے پردوں نے ظالموں کو گھیر لیا ہے۔ امام غزالی اس کے متعلق کہتے ہیں "وَلَمْ یَقُلْ یُحِیْطُ بِهِمْ" (خدا نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ گھیر لیگی)

امام صاحب ان آیتوں کی یہ تفسیر لکھ کر کہتے ہیں۔

"قال لم تفهم المعانی کذلك فلیس لك نصیب من القرآن الا فی قشوره کما لیس فی البهیمة نصیب من البر الا فی قشره"

(تو اگر تم مطالب کو اس طرح نہیں سمجھتے تو تم کو قرآن سے صرف اس کا چھلکا ہاتھ آیا ہے جس طرح بہائم کو گیہوں میں سے صرف بھوسی ہاتھ آئی ہے)

مگر امام غزالی کی ان تاویلات سے قرآن کی وہ آیتیں جن میں دوزخ کا نقشہ ایسی صورت میں کھینچا گیا ہے کہ دوزخیوں کے کپڑے تارکول سے پوتے گئے ہیں اور وہ مشعل کی طرح جل رہے ہوں گے اور جب انکی موٹی کھال جل جاویگی تو اللہ نئی کھال پیدا کر دیگا۔ دوزخ کے اندر وہ شدت عذاب سے چیخیں گے چلائیں گے وہ زنجیروں سے بندھے ہوں گے اور ان پر آتشیں گرز پڑ رہے ہوں گے۔ غرضکہ قرآن کا نقشہ ایسا ہے جو اس قسم کی تاویلات سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ خود دوزخ۔ برزخ۔ بہشت۔ جہنم۔ فردوس۔ عدن وغیرہ کے الفاظ عجمیوں اور یہودیوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ اور قرآن نے بہشت و جہنم میں نہ صرف پارسیوں اور یہودیوں کی بہشت و دوزخ کی تصویر زیادہ فصاحت سے کی ہے بلکہ انھیں کے اصطلاحی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جہنم دراصل فلسطین میں ایک مقام تھا جہاں پچھلے زمانے میں "ملوک" (Maloch) دیوتا کے سامنے چھوٹے بچے قربان کئے جاتے تھے اور بعد کو یہودیوں کے زمانے میں وہاں مجرمین کی لاشیں پھینک دی جاتی تھیں۔ یہ ایک مرکب لفظ "جے" یا "گے" بمعنی وادی اور "ھنام" اسم معرفہ سے بنا ہے۔ دوزخ و برزخ و فردوس و بہشت تو قطعی عجمی الفاظ ہیں عدن اس زمین کا نام تھا جو دجلہ و فرات کے درمیانی نشیب میں واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں بہشت و دوزخ کا تصور اگر پہلے سے موجود تھا تو وہ مجوسیوں، یہودیوں اور نسطوری عیسائیوں کے ذریعے سے آیا تھا۔ اور قرآن نے اس خیال میں کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ اس کو اور ہیبت ناک طریقہ سے ظاہر کیا تاکہ عربوں کے اجڈ اور سخت دل میں خشیت پیدا ہو۔ ایسا ہوا ہے کہ جب تک قوموں کی اصلاح ان کے پرانے عادات و خیالات کے ذریعے سے ممکن ہو سکتی تھی یا ان کے وہ خیالات کفر و شرک کو نہیں پہونچتے یا ان سے اخلاق و نظام معاشرت و تمدن میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا تھا تو الہام ان کے افکار و عادات سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ مثلاً عرب کے لئے حج و عمرہ بہ یادگار سیدنا ابراہیم یا حبشیوں کی پسپائی کی قومی یادگار جو وہ ہر سال امی جمار کی صورت میں کرتے تھے، یا اپنی مورث اعلیٰ یا حضرت اسمٰعیل و حضرت ہاجرہ کی بیابان مکہ میں پانی کی تلاش میں سرگردان پھرنا اور چاہ زمزم کا دریافت کرنا جو "سعی صفا و مروہ" کی صورت میں کرتے تھے، یا سور کے گوشت سے پرہیز کرنا یا ختنہ وغیرہ الہام نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا صرف اتنا کیا کہ جہاں کہیں ان قومی عادات میں شرک و کفر کا میل آگیا تھا ان کو نکال دیا اسی طرح یہودیوں میں رسم بخور و قربانی جو کفار کنعان کا پرانا طریقۂ عبادت تھا۔ اس سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ بلکہ صرف بتوں کے آگے

سے ہٹاکر ان عبادات کو ایک غیر مرئی خدا کی طرف رجوع کر دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ عرب جاہلیت میں قرآن کے رو سے حیات بعد الممات کا کوئی عقیدہ نہیں ملتا اور اس خیال کی ابتدا عرب میں اسلام ہی سے ہوئی ہے۔ اس لئے الہام نے بہشت و دوزخ کے اصطلاحی الفاظ وتعریف میں ان ہی باتوں پر اکتفا کیا ہے۔ جو عرب یہودیوں یا مجوسیوں سے سن چکے تھے اور بقول علامہ شبلی روحانیت کو جسمانیت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور یہ طریقہ تمام مذاہب میں مشترک ہے۔ انسان صرف ان چیزوں کا تصور کر سکتا ہے جو اس نے حواس سے محسوس کی ہوں۔ اس لئے جب ان چیزوں کا بیان کرنا ہو جو آئندہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور تصور سے بالاتر ہیں تو ضرور ہے کہ ان کو جسمانیات کے پیرائے میں ادا کیا جائے۔ مثلاً موت کے بعد جو راحت و رنج ہوگا۔ اس کو بجز اس کے کہ باغ و انہار اور زقوم و مار سے تعبیر کیا جائے اور کیا طریقہ ہے۔ ابن تیمیہ ٹھیٹ ظاہریں ہیں لیکن ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ "پھر خدائے پاک نے ہم کو اس آرام و رنج کی خبر دی جس کا قیامت میں وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ طعام، شراب، ازدواج وغیرہ کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی خبروں سے ہم دنیا میں واقف نہ ہو چکے ہوتے تو ان موعودہ چیزوں کو کیونکر سمجھ سکتے۔ تاہم ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ چیزیں دنیاوی چیزوں کے مانند نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ دنیا اور آخرت کی چیزوں میں سوائے نام کے کسی چیز میں مشارکت نہیں"

مولانا روم نے اس مضمون کو مختلف موقعوں پر نہایت عمدہ مثالوں سے ادا کیا ہے۔

ہیچ ماہیات اوصاف کمال	کس نداند جز بہ آثار و مثال
طفل ماہیت نہ داند طمث را	جز کہ گوئی ہست چوں حلوا ترا
طفل را نبود ز وطی زن خبر	جز کہ گوئی ہست آں خوش چوں شکر
کے بود ماہیت ذوق جماع	مثل ماہیات حلوا اے مطاع
لیک نسبت کرد از روے خوشی	با تو آں عاقل کہ تو کودک وشی

مگر سوال یہ ہے کہ یہ مسرت و اذیت روحانی ہو یا جسمانی ہنگامی ہوگی یا دوامی۔ بہشت کے لئے دوامی ماننا تو فطرت انسانی کیلئے قابل قبول ہے مگر دوزخ کے لئے دوامی ماننا خدا کی مصلحت و حکمت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم دنیا ہی کی مثالوں سے عالم ارواح کا تصور کریں تو یہ بات نہایت واضح اور بین ہے کہ انسان ابدالآباد تک کرب و تکلیف کا تحمل نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب انسان پر سختی حد سے زیادہ ہوتی ہے تو موت اس سختی سے نجات دینے کے لئے آموجود ہوتی ہے۔

اگر عالم مابعد الموت ہماری موجودہ زندگی کے سلسلے میں ہے تو اس کے عواقب و نتائج یہ ہونے چاہئے کہ جو ہستیاں دنیا میں اپنے افعال خبیثہ و مناہیات و منکرات سے آلودہ نہیں۔ ان کے لئے دوزخ ایک قسم کی مصلح ہو جہاں وہ روح کو آلائشوں سے پاک ہو کر بہشت میں داخل ہونے کے قابل بن سکیں۔ یہ صورت دل کو بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر قرآن نے دوزخ و بہشت میں "خلدین فیہا" کا ایک ہی جملہ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنے ہمیشگی کے ہیں۔ ایسی صورت میں سب سے پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ آیا دوزخ کے

مستوجب محض کفار ہی ہیں یا وہ مسلمان بھی ہیں[۵] جن کے اعمال کفار کی طرح ہیں۔ اگر محض لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار سے کافر و مسلم میں تفریق ہوسکتی ہے تو کیا وہ کروڑ ہا کروڑ انسان جو امریکہ و چین۔ یورپ و افریقہ میں بسے ہوئے ہیں اور جن کے مقابل مسلمان دس فیصدی بھی نہیں وہ سب دوزخ کے کندے ہیں۔ ایسی صورت میں تو خدا کا اصل مقصد آفرینش یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انسان کو اس خوبی و حکمت سے بنانا کہ وہ بہترین مخلوقات بلکہ خلیفۃ الارض کہلائے محض اس لئے ہے کہ وہ سب آگ کے سپرد ہوجائیں پھر جب غیر مسلم کا آخری ٹھکانا صرف دوزخ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مسلم کے درمیان نیکی و بدی کی جزا و سزا کہاں پوری کی جائیگی۔ جب کہ وہ سب بلا تفریق دوزخ میں رہیں گے۔ اس لئے دل تو یہ کہتا ہے کہ بہشت دوزخ کی آبادی کے لئے مسلم و غیر مسلم کی تقسیم مناسب نہیں اور نہ قرین انصاف ہے کوئی اور تقسیم ہونی چاہئے جو محض اعمال پر مبنی ہے۔ اور سب کا آخری ٹھکانا بہشت ہو کسی کو جلد کسی کو بدیر۔

امام جاحظ کا یہ قول قابل غور ہے کہ دوزخ کا عذاب مقابلتہً عذاب معلوم ہوگا۔ یعنی اہل دوزخ کی سختیاں اہل بہشت کو سختیاں معلوم ہونگی اور اہل دوزخ کو اہل بہشت کی حالت قابل رشک ہوگی۔ اس لئے کہ لذت و الم محض ایک تعریف متقابل ہے اور اس کا کوئی کلیہ نہیں ایک ہی چیز ایک شخص کے لئے عذاب ہے اور دوسرے کے لئے راحت اس کی مثال یوں لو کہ

—— دو شخص ایک نہایت ہی پرفضا مقام پر مقیم ہیں۔ جہاں آبشار ہے۔ ہرے بھرے میدان ہیں۔ نغمہ ہے اور ہر قسم کے لذائذ جو حواس خمسہ کو بھلے معلوم ہوسکتے ہیں موجود ہیں مگر ایک شخص دنیا کی آلام سے بے فکر ہے اور دوسرے کو یہ فکر ہے کہ چند روز کے بعد اسکو پھانسی ہوجائیگی یا اس کا دیوالہ نکل جائیگا یا اس قسم کی کوئی سخت فکر و پریشانی اس کو دامنگیر ہے تو پہلے شخص کی راحت یقیناً دوسرے شخص کی راحت نہیں۔ حالانکہ دونوں ایک ہی مناظر سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ایک بے غم ہے مگر دوسرا فکر میں ایسا غلطاں و پیچاں کہ اس کو یہ سب مناظر کاٹے کھاتے ہیں۔ تو در اصل کافر کی دوزخ یہ ہے کہ اس میں لطف و مسرت کی صلاحیت ہی باقی نہ رہیگی۔ وہ اپنے اعمال و عقائد کی بھیانک صورتوں کو دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا ہے اور جس طرح ہم کشمیر جنت نشان میں بیٹھ کر صحرائے افریقہ و عرب کے باد سموم میں جھلسنے والے انسانوں یا بحر منجمد کے تودوں میں پناہ لینے والی قوموں پر رحم کھاتے ہیں۔ مگر خود وہ لوگ جو انھیں عناصر سے اُٹھے ہیں انکا احساس راحت و تکلیف یقیناً وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے۔ یا جس طرح ایک نفیس طبیعت انسان کے حیات اور ایک حلالخور کے حیات میں زمین آسمان کا فرق ہوجاتا ہے کہ ایک شخص کا کام دوسرے کے لئے عذاب ہے اسی طرح بدکار و بد اعمال لوگوں کی سزا یہی ہے کہ اُن کے خود اعمال انکی احساسات و ذہنیت کو اس طرح خراب کردیں گے کہ وہ اپنے اندرونی کرب سے اپنے لئے ایک دوزخ بنالیں گے۔

ہم آگ کے کیڑے کو آگ میں دیکھ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس کو آگ کی وجہ سے تکلیف ہے جیسے ہم محسوس کرتے ہیں مگر اس کو

---

[۵] خوارج کا خیال تھا کہ اعمال سے بھی کافر و مسلم کی تفریق ہوتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کبائر کا مرتکب ویسا ہی کافر ہے۔ جیسا غیر مسلم اور اس کی تائید میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ من قتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جہنم خالدین فیھا

کوئی تکلیف نہیں۔

خلاصہ یہ کہ خدا۔ تکوین۔ تقدیر و معاد مذہب کے ایسے مسائل ہیں جو ایک حد تک ناقابل فہم مگر ناگزیر مسلمات ہیں۔ اور معاد کے بارے میں جتنا ہم لکھ چکے ہیں۔ اس سے زیادہ عقل کام نہیں دیتی۔ نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس زمین پر دوزخ اور بہشت کا وجود ہوگا اس کا جغرافیہ کیا ہوگا۔ اس کے حدود اربعہ کیا ہوں گے۔ اس کا رقبہ کیا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہونگے کہ بہشتی اپنے آرام کی جگہ سے دوزخی کی حالت کا موازنہ کرسکیگا۔ تکوین سے لیکر آخر تک جتنے انسان دنیا میں گزرے ہیں انکی جماعت کہاں سمائیگی۔ مگر جہاں تک معاد کا تعلق انسان کے سوشل اور اخلاقی ریفارم سے ہے وہ ایک ضروری حقیقت ہے۔ گو کہ خدا کی طرح ہم اس کی کیفیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ معاد کے بارے میں ہم آخر میں اتنا ہی کہ سکتے ہیں کہ انسانی فطرت اس خیال کی تائید میں ہے اور معاد ایک حقیقت ہے جس کی خبر الہام نے دی ہے اور یہ ویسی ہی ایک حقیقت ہے جیسے خدا کا وجود۔ مگر خدا کی طرح معاد کی کیفیت ہماری سمجھ سے باہر ہے اور جہاں تک ہماری سمجھ میں آسکتا ہے اس کو مثالاً الہام نے سمجھا دیا ہے۔

سید مقبول احمد

صدائے شکست

(فسانہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

چند روز سے راجکمار کی آمد و رفت ملہر راؤ کے ہاں زیادہ ہو گئی تھی اور بعض دفعہ گھنٹوں رجنا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے کا موقعہ اسے مل جاتا تھا، لیکن سوائے اس کے کہ لکچر کی طیاری میں جس قدر خاموش مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ تو ضرور دیدیتا تھا، اور اس کے علاوہ نہ وہ کسی اور گفتگو کی جراءت اپنے اندر پاتا تھا، نہ رجنا کی طرف سے اس کی ابتدا ہوتی تھی۔ مسودہ کی ترتیب کتابوں کا اقتباس تحریر و نقل کی خدمت وہ نہایت مسرت کے ساتھ انجام دیتا۔ لیکن جب کبھی ذاتی رائے کا موقعہ آتا، فنی تنقید کی ضرورت ہوتی تو وہ اس خیال سے کہ کہیں میری تعریف تحسین ناشناس بنکر رجنا کو برہم نہ کر دے، ہمیشہ خاموش ہی رہتا۔ حالانکہ رجنا میں اگر کوئی عیب تھا تو صرف یہ کہ وہ ذرا خوشامد پسند تھی، اپنی تعریف سے خوش ہوتی تھی اور اگر کبھی کوئی موقعہ نمود و نمائش کا ملجاتا تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس لئے وہ راجکمار کی خاموشی کا مطلب کبھی یہ سمجھتی کہ شاید وہ میرے کمال کا معترف نہیں ہے جس کو وہ اپنی توہین سمجھکر اک نوع کا جذبۂ احتراز اپنے اندر پرورش ہوتے ہوئے محسوس کرتی۔ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ راجکمار کی نگاہ نہایت خاموش پسندیدگی دنیا بتیں ہوکر نکلتی ہے لیکن اس کو وہ کسی اور جذبہ سے متعلق سمجھتی تھی۔ اور یہ اس کو پسند نہ آتا تھا کہ دنیا عورت ہونے کے لحاظ سے اُسے دیکھے، موسیقی ہی اس کی زندگی تھی اور وہی فضا اس کی تمام جذبات کی دنیا تھی، اس لئے اگر اس حیثیت سے ہٹکر کوئی اسے دیکھنا چاہتا تو وہ دل میں ہنستی کہ دنیا کس قدر بیوقوف ہے اور بجائے میری زندگی سے محبت کرنے کے، میری موت سے الفت کرنا چاہتی ہے۔ عورت ہونے کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو مردہ سمجھتی تھی اور اس لئے وہ راجکمار کو بھی مردہ پرست لوگوں میں شمار کرتی تھی۔ بعض وقت اسے حیرت ہوتی کہ جب راجکمار خود موسیقی کا اچھا ماہر ہے تو وہ کیوں اس کی فنی زندگی کو پسند نہیں کرتا وہ کیوں اس کے اظہار کمال پر خاموش ہو جاتا ہے، وہ کیوں حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا، وہ کیوں پیغام روح کو نظر انداز کرکے صرف دعوتِ جسم کا شائق ہے۔ وہ بعض وقت گھنٹوں سوچا کرتی کہ اگر راجکمار واقعی وہی ہو جائے جیسا وہ چاہتی ہے تو کیا ہو؟ اس کے بعد وہ زیادہ دیر تک غور نہ کر سکتی تھی کیونکہ یہیں سے اسپر فریب نفس کی حقیقت کھلنے لگتی اور یہ دیکھکر کہ اس کے بعد خیال کی وہی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس کی بنا پر وہ راجکمار سے احتراز کرتی ہے تو آگے سوچنا ترک کر دیتی اور گھیر اکر پھر اسی نقطہ پر آجاتی، جہاں اُس کو صرف اپنا ہی تفوق نظر آتا تھا۔

یہ سب رجنا کا خیال ہی خیال تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راجکمار سب سے زیادہ اس کے فن ہی کا دلدادہ تھا۔ اور رجنا کے کمال موسیقی ہی نے اس کو گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن چونکہ وہ فطرتاً بہت خاموش تھا اور اظہار پسندیدگی کو نہ صرف فن بلکہ خود

خودپسندیدگی کی توہین سمجھتا تھا، اس لئے خاموش رہتا اور کھلے سے کھلا طریق اظہار جو اختیار کرتا، وہ ایک گہری سانس اور نم آلود نگاہ سے زیادہ نہ ہوتا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس کا دل صرف اسی پر قانع تھا، اتنا ہی غلط تھا جتنا اپنی جگہ رجنا کا خیال۔

اس وقت دونوں اپنے آپ کو روحانیت ہی کے پرستار سمجھ رہے تھے، اور اپنے خیال کی پرواز کو مادی تعلقات سے بہت بلند جانتے تھے۔ لیکن تھے حقیقتاً دونوں مبتلائے فریب۔

جس وقت راجکمار نے لکچر کے اجزا دیکھے اور رجنا کے خیالات وجذبات کا مطالعہ کیا تو اس کی دلدادگی میں خدا جانے کتنا اور اضافہ ہوگیا، لیکن اسی اعتبار سے اس کا سکوت اور بڑھ گیا اور تاثر کی شدت نے اس کی خاموشی کو ایک بیدرد سنگین دلی کی صورت دیدی۔ رجنا کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی اور دل ہی دل میں راجکمار کی بے حسی پر کڑھ رہی تھی۔ راجکمار نے ایک خاص انداز سے مسودہ کو میز پر رکھا اور کہنی ٹکاکر ہاتھ پر سر کو ڈالدیا اور کچھ سوچنے لگا۔ رجنا نے دیکھا اور طعن آمیز ہنسی کیساتھ بولی

"آج پھر آپ کا اتنا وقت ضائع ہوا۔ آپ کے پسند کی چیز کہاں؟"

راجکمار نے جو اپنے خیالات میں ضرورت سے زیادہ منہمک تھا سنا بھی نہیں اور بدستور خاموش ومتفکر بیٹھا رہا۔ رجنا کو اس سکوت سے اور صدمہ پہونچا۔ اس نے اس خاموشی کو اپنی توہین خیال کیا اور آگے بڑھکر میز سے مسودہ لیکر جانے لگی۔ اس نقل وحرکت سے راجکمار کو اس وقت ہوش آیا جب وہ جاچکی تھی۔ وہ چونک کر اٹھا کہ اسے بلائے، لیکن ایک خوفزدہ غلام کی طرح پھر ہمت ساقط ہوگئی اور دروازہ سے باہر نکل کر سڑک پر ہولیا۔ وہ اب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا کہ رجنا اس سے کبیدہ خاطر رہتی ہے لیکن کیوں؟ اس کا وقت اکثر اسی معمہ کے حل کرنے میں بسر ہوتا۔ اپنی کمزوری اور حجاب کو محسوس کرتا تھا، وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے زبان پر نہیں آتا، جو عزت رجنا کی اس کے دل میں ہے، اس کا اظہار اس سے نہیں ہوتا، لیکن اس سے رجنا کیوں ناخوش ہو، کیا وہ میری تعریف کی محتاج ہے، کیا اس کا کمال کسی اعتراف کا پابند ہے، کیا وہ خود اپنے آپ سے واقف نہیں ہے، اور کیا یہ وقوف سارے عالم کی طرف سے بے نیاز بنا دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ اور لوگ جو اس کی صحیح قیمت کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے تھے جب اس کی تعریف کرتے، تو وہ خوش ہوتی، ان پر اپنا التفات صرف کرتی، لیکن اس کی خاموشی پر جو اعتراف ودادکی انتہائی صورت ہے، وہ کوئی توجہ نہ کرتی۔ اس خیال سے اس کا دل بعض مرتبہ بیٹھنے لگتا اور رجنا کی اس کمزوری فطرت پر اس کو سخت افسوس ہوتا ـــ دن گزرتے گئے اور رجنا کی کشش راجکمار کی طرف سے زیادہ سنگین ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اب رجنا کی پرستش ہی میں صرف ہونے لگا۔

ان دونوں کی زندگی کے لئے یہ موقعہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، لیکن دنیا کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، اگر کالج کی فضا میں اس سے انقلاب نہ پیدا ہوتا۔ اس سے قبل اکثر ماہرین فن کی رائے تھی کہ طہرراؤ کے بعد اگر فن کے لحاظ سے کسی کو داد دیجا سکتی ہے تو پہلا نمبر رجنا کا ہے اور اس کے بعد راجکمار کا۔ ہر چند بعض ایسے بھی تھے جو راجکمار کو ترجیح دیتے تھے لیکن اب چند دن سے سب کو اس فیصلہ میں تبدیلی کی ضرورت معلوم ہونے لگی اور سخت حیرت کے ساتھ لوگوں نے راجکمار کے

تفوق کو محسوس کرنا شروع کیا۔

اس میں شک نہیں کہ راحکمار کے گانے میں فن کے تمام جزئیات ہمیشہ تکمیل کے ساتھ پائے جاتے تھے، لیکن چونکہ رجنا کے گلے کا نسائی لوچ اس میں نہ تھا اس لئے دلکشی کا جہاں تک تعلق ہو سکتا ہے وہ رجنا کو زیادہ حاصل تھی۔

سب سے پہلا دن جب اس کے خلاف ایک تغیر عام طور پر محسوس کیا گیا وہ تھا جب رجنا نے انتہائی بے رحمی سے راحکمار کو اپنے گھر آنے سے روک دیا اور ایسے الفاظ برہمی کے ساتھ جو شاید کبھی اس نے استعمال نہ کئے ہوں گے، ملنے سے انکار کر دیا۔

شام کا وقت تھا، کالج میں درس ہو رہا تھا لیکن راحکمار آج اپنے حجرہ سے نکل کر باہر نہیں آیا تھا، سارا دن اسے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے سنبھالنے اور آنسوؤں سے دامن ترکر کرکے آتش ناکامی بجھانے میں صرف کیا تھا۔ وہ یونہی فطرتاً غیور تھا چہ جائیکہ وہ کسی سے محبت کرنے لگے کہ اس صورت میں تو دل کا احساس بالکل شاہانہ اور اس کے خود داریاں آلهانہ ہو جاتی ہیں۔

لوگ اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے، مختلف درجوں میں درس کا سلسلہ جاری تھا۔ رجنا نے اپنا سرود سنبھالا ہی تھا کہ دفعۃً بورڈنگ کی سمت سے کسی دلدوز آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ ہر زبان سے "راحکمار، راحکمار" نکل رہا تھا، لیکن رجنا ایک ایسے اضمحلال کے ساتھ جس میں برہمی اور نفرت کا عنصر غالب ہوتا ہے، خاموش تھی اور سرود کو درست کر رہی تھی۔ راحکمار کی آواز بڑھ رہی تھی، اس کی موسیقی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی اور ہر شخص اپنی جگہ بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

راحکمار کا گانا لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا، روز ہی سننے میں آ جاتا تھا، لیکن آج اس کی دلکشی کچھ عجیب قسم کی تھی اور دل بے اختیار کھنچا جا رہا تھا۔ ملہر راؤ اپنے کمرے سے باہر آ گئے اور انھوں نے بھی، درمیان کے بڑے ہال میں پہونچکر جہاں اس وقت اور پروفیسروں کے ساتھ رجنا بھی بیٹھی ہوئی تھی، پوچھا "کیا یہ راحکمار ہے" سوائے رجنا کے سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں" اور تھوڑی دیر تک سب وہیں خاموشی کے ساتھ سنتے رہے آج اس کی آواز میں ایک خاص کیفیت تھی جو اس سے قبل کبھی نہیں پائی گئی۔ اس کا گانا ہمیشہ نشاط پیدا کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اس سے حزن و ملال کی بارش ہو رہی تھی، اور اس کی آواز کا ہر نشیب و فراز، صرف کراہ کی مختلف صورتیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج رو رہا تھا اور اس کی ماتم زدہ روح موسیقی کے ہر ہر سُر سے آنسو کی طرح بہکر نکل جانا چاہتی تھی،

جب ملہر راؤ کی خواہش پر وہ آیا تو سب نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم آلود تھیں اور چہرہ سے وہ سکون ظاہر تھا، جو یاس و غم کی انتہا سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ گاتا رہا، دیر تک گاتا رہا اور سوائے رجنا کے جو تھوڑی دیر بعد کسی بہانہ سے اٹھکر چلی گئی تھی سب بے اختیار ہو کر داد دینے پر مجبور ہو گئے، ملہر راؤ نے بار بار اُسے گلے سے لگایا۔ رجنا اس دن ہال میں نہیں گائی اور نہ اس نے سرود بجایا۔ گھر پر جاکر کوشش کی، لیکن اس نے خود محسوس کیا کہ آج سرود کا کوئی تار ہم آہنگ نہیں ہوتا اور نہ اس کی روح اس کی آواز کا ساتھ دیتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ گزر گئے اور یہ حقیقت اب ہر شخص پر ظاہر ہو گئی کہ راحکمار کی ترقیاں موسیقی میں وہم و قیاس سے

بھی زیادہ بلند نظر آتی ہیں اور رجنا فن کے لحاظ سے روز بروز گرتی جا رہی ہے اور اس کی موسیقی میں بجائے لطافت کے خشونت بڑھتی جا رہی ہے۔

(۴)

کالج کے سالانہ جلسہ کا زمانہ آگیا، جب رجنا کو لکچر دینا تھا اور عملاً سب کے ساتھ اپنے فن کی نمائش کرنا تھی۔ بڑے بڑے نائک جمع ہونے والے تھے۔ ولایت کے بھی بعض بڑے کاملین فن آنے والے تھے اور تمام مشہور اخباروں کے نمایندے بھی شریک ہو رہے تھے۔ لاسلکی کی مدد سے ہندوستان کے ہر بڑے شہر اور لندن و امریکہ تک اس جلسہ کی موسیقی پہونچانے کا اہتمام ہوا تھا۔ اور ہر شخص اپنی انتہائی کوشش صرف کر رہا تھا کہ اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا اس کے سر رہے۔ ملہر راؤ بھی روزانہ خلوت میں اپنی ان راگنیوں کی مشق کر رہا تھا جن کا علم صرف اسی کو تھا یا ٹھاکر راجکمار کو۔ رجنا کو بھی یہ خبر معلوم ہو چکی تھی کہ ملہر راؤ نے ان راگنیوں کی تعلیم راجکمار کو دی ہے اور وہ نہایت مستعدی سے ان کی مشق کر رہا ہے اور بت بنا ہوا تھا لیکن اسکی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، کیونکہ راجکمار کے مقابلہ میں گانے کی ہمت اس نہ تھی اور جتنی کوشش ترقی کی وہ کرتی تھی، اسی قدر وہ گرتی جاتی تھی، کیونکہ اس کی ہر کوشش جذبۂ حقارت پر مبنی ہوتی تھی جس کا اثر نہایت مخفی طور پر اس کے موسیقی میں سرایت کر کے اس کی لطافت و تازگی کو برباد کرتا جا رہا تھا۔ راجکمار کو اس کا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ کیا ہو گیا ہے اور رجنا کیا ہوتی جا رہی ہے۔

تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے، مہمان کرا کے اپنی اپنی فرودگاہوں پر مقیم ہو گئے تھے۔ اور سارے شہر میں دوسرے دن صبح جلسہ کے آغاز کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا، راجکمار اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا خاموش کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کا ایک عزیز دوست نسیم آگیا اور اس نے آتے ہی کہا کہ ”راجکمار! مجھے کتنی مسرت ہے اس خیال سے کہ کل ساری دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ اس وقت سب سے بڑا ماہر موسیقی کون ہے اور کامیابی و فتحمندی کا ہار تمھارے گلے میں ڈالا جائیگا“

راجکمار نے سنکر آہستگی سے گردن اٹھائی اور بولا ”نسیم، یہ کیا کہتے ہو، مجھے بھلا کیا آتا ہے، کیوں بناتے ہو؟“

نسیم: بنانے کی بات نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف خود آج بھرے جلسہ میں تمہارے پرنسپل ملہر راؤ نے کیا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ رجنا بائی سے زیادہ اس کا مستحق کوئی نہیں ہے لیکن اب یہ بات سب پر روشن ہو گئی ہے کہ قدرت نے یہ فخر تمہارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ اس کا سبب تمہاری غیر معمولی ترقی ہے یا رجنا بائی کا انحطاط، بہرحال جو وجہ بھی ہو، پانسہ بالکل پلٹ گیا ہے اور ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ رجنا بائی اسی لئے تم سے برہم ہیں“

—— نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ نہایت بلند فطرت خاتون ہیں اور ان کی طرف سے ایسا خیال قائم کرنا انکی عظمت و شرافت کی توہین ہے۔ علی الخصوص اس حالت میں جب کہ واقعی وہ مجھ سے کہیں زیادہ دلکش مہارت رکھتی ہیں“

—— خیر کل کا دن دور نہیں ہے، سبھی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تم سے زیادہ ماہر ہیں یا تم ان سے، لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ رجنا بائی کے لئے یہ دن نہایت سخت آیا ہے اور ان کی غیر معمولی پریشانیاں اب ان کی صبر و ضبط سے باہر ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں وہ نتیجہ کے اعلان کے بعد خودکشی نہ کریں“

سلیم تو یہ کہکر چلا گیا، لیکن ادہر راحکمار جس عالم میں پہونچگیا، اس کا علم دنیا میں سوائے اس کے اور کسی کو نہ ہو سکتا تھا وہ گھنٹوں سرنگوں بیٹھا ہوا سوچا کیا اور اس کے بعد دیر تک مضطربانہ انداز سے ٹہلتا رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کی فراوانی نے اس کے حواس سلب کر لئے تھے اور وہ کسی ایسے نتیجہ پر پہونچگیا تھا جو اس کی زندگی میں انقلاب تام پیدا کرنے والا ہے۔

اس نے شام کے قریب بکس کھولکر اپنی ڈائری نکالی اور دیر تک کچھ لکھتا رہا پھر اس کو میز پر رکھکر ایک ایسے عزم کے ساتھ جس میں ایک پہاڑ کا سا ثبات پایا جاتا تھا، وہ اُٹھا اور بازار کی طرف جاکر تھوڑی دیر میں واپس آیا اور دروازہ بند کر لیا

(باقی) نیازؔ

نادرات

عورت کی ایک ٹھنڈی سانس مرد کے تمام دلائل باطل کر دینے کیلئے کافی ہے

بہت سی باتیں دیوانوں کے منہ سے بھی کیسی صحیح نکل جاتی ہیں

شجاع زندگی میں ایک مرتبہ مرتا ہے۔ اور بزدل روزانہ کئی مرتبہ مرتا ہے

آنکھوں کے آنسو رنج وملال کی دلیل نہیں

ایک امیر نے اپنے بیٹے کے اتالیق سے کہا کہ "لکھنے سے پہلے اُسے تیرنا سکھاؤ کیونکہ ایسے لوگ تو بہت مل جائیں گے جو اس کے بجائے لکھ سکیں، لیکن اس کے عوض میں تیرنے والا کوئی نہ ملیگا۔

جو شخص تمہیں حیثیت سے زیادہ بلند کرنا چاہے، اس سے احتراز کرو

حُسن انسانی میں تہذیب سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں

نظام حکومت، قوم کی روح کے مطابق ہونا چاہئے

اگر تمہارا سینہ تمہارے ساتھی کے لئے تنگ ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرے کا سینہ اس سے زیادہ تنگ ہوگا۔

مبارک ہے وہ شخص جس کی بصارت کا تعلق قلب سے ہے اور افسوس ہے اسپر جس کا قلب بصارت سے وابستہ ہے،

اگر گفتگوئے محبت کرنا ہے تو فرانسیسی زبان میں کرو۔ اگر فلسفہ پر گفتگو کرنا ہے تو عربی زبان اختیار کرو۔ اگر شجاعت کا ذکر ہے تو ترکی زبان استعمال کرو۔

کمتر ایسا ہوتا ہے کہ لبوں پر تبسم ہو اور دل ضبط گریہ سے فارغ۔

عورت کا دل عنبر کی طرح ہے کہ جب تک اس میں جلن پیدا نہیں ہوتی خوشبو نہیں پھیلتی۔

اچھی تعلیم معجز دل کی محتاج نہیں ہوتی۔

پنکھے سے کہر کو دور نہیں کر سکتے۔

جس کی تمام آرزوئیں منقطع ہو جاتی ہیں اس کی آرزو موت ہوتی ہے

مجھ سے بتاؤ کہ تمہارے دوست کون ہیں اور میں بتادونگا کہ تم کیا ہو

عورتیں پہاڑ کی طرح ہیں کہ دور ہی سے زیادہ حسین نظر آتی ہیں

مرد ہنستا ہے دل سے اور عورت صرف چہرہ سے

معاشیات ہند پر جغرافیہ کا اثر

یوں تو ہر ملک اور ہر جگہ کی معاشی حالت پر اس ملک کی جغرافیہ کا گہرا اثر پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی معاشیات پر یہاں کے جغرافیہ کا جتنا اثر ہوتا ہے اتنا کسی اور جگہ شاید ہی ہوتا ہو۔ ہندوستان کے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سلسلہ ڈیڑھ ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں بحر عرب ہے۔ مشرق میں خلیج بنگال اور جنوب میں بحر ہند۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر مشرق اور مغرب میں دو زبردست پہاڑی سلسلے ہیں جو مشرقی و مغربی گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور وسط ہند کا پہاڑی سلسلہ وندھیاچل کہلاتا ہے۔ اس جغرافیائی تخصیص سے ہم سرزمین ہند کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا حصہ کوہ ہمالیہ اور اس کا دامن۔ دوسرا شمالی ہند کا میدان۔ تیسرا دکن کی سطح مرتفع اور چوتھا ساحلی میدان۔

ہمالیہ کے فوائد

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ یہاں کی پیدائش دولت پر اس کی جغرافیائی خصوصیات کا کیا اثر پڑتا ہے سب سے پہلے کوہ ہمالیہ کو لیجئے اس سے ہندوستان کو بیشمار فوائد پہونچ رہے ہیں اس کے احسانات ہندوستان پر اس قدر ہیں کہ ان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جو کچھ پہاڑی سلسلہ یعنی ہمالیہ بہت بلند ہے اس لئے بحر عرب سے جو شمال مشرقی کی موسمی ہوائیں اٹھ اٹھ کر جاتی ہیں وہ اس پہاڑ کی بلندی کی وجہ سے آگے نہیں جا سکتیں اور ٹکرا کر سب یہیں برس جاتی ہیں۔ تبت کی طرف سے جو گرم اور ہلاک ہوائیں چلتی ہیں ان سے ہندوستان صرف اسی پہاڑ کی بدولت محفوظ رہتا ہے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے دریا مثلاً گنگا۔ برہمپتر اور سندھ اسی پہاڑ سے نکلتے ہیں جو تمام شمالی ہند کو سیراب کرتے ہیں اور جن کی بدولت شمالی ہند اس قدر آباد دکھائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے شہر انہیں دریاؤں کے کنارے آباد کئے جاتے تھے جن میں آمد و رفت بہ آسانی ہو سکے اور یہ صنعت ہندوستان کے دریاؤں میں موجود ہے ان دریاؤں کا ڈھال نہایت مناسب ہے جس کی وجہ سے پانی آہستگی سے بہتا ہے اس لئے ان میں کشتی اور چھوٹے جہاز بآسانی چلائے جاتے ہیں۔ ریلوے کی ایجاد سے قبل تجارت کا بہت کچھ دارومدار ان ہی دریاؤں پر تھا گو اس ایجاد سے اس میں کمی واقع ہو گئی ہے پھر بھی ابھی تک ان سے آمد و رفت اور باربرداری کا کام کیا جاتا ہے گو عام طور سے ان دریاؤں کا ڈھال معمولی ہے لیکن منبع کے قریب یہ بہت زبردست ہے جس کی وجہ سے یہ اپنے ساتھ پتھر کو کاٹ کر مٹی بہا لاتے اور زمین میں اضافہ کرتے ہیں۔

یہ مٹی زراعت کے لئے بہت موزوں اور زرخیز ہوتی ہے شمالی ہند کا ایک بڑا حصہ اسی قسم کی مٹی اور پتھر سے بنا ہوا ہے یہ دریا آبپاشی کے بڑے ذرایع ہیں ان سے زراعت کو بہت کچھ ترقی ہوئی اور ہو سکتی ہے پنجاب میں دریائے سندھ اور اس کی باجگزار ندیوں سے نہر کاٹ کاٹ کر لاکھوں ایکڑ زمین سیراب کی جاتی ہے جس سے ملک کی دولت میں بیحد اضافہ ہوتا ہے اگر پنجاب سے دریائے سندھ نہ گزرتا تو وہ خطہ ویران ہوتا کیونکہ وہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اگر یہ دریا بھی نہ ہوتا

تو ذریعہ آبپاشی مسدود ہو جاتا۔ اگرچہ اکثر جگہ کے دریاؤں میں گرمیوں کے موسم میں پانی بہت کم ہو جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف ہندوستان
کے دریاؤں میں پانی بڑھ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات طغیانی آجاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی
ہیں اور جب گرمی میں برف پگھلتی ہے تو سب کی سب بہہ کر ان دریاؤں میں آجاتی ہے جس سے پانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی
ہمالیہ کے آبشاروں اور دریاؤں سے جس قدر کثیر مقدار میں برق پیدا کی جاسکتی ہے اس کے متعلق میں ایک قبل کے مضمون
"کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے" میں لکھ چکا ہوں لہذا یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہمالیہ کے
بعض پر فضا مقامات مثل شملہ نینی تال اور دارجلنگ بے حد فرحت افزا ہیں۔ جس طرح اٹلی کے خوشنما مناظر وہاں کی ایک
بڑی دولت ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے یہ پہاڑی مقامات بھی ملک کی دولت ہیں

صرف یہ نہیں کہ ہمالیہ کے دامن میں اس قدر گھنے اور زبردست جنگل ہیں کہ انہیں ہر قسم کی عمدہ سے عمدہ چوبینہ پیدا ہوتی ہے جن سے
اعلیٰ درجے کا فرنیچر تیار ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ اس کی لکڑیاں عمارات بنانے میں بے حد کام آتی ہیں۔ ان سے ریل کے ڈبے اور
سلیپر بھی تیار کئے جاتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اس کے دامن میں بعض زمینیں ایسی ہیں جنہیں نہایت قیمتی زرعی پیداوار اور مثل
چاء و کافی کی کاشت کی جاتی ہے۔ ان کو ہم ملکی دولت کے اضافہ کا باعث نہیں تو اور کیا کہیں؟ غرض یہ فوائد ہمالیہ ہی کی مہربانیوں
کا نتیجہ ہیں اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو ہندوستان اس تمام دولت سے جو صرف اس کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہے محروم رہتا اور ہمالیہ کا
جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہمالیہ جہاں قدرتی طور پر ملک کی فصیل کا کام دیتا ہے اور اس کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا ہے وہیں اس میں چند
درے جو راستے کا کام دیتے ہیں نظر آتے ہیں یعنی ہمالیہ کوئی ایسا سد سکندری نہیں کہ اگر کوئی یہاں آنا یا یہاں سے جانا
چاہے تو آجا ہی نہ سکے۔ اگر ایسا ہوتا یہ نقصان کا باعث ہوتا۔ گو بادی النظر میں ایسا معلوم ہوگا کہ اگر اس میں یہ چند درے بھی
نہ ہوتے تو ہندوستان بہت زیادہ محفوظ ہو جاتا اور ہندوستان پر اب تک جو حملے افغانستان کی طرف سے ہوئے وہ بھی نہ ہوتے
ہم اس کو مانتے ہیں کہ اگر درے نہ ہوتے تو یہ حملے نہ ہوتے لیکن ملک کی ترقی اور اس کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تعلقات
دوسرے ممالک سے قائم ہوں اگر کوئی ملک دنیا کے تمام دیگر ممالک سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کو کسی سے کسی قسم کا
تعلق نہ ہو تو اس کی ترقی جس قدر محدود ہوگی اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی حالت سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا
اس لئے اگر ہمالیہ میں درے نہ ہوتے تو اس کا تعلق بڑی حد تک دوسرے ممالک سے منقطع ہو جاتا اور ایسی صورت میں اس کو جو نقصان
ہوتا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا جو بیرونی حملوں کی وجہ سے ہندوستان کو برداشت کرنا پڑا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ درے
ہندوستان کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئے اور یہ ہمالیہ کا بڑا وصف ہے کہ باوجود محافظ ہونے کے اس میں چند راستے بھی
ہیں جن سے ہندوستان اور دیگر ممالک سے رابطہ قائم رہ سکتا ہے۔ اس پہاڑ کا ایک اثر اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی اس کی
وجہ سے شمالی حصہ میں بارش کثرت سے ہوتی ہے متعدد دریا اس سے نکلتے ہیں جس سے اس کی سرسبزی میں اضافہ ہوتا ہے

لہذا پہاڑ کی حفاظت ۔ زمین کی زرخیزی ۔ دریاؤں کی روانی یہ سب ملکر زمین کو زرخیز کریں گی اس زرخیزی کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ کاشتکاری کی طرف راغب ہوں گے اور آبادی زراعت پیشہ ہوگی ۔ زراعتی پیشہ کا اثر یہ ہوگا کہ یہاں کے لوگ امن پسند ہوں گے وہ کوئی ایسا خلل گوارہ نہیں کر سکتے جس سے ان کی زمین ان سے علیحدہ ہو ۔ پس جنگ وجدال سے وہ بالطبع متنفر ہوں گے ۔ ان تینوں باتوں کے یکجا ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں دولت زیادہ ہوگی ۔ زراعت اور تمول ملکر شمالی ہند والوں کو امن پسند بنا دیں گے کیونکہ بدامنی اور جنگ سے بھاگنے والے طبقہ زراعت پیشہ اور متمول لوگوں ہی کا ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ شمالی ہند کی یہ تمام خصوصیات اس کی جغرافیائی اثرات کی وجہ سے ہوئیں جس سے ملک کی معاشی حالت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی ۔

شمالی میدان

اب ہندوستان کے دوسرے حصے شمالی ہند کے میدان کو لیجئے یہ جس قدر زرخیز و آباد ہے اتنا ہندوستان کا کوئی دوسرا حصہ نہیں ۔ ہندوستان کی کل زرعی پیداوار کا بڑا حصہ یہیں سے وصول ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ بارش کثرت سے ہوتی ہے جتنے ذرائع آبپاشی یہاں ہیں اتنے کسی دوسرے حصے میں نہیں اس کے علاوہ یہاں کے دریا گاہے گاہے اپنی زرخیز مٹی وہاں کے میدانوں میں پھیلاتے رہتے ہیں ۔ اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو اس کو یہ فوائد کہاں سے نصیب ہوتے اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر اس کے گرد اس قدر عمدہ جغرافیائی حالات نہ ہوتے تو اس کو یہ سرسبزی و شادابی نصیب نہ ہوتی ۔

دکن کی سطح مرتفع

یہاں نہ بارش کی کثرت ہے اور نہ وہ سرسبزی و شادابی ۔ اس کے دونوں طرف کے مشرقی و مغربی گھاٹ اس کو اپنے حصے سے محروم رکھتے ہیں جب بحر عرب سے شمال مشرقی موسمی ہوائیں اٹھکر دکن کی طرف آنا چاہتی ہیں تو مغربی گھاٹ ان کو ادہر آنے سے باز رکھتی ہے اور یہ بکہ ہائے ابر دکن آنے کی بے سود کوشش میں ان پہاڑوں سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر وہیں برس پڑتے ہیں اگر درمیان میں یہ دیوار سنگی حائل نہ ہوتی تو دکن بھی بہت کچھ سرسبز و شاداب ہوتا ۔ دکن میں جو دریا بہتے ہیں ان کا دہارا اس قدر تیز ہے کہ اس میں بند باندھنا یا نہریں کاٹنا ایک دقت طلب امر ہے ۔ دکن کو جو تھوڑی بارش میسر ہوتی ہے وہ شمال مغربی موسمی ہواؤں کا (جو خلیج بنگال سے اٹھتی ہیں) نتیجہ ہیں وجہ یہ ہے کہ مشرقی گھاٹ بعض بعض جگہ بہت پست ہیں جنکی وجہ سے کچھ ابر کے ٹکڑے ادہر بھی چلے آتے ہیں ۔ دکن میں بارش کی کمی کا باعث یہی گھاٹ ہیں اور اسوجہ سے یہاں کی زرخیزی میں بھی کمی واقع ہوگئی ہے ۔

ساحلی میدان

یہ میدان بعض بعض جگہ تین سو سے چار سو میل تک چوڑے ہیں اور بعض جگہ تنگ ہوکر صرف تیس چالیس میل رہگئے ہیں ۔ ان میدانوں میں بارش کی کثرت رہتی ہے (اور یہ مشرقی و مغربی گھاٹوں کا نتیجہ ہے) جس سے یہ بہت کچھ سرسبز و شاداب ہیں ۔

موسم اور آب وہوا

پیدائش دولت کے لئے معاشی جدوجہد ایک لازمی امر ہے اور معاشی جدوجہد کے لئے عمدہ کارکردگی کا ہونا ضروری لیکن عمدہ کارکردگی قائم رہنے اور کارکردگی بڑہانے کے لئے چند چیزوں کا ہونا لازمی ہے جنمیں

سب سے مقدم آب وہوا اور موسم کا اثر ہے انتہا درجے کی گرم و سرد آب وہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی پر مضر اثر ڈالتا ہے جس جگہ شدت کی گرمی پڑتی ہے وہاں سخت جسمانی محنت دیر تک نہیں ہو سکتی اور قدرتاً ایسی جگہ زیادہ محنت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی کیونکہ نباتی پیداوار ایسی جگہ کثرت سے ہوتی ہے۔ ایسے ممالک کی زندگی نہایت سیدھی سادی ہوتی ہے۔ نہ ان کو زیادہ اور گرم کپڑوں کی ضرورت نہ اعلیٰ اور مضبوط مکان کی حاجت۔ پہننے کو مختصر کپڑا اور رہنے کو معمولی جھونپڑا کافی ہوتا ہے اسی طرح جہاں سردی اور برف باری شدت کی ہوتی ہے وہاں نہ محنت کا کافی موقع ملتا ہے اور نہ زمین سے خاطر خواہ پیداوار ہی حاصل ہو سکتی ہے مثلاً لیپ لینڈ (Lap Land) اور فائین لینڈ (Fin Land) کہ مہینوں وہاں سورج کی شکل تک دکھائی نہیں دیتی اور کثرت برف باری سے سوائے برف کے میدانوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں کے باشندے ہفتوں اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتے۔ ان کی غذا چربی۔ جانوروں کا گوشت اور مچھلی ہوتی ہے۔ ایسی صورتوں میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان مقامات میں زراعت یا صنعت و حرفت کو ترقی ہو سکے۔

موسم کا جلد جلد تبدیل ہونا بھی کارکردگی کے لئے مضر ہے، ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں، کبھی بلا کی گرمی کبھی کڑاکے کی سردی اور کبھی موسلا دھار بارش غرض طبیعت کچھ نہ کچھ ناساز ضرور رہتی ہے بارش کے موسم میں عموماً ہیضہ اور سردیوں میں ملیریا اکثر مقامات پر پھیل جاتا ہے۔ آب وہوا کی خرابی سے صحت اچھی نہیں رہتی صحت کی خرابی سے پوری محنت نہیں ہو سکتی اور محنت کی کمی سے کارکردگی پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف منطقہ معتدل میں آب وہوا کی عمدگی اور موسم کی یکرنگی سے یہ تمام خرابیاں جو اوپر بیان ہوئیں پیدا نہیں ہوتیں کافی محنت کا موقع ملتا ہے اور طبیعت بھی نہیں تھکتی۔ زراعت اور صنعت و حرفت دونوں کی ترقی کے لئے منطقہ معتدل نہایت مناسب ہے

آب وہوا اور موسم کا اثر قریب قریب تمام ضروریات زندگی پر پڑتا ہے اسمیں سب سے اول خوراک ہے جس جگہ کی جیسی آب وہوا ہوگی اسی مناسبت سے وہاں کی پیداوار ہوگی۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ کوئی پیداوار جو کسی خاص جگہ کے لئے مخصوص ہو اسی عمدگی سے دوسری جگہ پیدا کریں تو یہ ناممکن ہے کیونکہ اس چیز کیساتھ ہم وہاں کی آب وہوا منتقل نہیں کر سکتے مثلاً سیلون اور کشمیر کی چائے ساری دنیا میں مشہور ہے اور ہر متمدن ملک کو اس کی ضرورت۔ اگر جگہ اور آب وہوا کی تخصیص نہ ہوتی تو ہر ملک اپنے یہاں بطور خود پیدا کر کے دوسروں کا محتاج نہ ہوتا اسیطرح بنگال کا جوٹ ہو کہ سوائے ہندوستان اور ہندوستان میں بھی بنگال یا تھوڑا بہت امریکہ کے کسی دوسری جگہ پیدا نہیں ہوتا اور ضرورت ساری دنیا کو ہے اسیطرح اور دوسری چیزیں بھی ہیں جیسے برار کی روئی کشمیر کے بھیڑوں کی اون حیدرآباد کے چاول کسی دوسری جگہ اتنے اعلیٰ پیدا نہیں ہوتے غرض یہ کہ پیداوار آب وہوا کے تابع ہے اور صحت و قوت کا دارومدار خاص طور سے خوراک پر ہے پس آب وہوا بذریعہ خوراک کارکردگی اور پیدائش دولت پر بڑا اثر ڈالتی ہے اور کسی جگہ کی آب وہوا کا تعلق وہاں کی جغرافیہ سے ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں کی جغرافیائی حالات کا معاشیات ہند پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

ابو المنصور حمید

حضرت شیخ محمود چشتی رحمۃ اللہ علیہ

محمود نام، راجن عرف عام، والد کا نام علم الدین تھا۔ مرز بوم پیران پاک پٹن ہے والدہ چھوٹا سا چھوڑ مری تھیں، والد کے آغوش میں پلکر جوان ہوئے

اخلاق و عادات بہت پسندیدہ رکھتے تھے، خاموشی اور مختصر گوئی کے بچپن سے خوگر تھے، نظرتاً صلح جو اور امن پسند تھے بچوں کی طرح شرارت و فساد آپ کی عادت نہ تھی۔ اخبار الاولیا کا بیان ہے کہ بچپن میں کبھی کسی سے نہیں لڑے لوگ کہتے تھے کہ یہ بچہ بوڑھوں کا بھی بوڑھا ہے۔

ریاضت و مجاہدہ گویا گھٹی میں پڑا تھا۔ رات دن یہی شغل تھا، سب باتوں سے نفرت تھی مگر اس میں دل لگتا تھا۔ لکھنے پڑھنے سے بہت بیزار رہتے تھے۔ کہتے تھے مجھے درود و صلوٰت اور دعا و مناجات میں جو چین ملتا ہے کسی دوسری چیز میں نہیں ملتا۔

والد یہ باتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، اور فخر کرتے کہ خدا نے ان کو صالح بیٹا دیا۔ انھوں نے آپ کو بالکل آزاد کر دیا تھا اور آپ کے اشغال سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے دیکھا کہ یہ تو پیار و محبت میں خراب ہوئے جا رہے ہیں، تعلیم کا زمانہ گزر رہا ہے، اور یہ علم سے بے خبر ہیں حالانکہ سلوک بغیر علم کے نہیں آتا۔ عادات و اطوار کا اچھا ہونا، درس سے خلاص، اعمال و معتقدات میں غلو و احترام، یہ سب باتیں بغیر علم غیر یقینی اور غیر مستحکم ہوتی ہیں۔ اس لئے آپ نے ان کو مختلف طریقوں سے علم کی طرف مائل کرنا چاہا، جہالت کے نقائص بتلائے، طالب سلوک کے لئے اس کا سم قاتل ہونا واضح کیا۔ مگر جمال حقیقت کا شیدائی ان باتوں میں نہ آیا، اس نے صاف انکار کر دیا اور قرآن و حدیث، تفسیر، فقہ کی طرف بھی توجہ نہ کی اور صاف صاف کہدیا کہ میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔ میں ان پشتاروں کو لاد کر کیا کروں؟ میری روح کی طمانیت تو صرف انہماک الٰہی میں ہے ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

آپ کو تحصیل علم پر زور دینا، حقیقت حال سے ناواقفیت کی دلیل تھی۔ آپ کی فراست و دانائی آپ کا علم و فضل، اور ہر معاملہ میں آپ کی واقفیت ہر ہر بات سے ظاہر ہوتی تھی، جوابات کہتے تھے نہایت گہری اور عالمانہ، اس کا سب کو اعتراف تھا۔ تاہم حضرت شیخ علم الدین کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، ان باتوں کو غیر یقینی سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے نہایت سختی سے توجہ دلائی کہا میں تمہیں بار بار ٹوکتا ہوں مگر تم اپنی باتوں سے باز نہیں آتے، تم راستہ بھول گئے ہو منزل کا پتہ نہیں جانتے، اور اندھوں کی طرح ادھر ادھر ٹٹولتے ہو اور وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں سب سے پہلے تحصیل علم ضروری ہے تمہیں اس کے لئے تیار ہونا چاہئے ورنہ تم دوسروں کے لئے مصیبت بن جاؤ گے، اور تمھیں اس صورت میں وہ نعمت بھی نہیں مل سکیگی۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

یہ سنکر آپ نے زبان کھولی، اور اپنی علم و دانش کے وہ جوہر دکھائے کہ والد انگشت بہ دنداں رہ گئے بولے: منزل سلوک میں ہر شخص کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کے لئے علم و فضل راہنما ہوتا ہے اور کسی کے لئے اس کی جہالت و شکستگی۔ کوئی عشق مجازی کے پروں پر اڑکر مقام حقیقی کی بام بلند تک پہنچتا ہے اور کوئی خانقاہ کی گوشہ نشینی سے کسی کے زخم دل کے لئے اس کی آہیں دوا ہوتی ہیں اور کسی کے لئے مرہم کا پھاہا رکھنے والی انگلیاں۔ علم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا یہ ایک خیال ہے جو حقیقت سے دور ہے۔ پرستاران حق و صدق پر جو احوال طاری ہوتے ہیں۔ دردمندان عشق کے دلوں میں جو ٹیسیں اٹھتی ہیں وہ علم و فضل کے حلقوم ہی سے نہیں نکلتیں۔ وہ صرف علماء و فضلا ہی کو نہیں پکارتیں۔ سیکڑوں بندگان خدا ہیں جو علم کے نام سے ایک لفظ بھی نہیں جانتے مگر بڑے بڑے عالم ان کے آگے عقیدت و ارادت کا سر جھکاتے ہیں جب آسمان سے نزول باراں ہوتا ہے۔ تو ہر خشک و تر کو سیراب کرتا ہے یہ کبھی نہیں سنا کہ اہل علم کی زمینیں تو سیراب ہوگئی ہوں، مگر جاہل کسانوں کی کھیتیاں جل گئی ہوں۔

تحصیل علم کا مقصد کیا ہے؟ معرفت الٰہی یا علم کی پرستش؟ اگر معرفت الٰہی ہے تو علم صرف ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ لہذا اگر کسی کو یہ مقصد بغیر اس ذریعہ کے حاصل ہو جائے تو اس کے لئے ضرورت نہیں کہ تحصیل علم میں اپنا وقت ضائع کرے کیونکہ وہ جس مقصد کے لئے علم حاصل کرتا، وہ مقصد اسے حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تحصیل علم کا مقصد علم ہی ہے تو میرا آپ کا اصولی اختلاف ہے۔ میں علم کو مقصد نہیں سمجھتا ذریعہ سمجھتا ہوں، اور آپ ذریعہ کو مقصد سمجھتے ہیں۔ پھر آپ جو مجھے پڑھنے کی طرف بلاتے ہیں تو کس لئے؟ جس شے کے لئے علم کی ضرورت تھی وہ مجھے مل گیا ہے، اور میں نے اس کو علم سے نہیں بلکہ اس کو اس سے پالیا ہے۔ "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ" رہی یہ بات کہ مجھے درس و ارشاد کی مسند آرائی کرنی چاہیے، اور اس کے لئے تحصیل علم ناگزیر ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ میں اپنے تئیں اس منصب کے قابل نہیں پاتا۔ آپ جانتے ہیں کہ انجمن آرائی سے مجھے ابتدا سے نفرت ہے، اور مولویت کی مسند سے مجھے عجب دریا کی بو آتی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت خواجہ نصیر الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ "یک جہل و نادانی نفس وارد بر ہزار کستے کہ آمیختہ با عجب دریا باشد" پس میں علم۔ یا ئی کی کچھ ایسی زیادہ ضرورت نہیں سمجھتا میرے خدا نے مجھے جس قدر پڑھا دیا ہے سلوک کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اور نہ مجھے اس کیلئے تشنگی و بیقراری ہے اصل طاقت عمل اور طلب صادق کی طاقت ہے باقی جو کچھ ہے بیکار ہے ؎

نمازی نہ بروپے بہ منزل مقصود   مگر طریق رہش از سر نیاز کنی

والد نے یہ گفتگو سنکر کہا۔ اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ اس راہ چل کر منزل تک پہنچ جاؤگے، اور ہر حال میں پابند شریعت رہوگے، تو میں تم کو تمہارے مسلک اور رجحان طبیعت پر چھوڑے دیتا ہوں، اور اگر تم اس امتحان میں پورے اترے تو تمہیں وہ امانت بھی دیدونگا جس کا تم اپنے تئیں مستحق بنالوگے آپ نے اس کا مختصر سا جواب دیتے ہوئے داخل طریقت ہونے کی درخواست کی، جسے انھوں نے منظور کر لیا، اور تھوڑے عرصہ میں جب انہیں آپ کی قابلیت کا تجربہ ہو گیا تو خرقۂ خلافت سے بھی

سرفراز کردیا۔ آپ کو مختلف شیوخ سے بیعت وارشاد کی اجازت تھی۔ شیخ احمد بن ادریس سے طریقہ شاذلیہ میں شاہ جلالی سے قادریہ میں، شیخ خازن سے سہروردیہ میں، شیخ احمد کھٹو، اور عزیز اللہ متوکل سے مغربیہ میں شجرۂ خلافت ملا تھا۔

۲۲ صفر تاریخ وفات ہے سال تحقیق نہیں آداب الطالبین میں ۹۴۰ھ لکھا ہے۔ اور گلزار ابرار میں ۹۰۸ھ۔

ناظر دہلوی

آیندہ جنوری سنہ ۲۹ء کا نگار

کم از کم دس جزو یعنی ۱۶۰ صفحہ کا ہوگا اور نگار کے اول سال اشاعت یعنی سنہ ۱۹۲۲ء کے تمام بہترین مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہوگا۔ نگار کی گزشتہ جلدیں مکمل اب نہیں مل سکتیں اور ملک میں انکی مانگ بہت ہے اس لئے اب سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ یہ انتخاب شائع ہوتا رہے سنہ ۲۲ء میں جو حضرات خریدار تھے، ان میں سے اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں اس لئے سنہ ۲۲ء کا انتخاب تمام موجودہ ناظرین کے لئے بالکل نئی چیز ہوگا۔ اس انتخاب میں جتنے مضامین علمی، ادبی، افسانے یا نظمیں ہونگی وہ سب نہایت بلند معیار کی ہوں گے اور ایسا ہونا چاہیے کیونکہ ایک ہزار صفحات سے ۱۶۰ صفحات کا انتخاب کیا جائیگا

دوسری رعایت

آج کی تاریخ سے لیکر ۳۰ دسمبر تک یہ ہوگی کہ نگار کے ہر سالانہ خریدار کو (بشرطیکہ وہ رعایتی خریدار نہیں ہیں) کتاب فراست الید (یعنی ہاتھ کی لکیریں دیکھ مستقبل پر حکم لگانا) جو زیر طبع ہے بجائے عہ کے ۸ میں دیجائے گی۔

اس لئے جو حضرات ابھی یا شروع سال (یعنی جنوری سنہ ۲۹ء) سے نگار کے خریدار ہونا چاہتے ہیں یا وہ تمام قدیم خریدار جنکا چندہ اب یا دسمبر میں ختم ہو رہا ہے اور وہ اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انکو چاہیے کہ اس کی اطلاع فوراً دیدیں تاکہ دی پی عہ کا روانہ کیا جائے۔ یا خود ذریعہ منی آرڈر عہ کا منی آرڈر روانہ فرمادیں "منیجر نگار لکھنو"

فلسفۂ حسن

حسن کا فلسفہ جس کی آج ہے موضوع بحث — اس کے ہر ہر جزو کو تنقید سے ہے دیکھنا

علم حیات و وجدانات و جذباتِ بشر — پورا سرمایہ ہے یہ فنِ جمالیات کا

کس طرح ہوتا ہے احساس جمالی کا ظہور — کونسی شے ہے جو ہو حسن مجسم برملا

کیا سبب اس کا کہ اک شے ایک کرتا ہے پسند — دوسرا کرتا ہے نفرت وہ بھی کیسی ناروا

کون سے ہیں ایک شے کے وہ نمایاں خط و خال — جن سے سمجھی جاتی ہے وہ شے نہایت خوشنما

صورت میں پنہاں ہے آخر کونسی وہ ساحری — جس سے ہو جاتی ہے جذب سامعہ دلکش صدا

اس طرح کے اور جتنے بھی کئے جائیں سوال — ان سبھوں کا ہے جمالیات سے رشتہ جڑا

ایسے استفسار پہ رد و قدح اور غور و خوض — [illegible] رہا کرتا ہے اپنا مشغلہ

فطرتِ خاموش کے لاکھوں مناظر بے بدل — سطوت و عظمت پہ جنکے قسم عالم ہے فدا

خوبصورت کوئی بت یا کوئی تصویر جمیل — کوئی شعر و نظم یا دلکش صدا کا سلسلہ

دیکھتے ہی سنتے ہی ان کے بشر کے قلب میں — خوشگوار احساس کا طوفان ہوتا ہے بپا

دل میں بھر جاتے ہیں جذبات مسرت ناگہاں — سازِ لب سے اٹھتا تحسین کا اک غلغلہ

یا خموشی اس پہ چھا جاتی ہے ایسے وقت میں — جبکہ ہو جاتا ہے ذہن تار سا بیدست و پا

لفظ تک اظہارِ کیفیات کے ملتے نہیں — جوش دل لفظوں میں اب ہو نہیں سکتا ادا

شکل، حرکت، رنگ اور نیز اس طرح کے ارتسام — دیکھنے یا سننے سے جن کا ہوا نشو و نما

اطلاع ان کی دیا کرتے ہیں ہر دم گوش و چشم — جس سے پیدا ہوتی ہے احساس لذت کی ہوا

یہ وہی ہے جس کو کہتے ہیں جمالی التذاذ — اس کا باعث حسن ہے جس میں نہیں چون و چرا

یہ وساطت سے حواس آدمی کے روز و شب — عقل و وجدان و تخیل کو ہے کرتا مبتلا

نفس میں پیدا کیا کرتا ہے جذبات نعیں — روح کو پہنچاتا ہے تا حدِ بام اعتلا

حیات، احساس اور لذات کی دلچسپ بحث — ہے یہی وہ روزن در جس سے یہ ہے جھانکتا

کچھ نواہائے شنیدہ کچھ بہار دیدہ سے — دونوں سے ملکر بنا ہے اس کا [illegible]

خوشگوار احساس کا اٹھتا ہے جب جوش طرب — اس کو کہتے ہیں یہ ہے سیلاب حسن خود نما

حسن کو سقراط ٹھہراتا ہے مانند مفید
اور فلاطوں کی نظر میں ہے یہ اس کا مرتبہ

جو تصور خیر برتر اور الوہیت کے ہیں
حسن ہے ایسے تصور کا مثیل و نمونا

حسن سے اشیائے عالم کل کے کل لبریز ہیں
یہ خیالات فلاطوں کا ہے مجمل تذکرہ

حال کے نقاد کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں
ہے یہ احساس و حواس آدمی کا شعبدہ

جو کسی شے کے تصور سے ہوا ہو ارتسام
اہل یورپ کرتے ہیں اپنی بحث سے ابتدا

پھر صفات و اعراض اشیا دیکھتے ہیں غور سے
تاکہ حاصل ہو جمالی کیفیت کا مدعا

حسن کی تخئیل سے پیدا ہیں وہ وہ لذتیں
مادی اغراض کا جن میں نہیں کچھ شائبہ

سب سے پہلے کانٹ نے اس امر کی تعیین کی
حسن کی لذت نہ ہو وابستۂ حرص و ہوا

اس کے احساس و شعور اولیں کے باب میں
ماہرین فن نے اہمیت سے کی بحث ابتدا

جتنے گہرے رنگ رجحانات کو ہوگئے پسند
سمجھا جائیگا تمدن کا ابھی ہے بچپنا

ہلکے رنگوں کی نفاست جتنی دلکو بھائے گی
اتنا ہی ہوگا تمدن کو عروج و اعتلا

حسن کے قصر بصیرت زا کی جانب از تمدن
ہر تمدن بڑھتا ہے پھینک کر کمند ارتقا

آبشاروں کی روانی چرخ آسا کوہسار
نیر تاباں کا چھپ چھپ کر نکلنا ڈوبنا

اور اجرام سماوی کے منور قمقمے
آج تک عالم بھی جنکی نہ گنتی کر سکا

ابر کی اودی سنہری نیلی پیلی ساریاں
جن کو پھیلاتی ہے بام چرخ پر باد صبا

وہ شفق کا پھولنا، وہ اسکی زریں آب و تاب
تو وہ غبرا ہو جس سے ماند سونے کا ڈلا

قلزم و عماں کی موجوں کا فلک فرسا خروش
دیکھنے سے ان مناظر کے ہے دل بیتاب سا

ان کی لامحدودیت مرعوب کرتی ہے ہمیں
سامنے آنکھوں کے آتی ہے جلالت کی فضا

اس تصور میں اسی حد پر ہے احساس الم
جس سے پہلے ہوتی ہے افسردہ کچھ طبع رسا

بعد اس کے خود ابھرتے ہیں وہ جذبات شریف
جس سے پھر بڑھتا ہے آگے ذوق دل کا حوصلہ

ایک ہی آواز یا صورت ہر اک پر اک طرح
کیوں اثر کرتی نہیں اسکی ہے آخر وجہ کیا

ساخت عصبی ریشوں کی ہر شخص میں یکساں نہیں
اختلاف عادت و تعلیم ہے اس کے سوا

ذہن کی بالیدگی میں بھی بہت پاتا ہے فرق
جنس و کم تفریق کرتی ہے طبائع کو جدا

اک تخیل ہی نہیں اس حسن کی زیر اثر
عقل تک پھیلا ہوا ہے اس اثر کا دائرہ

دلکشی آواز حرکت رنگ خط میں جو بھی ہو
یہ بہ امداد حواس اک فعل ہے ادراک کا

سامعہ کے باغ میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی　　ہر روش پر پھرتی ہے نطق و تکلم کی صبا
دلربا رنگیں تصویریں بصر کے ساتھ ساتھ　　سمع کے کاشانہ میں ضو ریز نغموں کی ضیا
دونوں کی پہنائیاں لبریز کیف حسن ہیں　　بستیاں احساس لذت کی ہیں ہر اک میں جدا
یہ الگ اشیائے عالم سے نظر آتا نہیں　　یہ دکھایا کرتا ہے رہکر انھی میں معجزہ
ریگ کے ذروں میں اجرام سماوی میں یہی　　جس جگہ جاؤ ملے گا اس کا قصر آراستہ
کہکشاں کی چادر پُرنور قرص ماہ و مہر　　التہاب برق اور بزم نجوم لامعہ
سنگ خارا کی ردائیں اور نباتی جامہ وار　　کسوت حیوان و انساں سب میں ہے یہ رونما
رنگ بیزی و نوا ریزی اسی کے ہیں محل　　مختلف لذت کی تصویریں ہیں جسمیں جابجا
باصرہ افسردہ بنگلوں میں گلوں کے ہے یہی　　سامعہ میں لحن کے آئینوں کی یہ ہے جلا
ساز کے پردوں میں خوابیدہ ترنم بھی یہیں　　جب ذرا مضراب نے چھیڑا اٹھا ہنستا ہوا
یا حجاب ساز اک محفل ہے ذوق گوش کی　　حسن کے نغموں کا رہتا ہے جہاں پر جمگھٹا
یا یہ پردے اسکے روئے دلربا کی ہیں نقاب　　جنکے اٹھتے ہی شکیب و ضبط ہوتے ہیں فنا
دہر کے خمخانۂ لذت کا ساقی ہے یہی　　جس نے پیمانوں کو احساسات کے یکسر بھرا
روح بالیدہ ہو جس سے یہ ہے وہ کیف نشاط　　گلکدے دل کے مہکجاتے ہیں یہ ہے وہ صبا
مادیت پست کر دیتی ہے جب ذوق طلب　　پھونکتا ہے آکے یہ انسان میں روح اعلا
اس سے جذبات مہذب جاگ اٹھتے ہیں تمام　　گلشن تہذیب اس سے پاتا ہے نشو و نما
مادیت سے نکلکر سیر کرنے کے لئے　　جادۂ ادراک پر لاتا ہے بنکر رہنما
چشم باطن کو دکھا دیتا ہے ایسا جلوہ زار　　جس کا لیکا ذوق تشنہ سے نہیں پھر چھوٹتا
حسن مطلق کا یہ ایک پرتو ہے جو عالم میں ہے　　سایہ پھر سایہ ہے جسکو اصل سے نسبت ہے کیا
یہ مفید حسن مطلق کی دلیل راہ ہے　　اس سے ملتا ہے ہمیں روحانیت کا راستہ
وہ کشادہ راہ جس جا شش جہت کل اک قدم　　وہ بلندی جس جگہ ہفت آسمان تحت الثریٰ
ہر طرف پھیلی ہوئی ذوق طلب کی تیز دھوپ　　دور تک کوئی نشان رہ نہ منزل کا پتا
اور اس سے آگے گلزار تحیر کی مہک　　جس سے بیخود ہو کے رہجاتا ہے ادراک رسا
رنگ و بوئے گیتی کے ہیں سرمایہ دار التذاذ　　اس جگہ دونوں کے دونوں بے حقیقت بینوا
گل نوا ریزی تصدق لذت آورد سکوت　　گل تبسم ہیچ و نا کارہ شگفتہ وہ فضا

کیف وکم کی اس جگہ میزاں نہیں منت پذیر　　قید وبندش کا وہاں ادنیٰ نہیں کچھ واسطہ
نور عالم کل کا کل اس جا پہ اک داغ سپید　　اور وجود عالم کا اس جا ایسا جیسے نقشِ پا
مادیت تاب لاسکتی نہیں جس دید کی　　اس طرح کا حُسنِ مطلق ہر طرف پھیلا ہوا
لامکاں کے کوشکِ تقدیس میں اک عشوہ ریز　　سامنے رکھے ہے اپنی منزلت کا آئینہ
دیکھتا ہے آپ ہی اپنا جمالِ بےمثال　　غیر ذاتی اپنی سج دھج کا ہے خود ہی مبتلا

بے جھجک آگے بڑھے جاتے ہو کیں ٹھہرو سرورؔ
کیا نہیں معلوم تم کو راستہ ہے کونسا

سید ابوالقاسم سرور لکھنوی

ترانۂ دل

۱

نغمۂ جاں نوازِ ہستی ہوں　　روحِ مضرابِ سازِ ہستی ہوں
میں ہوں کون ومکاں کا آئینہ　　یعنی آگاہِ رازِ ہستی ہوں

۲

گرچہ میں نونیازِ ہستی ہوں　　وقفِ آغوشِ نازِ ہستی ہوں
کیا کہوں؟ قلزمِ ابد میرا ہیں　　ناخدائے جہازِ ہستی ہوں

۳

وجہِ ہستی ہوں۔ نازِ ہستی ہوں　　تمغۂ امتیازِ ہستی ہوں
جنکی آنکھیں ہیں انکی نظر نہیں　　میں سراپا جوازِ ہستی ہوں

۴

پیکرِ سوز وسازِ ہستی ہوں　　مئے مینا گدازِ ہستی ہوں
اے امیں! رو شناس ہو میرا　　میں ہی لاریب رازِ ہستی ہوں

امین حزیں

اُن سے!

دلِ غمدیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی! چشمِ محزوں میں لہو رونے کی ہمت نہ رہی!
مرنے کے دن نہیں اور جینے کی حسرت نہ رہی رحم کر، رحم! کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی!

دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے!
تیرے قرباں! ترا عشق نہ رسوا ہو جائے!

کیا غضب ہے کہ غمِ ہجر سنا بھی نہ سکیں سینے کا زخم دکھائیں تو دکھا بھی نہ سکیں!
صبر ہو بھی نہ سکے رنج اٹھا بھی نہ سکیں آپ جا بھی نہ سکیں، تم کو بلا بھی نہ سکیں!

اشک پروردہ ہیں، غمدیدہ ہیں، مہجور ہیں ہم!
او "پری"! پاس بلا لے کہ بہت دور ہیں ہم!

عشق نے ظلم وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے یاس نے گل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے!
درد و دکھ، دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے ہم نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے!

غمِ دل کون سنے؟ ان کی بلا بھی نہ سنے!
اور نصیبوں کو یہ ضد ہے کہ خدا بھی نہ سنے!

جانتا ہوں کہ تمہیں بھی ہے محبت مجھ سے! گر یہ سچ ہے تو سنو! ایک شکایت مجھ سے!
پہلے تو رکھتی تھیں تم خط و کتابت مجھ سے! کہتی سنتی تھیں، ہم قصۂ الفت مجھ سے!

"پھول" کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے!
دیکھکر جن کو کنول، روح کے کھل جاتے تھے!

اب، مگر مدتیں گزریں کہ وہ حالت نہ رہی! وہ نوازش، وہ مروت وہ عنایت نہ رہی!
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبت نہ رہی! ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی!

تم ہو، اب، اور مدارت ہے بیگانوں کی!
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی!!

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر! اجنبیت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر

آخر، اس طرزِ تخاطب سے ہے کیا مدنظر؟ — نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبت کا اثر!

کیا یہ مطلب ہے کہ میں لائقِ الفت نہ رہا؟

دل مرا درخورِ غمہائے محبت نہ رہا؟

مرحمت دل پہ بہ ظلم و ستم ایجاد نہ کر! — میری امیدوں کی فردوس کو برباد نہ کر!

اے سپہر الفتی ہاں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کر! — بن کے "انجان" مگر مائلِ فریاد نہ کر!

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا جاتا ہے!

عشقِ پردہ نشیں، بے پردہ ہوا جاتا ہے!

پھر نہ کہنا کہ محبت کر دیا بدنام ہمیں! — "پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں"!

یا یہ کہنا کہ "نہیں آتے یہ کچھ کام ہمیں"! — "آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں"!

دیکھ لینا! یہ بہانے نہیں کام آئیں گے!

تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے!

قتل کرکے ہمیں پچھتاؤ گی تم یاد رہے! — اپنے اس ظلم پہ شرماؤ گی تم یاد رہے!

اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم یاد رہے! — حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم یاد رہے!

رفتم از دستِ تو اے غارتِ دیماں رفتم!!

ہوا ایم نہ شتابی کہ ستا اِں رفتم!!!

اختر شیرانی

مدیرِ نگار سے

بارک اللہ! اے عزیزا! اے رہبرِ راہِ سلوک — راستے پیری کے بتلائے تو نے سب کو سلوک

اے تخیل پرور اے نقادِ فن اے نکتہ بیں — تیرے خیالی دیوتا بھی ہیں جبیں باریک بیں

راس مجھ کو آگئیں تیرے سخن کی گرمیاں — [illegible] آتا ہے سے اور پیام ہر دل کا ہوا

آئینہ جو مجھکو دکھلایا صداقت نے تری — [illegible] حقیقت دیکھ لی

ہے مگر میرے سوا ہر شخص کیوں شاکی ترا — تجھکو دشمن کہتے ہیں میرے عزیز و اقربا

تیرا سخن کر دل میں چبھ جاتا ہے تیرا ہر سخن — خوش نظر آتی نہیں ہے تجھ سی کوئی انجمن

لوگ کہتے ہیں تری باتوں کو دیوانے کی بڑ — تیری اک اک چھیڑ کو سب کہتے ہیں فتنہ کی جڑ

سب کو راس آتی نہیں تیرے سخن کی گرمیاں — پھونک دیتی ہیں ترے الفاظ کی چنگاریاں

شور و غوغا سے ترے ناخوش ہیں اہلِ جہاں — تیری ہر آواز پہ اٹھتا ہے شورِ الاماں

میں سمجھتا ہوں مگر تجھ کو حقیقت آشنا — یعنی چشمِ دہر کو فطرت کا آئینہ نما

ابو تراب ماہر انصاری

بصائر

دیو جانس کو یہ عادت پڑی تھی — کہ پھرتا شہر کی گلیوں میں اکثر
کسی نے ایکدن اس سے یہ پوچھا — کہ اے عاقل حکیم نکتہ پرور
کہیں کیا کوئی تیرا گھر نہیں ہے — کہ لے آرام جاکر اس میں دم بھر
کہا گھر کی اگر تعریف یہ ہے — کہ لوگ آرام پائیں اسمیں رہ کر
تو پھر میں بھی جہاں آرام پاؤں — اسیکو فرض کر لیجئے مرا گھر

ایک مُسرف سے دیو جانس کلبی نے کہا — کہ مجھے آپ یہ عطا کیجئے من بھر چاندی
سنکے مُسرف نے کہا اس سے کہ اے مرد فقیر — تنگ سمجھ میں نہیں آتی ترے فرمائش کی
ایک پیسہ کا جب اوروں سے تو کرتا ہی سوال — مجھ سے کس واسطے چاندی کی طلب ہے اتنی
بولا اسواسطے کرتا ہوں میں تجھ سے یہ سوال — دیکھتا ہوں کہ تنزل پہ ہے دولت تیری
اور لوگوں سے تو ملتا ہی رہیگا پیسا — تجھ سے لیکن نہ ملے گی کبھی پھر اک کوڑی

جلسہ کیا تھا کوئی فلاطوں نے ایک دن — مدعو تھے جسمیں شہر کے سب صاحب کمال
آیا جو بزم میں دیو جانس تو اس طرح — کیچڑ بھری تھی پاؤں میں سر کے بڑھے تھے بال
آتے ہی دونوں پاؤں جو قالین پر ملے — تو فرش کو بنا دیا یکسر خراب حال
رگڑا کیا جو پاؤں اسیطرح دیر تک — تو حاضرین بزم نے اُس سے کیا سوال
کیا کر رہا ہے اے دیو جانس یہ حرکتیں — محفل کا پاس تجھکو نہ تہذیب کا خیال
اس نے دیا جواب کہ تلووں سے پاؤں کے — کرتا ہوں میں غرور فلاطوں کو پائمال
سنکر یہ بات اسکی فلاطوں ہنسا مگر — ہنسنے کے بعد کہنے لگا وہ خجستہ فال
کرتا ہے پائمال یہ بیشک غرور کو — لیکن بڑے غرور سے کرتا ہے پائمال

اک مصور نے کیا پیشہ طبابت کا شروع — خردہ گیری سے زمانہ کی جو عاجز آیا
ایکدن اپنے مطب میں تھا وہ مصروف علاج — دیکھکر اُسکو دیو جانس کلبی نے کہا
آپکی فہم و فراست کے ہوئے ہم قائل — چھوڑ دی آپنے تصویر کشی خوب کیا
کیونکہ تصویر بتاتی ہے مصور کے عیوب — قبر کی خاک چھپاتی ہے طبیبوں کی خطا

عبد الباری آسی

باب الاستفسار

(مولوی شفیع احمد صاحب سکندر آباد)

(۱) عہد اسلام میں سب سے پہلے لائبریری کا قیام کب ہوا اور رفتہ رفتہ کیا ترقی ہوئی۔

(۲) شجر الدُّر کے مختصر حال مطلوب ہیں۔

(۳) لفظ سکینہ (بفتح سین) ہے یا سُکینہ (بضم سین) جناب سکینہ کی شادیوں کی تعداد میں اختلاف ہے آپ کے نزدیک صحیح کیا ہے، ممکن ہو تو مختصراً آپ کی دیگر خصوصیات بھی تحریر فرما دیجئے

(نگار) میں آپ کے استفسار کے انداز سے خوش ہوا کہ جو بات پوچھنا تھی اُس کو مختصراً لکھدیا اور اس طرح گویا آپ نے اپنے اور میرے دونوں کے وقت کی قدر کی۔

ترتیب وار آپ کے استفسارات کا جواب درج کیا جاتا ہے:-

عہد اسلام میں سب سے پہلی لائبریری جس کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے، خالد بن یزید بن معاویہ کے زمانہ میں قایم ہوئی۔ اس خلیفہ نے اپنی ساری عمر علوم یونانی اور خاصکر علم الکیمیا اور علم العقاقیر کے مطالعہ میں صرف کردی تھی۔ اس نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کرایا اور مکتبہ میں محفوظ کردیا۔

جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ابتدائی زمانہ میں وبا پھیلی تو خلیفہ نے حکم دیا کہ کتابیں مکتبہ سے نکال کر لوگوں کو مطالعہ کے لئے دیجائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد کا یہ مکتبہ زیادہ تر پرائیویٹ حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلا پبلک کتب خانہ جو زیادہ وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا وہ دار الحکمۃ تھا جو خلیفہ مامون عباسی کے عہد میں بمقام بغداد قایم ہوا۔ خلیفہ مامون نے کتاب خانے کو وسیع تر بنانے کے لئے نہایت قیمتی قیمتی قلمی نسخے یونانی کتابوں کے بازنطینی سلطنت میں مول لئے اور ان کے ترجمے عربی زبان میں کرائے۔ دار الحکمۃ میں ہر علم و فن کی کتابیں موجود تھیں اور اس وقت تک کہ فتنۂ تاتار نے سنہ ۶۵۶ھ میں اس نایاب ذخیرہ کو منتشر نہ کردیا۔ یہ کتاب خانہ بغداد میں قایم رہا۔

اسی اہمیت کی ایک لائبریری فاطمی خلفائے مصر کے عہد میں بمقام قاہرہ قایم ہوئی تھی سنہ ۴۳۵ھ میں وزیر ابو القاسم علی بن احمد نے ایک مکمل فہرست اس کتاب خانہ کی مرتب کی اور کتابوں کی جلد بندی از سر نو ہوئی۔ ابو خلف القضاعی اور ابن خلف الوراق دو ماہر فن اس کام کے مہتمم مقرر کئے گئے۔

یہ کتب خانہ آخری فاطمی خلیفہ کے عہد تک قاہرہ میں پایا جاتا تھا۔ جب صلاح الدین ایوبی نے مصر پر حملہ کیا تو فاطمی خلافت

کے ساتھ اس کتاب خانہ کو بھی ختم کر دیا۔ اس لائبریری کی بہت سی کتابیں قاضی الفاضل کے ہاتھ لگیں اور یہ ان کو اپنے قایم کردہ مدرسۂ فاضلیہ کے لئے لے گیا۔ مگر یہاں ان کی حفاظت پوری طرح نہ ہو سکی اور القلقشندی کے زمانہ تک نیست و نابود ہو گئیں اس لائبریری میں ۶۵۰۰ کتابیں صرف علوم محققہ کی تھیں (جیسے ریاضیات فلکیات وغیرہ) یہاں ایک تانبہ کا کرہ افلاطون کا بنایا ہوا بھی پایا جاتا تھا۔ اس پر ایک تحریر کندہ تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ خالد بن یزید نے اسے مول لیا تھا۔

تیسری قابل ذکر لائبریری اموی خلفاء قرطبہ کی تھی جو المرابطین کے حملہ کے بعد پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں تباہ ہو گئی۔

چھوٹی چھوٹی لائبریریاں یوں تو بہت سی تھیں، جن میں سے ایک قابل ذکر وہ تھی جسے سلطان مسعود غزنوی نے قایم کیا تھا اور جس کی بہت سی کتابیں بعد کو بخارا چلی گئیں بہت سے ان پرائیویٹ کتب خانوں کا پتہ بھی تاریخ سے پتہ چلتا ہے جو طلبہ و علماء کے مطالعہ کے لئے قایم کی گئی تھیں۔ چنانچہ الصولی کا کتب خانہ اور غرس النعمت الصابی کا جو بغداد میں قایم تھا مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل ابوتمام مولف حماسہ کا بھی ہمدان میں مختلف کتب خانوں سے مستفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نظام الملک طوسی، سلطان ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نے اس طرف خاص توجہ کی اور پبلک کتب خانے قایم کرنے کا ذوق پیدا کیا۔ خود نظام الملک نے جو متعدد مدرسے قایم کئے تھے ان میں اس نے کتب خانے بھی قایم کئے تھے۔

مصر و شام کے ایوبی امراء نے نظام الملک کی تقلید میں مدرسے قایم کئے لیکن کتب خانوں کی طرف اپنی توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد صدیوں تک کتب خانوں کے قیام کا پتہ چلتا ہے جو بصورت وقف مسجدوں اور مدرسوں کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری میں کتب خانوں کے لئے علیحدہ عمارات بنانے کا رواج ہو گیا تھا، چنانچہ بہاؤ الدولہ کے وزیر سابور بن اردشیر نے بغداد میں ایک خاص عمارت اس غرض سے طیار کرائی تھی جس کا نام دار الکتب تھا اور جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ اسی طرح مشہور جغرافی المقدسی نے شیراز میں اپنی لائبریری اس عمارت میں جمع کی جس کو عضد الدولہ نے اسی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت میں ایک بڑا ہال تھا۔ اور تین طرف متعدد کمرے۔ خزائن کتب تھے۔ ہال کے چاروں طرف اور کمروں میں الماریاں تھیں جن میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں، لیکن الماری میں کوئی تقسیم خانوں کی نہ تھی۔ قاہرہ میں فاطمی لائبریری کی الماریوں میں خانے بھی بنے تھے اور ہر خانے کا دروازہ الگ تھا جو مقفل کر دیا جاتا تھا۔

کتابیں فنون وار علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں۔ اور بعض کتابوں کی متعدد نقلیں ہوتی تھیں، چنانچہ فاطمی کتب خانے میں خلیل کی کتاب العین کے بیس نسخے، طبری کے تیس نسخے اور ابن درید کے جمہرہ کے ۱۰۰ نسخے موجود تھے۔

فہرست کی ترتیب بھی فنون کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی۔ اور فاطمی کتب خانوں میں یہ بھی تھا کہ ہر الماری پر اس کی کتابوں کی فہرست آویزاں رہتی تھی۔ ان کے انتظام کی صورت یہ تھی کہ ایک مہتمم ہوتا تھا جسے صاحب کہتے تھے اور ایک یا ایک سے زیادہ لائبریرین ہوتے تھے جن کا نام خازن تھا۔ متعدد محرر یا نقل کرنے والے بھی ہوتے جو ناسخ کہلاتے تھے۔

اسی طرح خدام جن کا نام فراش تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نہایت مشہور عالم لائبریرین ہوئے ہیں چنانچہ مشہور مورخ ابن مسکویہ وزیر ابوالفضل کی لائبریری کا اور الشابشتی فاطمی کتب خانہ کا خازن تھا۔

کتابیں مول بھی لی جاتی تھیں اور نقل بھی کرائی جاتی تھیں۔ مقریزی نے ایک لائبریری کا بجٹ جو خلیفہ الحاکم کے عہد میں قایم ہوئی تھی ۲۵۷ دینار سالانہ لکھا ہے جس میں سب سے بڑا صرف (۹۰ دینار) کاغذ کا تھا اور اس کے بعد خازن کی تنخواہ کا جو ۴۸ دینار تھی۔

کتب خانے ہر شخص کے لئے کھلے رہتے تھے اور کوئی معاوضہ کسی سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بعض لائبریریوں میں ان طلبہ و محققین کے مصارف بھی برداشت کئے جاتے تھے جو دیگر ممالک سے تحقیق علم کے شوق میں آتے تھے۔ جو لوگ کتابیں لائبریری سے باہر لیجاتے تھے، انھیں کچھ رقم جمع کرنی پڑتی تھی۔

بعض مصنفین اپنی کتابیں بطور وقف دیتے تھے، چنانچہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تالیف کتاب العبر فاس کی لائبریری کو اسی طرح دی تھی۔ یہ کتاب صرف معتبر آدمیوں کو معقول معاوضہ پر دو ماہ کے لئے دیجاتی تھی۔

بعض لائبریریاں صرف مطالعہ کے لئے تھیں جن کی کوئی کتاب باہر نہ جا سکتی تھی۔ چنانچہ قاہرہ میں مدرسہ محمودیہ کا کتب خانہ جو ۷۹۷ھ میں قایم ہوا تھا اسی قسم کا تھا۔ اس لائبریری کے قایم کرنے والے جمال الدین محمود بن علی نے یہ وصیت کردی تھی کہ کوئی کتاب عمارت سے باہر نہ جانے پائے ابن مسکویہ کے تجارب الامم (جو گب موریل کے سلسلہ میں یورپ نے شائع کی ہے) اسی کتب خانہ کی دولت تھی۔

الغرض تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ کتب خانے کے قیام میں مسلمانوں کی خدمات اہل مغرب سے بہت زیادہ قدیم ہیں اور یورپ کا موجودہ تاریخی خزانہ، مسلمانوں کے انھیں قدیم کتب خانوں کا سرمایہ ہے

(۳) شجر الدّر، مصر کی اُس مشہور ملکہ کا نام ہے جس کا عہد حکومت ہر چند بہت مختصر رہا لیکن سیاسی جدوجہد کے لحاظ سے اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، مصر کی تاریخ اسلام میں صرف یہی ایک خاتون تھی جسنے ملکہ کی حیثیت اختیار کرکے خودمختارانہ حکومت کی۔ شجر الدر ملک صالح ایوبی کی کنیز تھی اور جب اس کے بطن سے صالح ایوبی کا ایک لڑکا خلیل نامی پیدا ہوا تو یہ اُم خلیل کی کنیت سے سلطانہ اسی وقت تسلیم کی گئی۔ لیکن حکمران ہونے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا یہ لڑکا ۲ سال کا ہوکر مرگیا۔ اور پھر اسکے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

جب ۶۴۷ھ میں لوئی نہم شاہ فرانس کے ساتھ جنگ کے دوران میں صالح ایوبی کا بمقام منصورہ انتقال ہوا تو شجر الدر نے اس واقعہ کو چھپایا اور ایوبی کے بیٹے توران شاہ کو عراق سے طلب کیا جب یہ پہونچ گیا اس وقت شجر الدر نے صالح ایوبی کی وفات کا حال لوگوں پر ظاہر کیا۔ چاہئے یہ تھا کہ توران شاہ شجر الدر کا ممنون ہوتا۔ لیکن اس نے بجائے اعتراف احسان کے اس کے ساتھ بُرا سلوک شروع کیا۔ توران شاہ عراق سے مملوکوں کی ایک جماعت ساتھ لایا تھا اس کا طرز عمل بھی مصریا

مملوکوں کے ساتھ اچھا ثابت نہ ہوا اور یہ خود بھی اس وقت کی سیاسیات مصر کو سلجھانے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے شجر الدر سے اپنے باپ کی تمام دولت کا مطالبہ کیا۔ شجر الدر نے کہا کہ تمام روپیہ جو جمع تھا وہ فرانس کے خلاف جنگ کرنے میں صرف ہوگیا، اور خاموش ہو رہی لیکن جب اس کا حال وہاں کے امراء اور سرداران فوج کو معلوم ہوا تو عام برہمی پھیل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ توران شاہ ۶۴۸ھ میں قتل ہوا اور شجر الدر کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دیدی گئی اور سکوں پر اس کا نام اس طرح منقوش کیا گیا۔

المعتصمۃ، الصالحۃ، اُم خلیل

عصمت الدنیا والدین، ملکۃ المسلمین

اُس نے امیر ایبک کو جو اس کا بڑا معتمد علیہ سردار تھا اتابک (سر عسکر) بنایا۔ چونکہ شام کے امراء، اس انتخاب پر راضی نہ تھے اور انھوں نے دمشق میں ملک الناصر یوسف ثانی کو بادشاہ منتخب کر لیا تھا اس لئے خلیفہ نے مصری امراء کو بھی مجبور کیا کہ وہ مرد حکمران تجویز کریں چنانچہ اتابک عزالدین بادشاہ منتخب کیا گیا اور شجر الدر کا نکاح اس کے ساتھ ہو گیا۔ اس لئے شجر الدر کی تنہا حکومت صرف ۸۰ دن رہی۔

چونکہ یہ زمانہ وہ تھا جب باغی مملوکوں یا فرمانروائے حلب نے جنگ کا محاذ قائم کر رکھا تھا اور ایبک کو الصالحیہ میں حدود شام کے قریب ہی رہنا پڑتا تھا اس لئے تمام نظام حکومت شجر الدر ہی کے سپرد تھا اور وہی تمام فرمانروایانہ خدمات کو تنہا انجام دیتی تھی۔ چونکہ یہ قوت و حکومت کی بہت شائق تھی اس لئے اس نے اپنے شوہر ایبک کو روکا کہ وہ اپنی پہلی بیوی اور لڑکے سے نہ ملے اور جب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ وہ زنگی خاندان میں کسی عراقی شاہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس نے سلطان حلب سے شادی کی درخواست کر دی۔

اب حالت یہ تھی کہ ایبک، شجر الدر کو اور یہ ایبک کو اپنی راہ سے دور کرنا چاہتے تھے اور ہر ایک اسی فکر میں مبتلا تھا۔ شجر الدر نے سخت فریب سے کام لیکر ایبک کو اپنی طرف سے مطمئن کر دیا اور جب وہ قاہرہ اس کے پاس آیا تو اپنے دو مملوکوں کے ذریعے سے اس کو حمام کے اندر غسل کرتے وقت قتل کرا دیا۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اور مملوک سردار اپنی قسمت اس کے ساتھ وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور لوگ اس کی اس بیرحمی سے پہلے ہی برہم ہو چکے تھے، اس لئے ایبک کی پہلی بیوی نے اس کو اپنے غلاموں سے گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔ اس کا ایک مختصر سا مقبرہ مصر میں اب بھی موجود ہے

(۳) لفظ تو سُکینہ (بضم سین) ہی ہے لیکن بعض لوگ سَکینہ (بفتح سین) بھی کہتے ہیں۔ یہ حقیقتاً آپ کا شاعرانہ نام تھا جو آپ کی شاعرماں رباب بنت امرء القیس نے رکھا تھا۔ آپ کا اصلی نام (بروایت ابن الکلبی) اُمیمہ یا اُمینہ تھا اور بروایت اغانی آمنہ یا اُمینہ۔

آپ کی تاریخ ولادت صحیح طور سے متعین نہیں ہو سکتی لیکن یہ یقینی ہے کہ آپ واقعۂ کربلا کے وقت بہت کمسن تھیں اور اگر

ابن اثیر کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ آپ کربلا کے زندانیوں میں بھی شامل تھیں، آپ کی شادیوں کی تعداد کے متعلق واقعی بہت اختلاف ہے۔ ابن قتیبہ نے تین فہرستیں دی ہیں۔ اغانی نے چھ فہرستیں درج کی ہیں جو باہمدگر مختلف ہیں اس لئے ایسی صورت میں اُسی اولیں فہرست کو صحیح سمجھنا چاہئے جس پر ابن قتیبہ اور ابن سعد تقریباً متفق ہیں اور جسے ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ فہرست اس طرح ہے :-

پہلے شوہر مصعب بن الزبیر بن العوام تھے (جو ۷۲ھ یا ۷۱ھ میں عبدالملک بن مروان کے خلاف جنگ کے دوران میں مارے گئے) اس اتصال سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جناب سُکینہ نے اپنے ماں کے نام پر رباب رکھا، اس لڑکی کی شادی بعد کو مصعب کے بھائی سے ہوئی لیکن کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے شوہر عبداللہ بن عثمان تھے جو مصعب کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ اس شادی سے ایک صاحبزادے عثمان پیدا ہوئے (ابن سعد نے حکیم اور ربیعہ دو اور بچوں کا بھی نام لکھا ہے) یہ شادی عدم توافق مزاج کی وجہ سے مسرور ثابت نہ ہوئی۔ تیسرے شوہر کا نام ابن سعد نے زید بن عمر بن عثمان بن عفان بتایا ہے۔ لیکن یہ شادی اور زیادہ ناکام رہی اور طلاق ہوگئی، طلاق کے بعد الاصبغ بن عبدالعزیز بن مروان (جو عمر بن عبدالعزیز کے بھائی تھے) کے ساتھ شادی کی لیکن خلوت صحیحہ نہ ہوسکی اس کے بعد ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف سے شادی ہوئی اور تین ماہ تک ساتھ رہا، لیکن کہا جاتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے حکم سے طلاق دلوا دی گئی۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ابن حجر اور ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق ابراہیم کا انتقال ۹۶ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۵، سال کی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ شادی اس سے قبل ہوئی ہوگی اور ہشام کی خلافت شروع ہوتی ہے ۱۰۵ھ سے ابن قتیبہ نے اُس کے بعد عمر بن حاکم بن حزام سے شادی ہونا بیان کیا ہے لیکن بغیر کسی سند کے جناب سُکینہ بہت خوش ذوق اور سلیقہ مند خاتون تھیں، خودداری، رکھ رکھاؤ اور بلند نظری آپ کی خصوصیاتِ فطرت تھیں اور اسی کے ساتھ آپ بے انتہا خوش طبع بھی تھیں اور شعر و موسیقی کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ اغانی میں متعدد واقعات درج ہیں جن سے آپ کے اس مخصوص ذوق کا پتہ چلتا ہے حسب بیان آغانی آپ کو اپنے حسن و جمال اور شرافت نسبی پر بھی بڑا ناز تھا۔ آپ کے بال بہت حسین تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ آپ جوڑا نہایت خوشنما باندھتی تھیں جس کی ممانعت بعد کو عمر بن عبدالعزیز نے کر دی تھی۔

آپ کی ساری عمر حرمین ہی میں بسر ہوئی اور ۱۱۷ھ میں آپ نے انتقال کیا۔

اقتباسات علمیہ

طیران و بجلی

فن طیران کے منجلہ دیگر مشکلات کے ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ حالت پرواز میں اُس کہربائی قوت سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں جو فضا میں خود ہوائی جہاز سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی ہوائی جہاز دو ایسے بادلوں کے درمیان سے گزرتا ہے جن میں پہلے سے کافی کہربائیت موجود ہوتی ہے تو اکثر و بیشتر جہاز کی رفتار اس کہربائیت میں تحریک پیدا کر کے شعلۂ برق پیدا کر دیتی ہے اسی طرح اگر وہ کسی حامل کہربا بادل کے نیچے سے گزرتا ہے تو بھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے جس سے جہاز و جہاز راں دونوں کی تباہی یقینی ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت تک اس خطرے کے دفاع کی کوئی تدبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ یورپ کا جانباز انسان باوجود اس خطرہ کے علم کے نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ فضا اور اس کی بجلی کو چیرتا پھاڑتا نکل جاتا ہے اور اس خطرہ کا امکان اسکی ہمت کو اور زیادہ قوی بنا دیتا ہے۔ یہ ہیں اس قوم کے کارنامے جسکے اندر سوائے معائب کے یہاں کے منحرف نگاہ والوں کو اور کچھ نظر نہیں آتا اور جس کے مقابلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا مسلمان صلح استقامت فی الارض کے لئے سب سے بڑا ثبوت جو پیش کرتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ اُس کو صرف گالیاں دینے اور دوسروں کو بُرا کہنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔

مقلوب گفتگو

آپ نے حرف مقلوب، ظرف مقلوب اور کتابت میں صنعت مقلوب کا ذکر سنا ہوگا، لیکن مقلوب گفتگو کی طرف آپ کا خیال منتقل نہ ہوا ہوگا۔ مغرب میں جہاں ہر طرح کی اہم گفتگو کے لئے ٹیلیفون کا استعمال برابر ہوتا رہتا ہے، وہاں ایک بڑی زحمت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی راز کی بات کرنا ہو تو اس کا علم ٹیلیفون کے تعلق سے اور دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس دشواری کو دور کرنے کے لئے ایک خاص آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے جو ٹیلیفون کو مقلوب کر کے پہونچایا کرے گا اور اس طرح دوسرے لوگوں کو یہ ساری آواز اک مہمل و بے معنی چیز نظر آئے گی، لیکن جس شخص سے گفتگو کی جائے گی اس کے پاس دوسرا آلہ ہوگا جو اس مقلوب گفتگو کو پھر اصلی حالت میں منقلب کر کے پیش کریگا۔ گویا اس طرح خطاب کرنے والے اور خطاب کئے جانے والے دونوں معمولی طور سے گفتگو کریں گے اور سنیں گے لیکن درمیان کے لوگ اس کو بالکل نہ سمجھ سکیں گے۔

ابوت کی علمی تحقیق

ولایت میں بسا اوقات دیوانی مقدمات کے سلسلہ میں تحقیق ولدیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ ثابت کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے باپ ہی کا بیٹا ہے یا نہیں۔ جرمنی کے ڈاکٹروں نے اس کی تحقیق کے لئے ایک نیا علمی طریقہ ایجاد کیا ہے جو خون کے جانچ سے متعلق ہے۔ تفتیش و جستجو سے معلوم ہوا ہے کہ باپ کے

خون کا قوام بیٹے کے خون کے ذرات پر ایک خاص قسم کا اثر پیدا کرتا ہے اور اس کو دیکھکر معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کا باپ نہیں ہے ہر چند یہ پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں، فلاں کا باپ ضرور ہے۔

۱۹۲۷ء میں جرمنی کے اندر ۲۰۰۰ لڑکوں پر اس عمل کا تجربہ کیا گیا، اور صرف ایک لڑکا ایسا ملا جسکے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جاسکا کہ فلاں اس کا باپ نہیں ہے۔

پروشیا کی ایک عدالت العالیہ نے اس امتحان پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا تو برلن کی طبی سوسائٹی نے سخت احتجاج کیا اور عدالت کے فیصلہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ جرمنی اور اسٹریا کی بہت سی ماتحت عدالتوں نے اس طریق کو صحیح تسلیم کر کے قانونی ثبوت میں شامل کرنا شروع کر دیا ہے اور غالباً وہ زمانہ دور نہیں جب ساری دنیا کی عدالتیں اس ایجاد سے فایدہ اٹھانے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

لاسلکی سے نشان انگشت

آدمی کے شناخت کے لئے انگلی کا نشان پاؤں کا نشان، ناک کا نشان خاص چیز ہے اور مجرموں کی شناخت و گرفتاری میں ان نشانات سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ اب لاسلکی نے اس کو بھی اپنے حیز عمل میں لے لیا ہے اور لندن کی پولیس نے ایک نیا طریقہ ایسا ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے ایک شخص کا نشان انگشت لاسلکی کے ذریعہ سے دنیا کے ہر گوشہ میں فوراً پہونچایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں ایک مشتبہ شخص گرفتار ہوا اور خیال پیدا ہوا کہ غالباً امریکہ میں یہ شخص مطلوب ہے۔ چنانچہ اس کا نشان انگشت فوراً امریکہ بھیجا گیا اور وہاں سے اسیوقت جواب آگیا کہ فلاں جرم میں اس شخص کی گرفتاری مطلوب ہے

مافوق البنفسجی شعاع کی کھڑکیاں

چونکہ اب یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ آفتاب کی ہفت رنگ شعاعوں میں سے وہ شعاع جو مافوق البنفسجی (ultra-violet) کہلاتی ہے (یعنی جو بنفشی رنگ کی شعاع کے بعد کی ہے) صحت کے لئے بہت مفید ہے اس لئے یوروپ میں اب ایسی کھڑکیوں کا رواج ہو چلا ہے، جنسے یہ مفید شعاع از خود بغیر کسی آلہ کے گھر میں پہونچتی رہتی ہے۔

اس کی تدبیر نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ کھڑکی کا ڈھانچہ کسی ہلکی لکڑی کا طیار کیا جائے اور معمولی تار کا جال اسمیں کس دیا جائے (جیسے ٹینس کھیلنے کے بیٹ میں تانت کا جال کسا ہوا ہوتا ہے) اس جال پر (Cellophane) بچھا دی جائے اور کھڑکی کا دوسرا ڈھانچہ جو بالکل پہلے ڈھانچہ کی طرح تاروں سے کسا ہوا ہوگا اسپر رکھ کر پیچ سے مضبوط کر دیا جائے

چونکہ یہ ترکیب بہت سہل ہے اور دوا بھی نہایت ارزان ملتی ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان کے مکانات میں بھی خوابگاہ اور نشست گاہ کے کمروں میں اس قسم کی کھڑکیاں استعمال کی جائیں تو یہاں کی قدامت پرستی کو زیادہ صدمہ پہونچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

استعمالی ملبوس اور صحت

ایک ہی کپڑے کو عرصہ تک بغیر دھوئے ہوئے پہننے سے صحت کو جس قدر نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اس کا اندازہ ایک ڈاکٹر کے بیان سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ صرف ایک دن کے استعمال سے جراثیم کا اوسط فی مربع انچ ۴ لاکھ تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اگر قمیص چھ دن تک بغیر دھوئے ہوئے پہن لیجائے تو جراثیم کی تعداد فی مربع انچ ایک کروڑ تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن اگر اسی کو صابون سے دھو لیا جائے تو تعداد گھٹ کر ایک ہزار رہ جاتی ہے قمیص یا کسی اور ملبوس کے نیچے بنیان کا استعمال اسی لئے اب یورپ سے مفقود ہو گیا ہے کہ جسم سے ملے رہنے کیوجہ سے اس میں جراثیم بہت پیدا ہو جاتے ہیں

استعمالی کپڑے کو روز صابون سے دھو کر دھوپ میں خشک کر لینا صحت انسانی کے لئے بہت مفید ہے۔

ایک نیا ہوائی جہاز

فرانس کے کسی نوجوان انجنیر نے ایک نئی قسم کا ہوائی جہاز طیار کیا ہے جسمیں نہ بازو ہیں نہ محرک (Propeller) اس میں کچھ ایسے پنکھے اس نے لگائے ہیں کہ ان کی حرکت سے ایک قوی تموج ہوا میں پیدا ہوتا ہے اور جہاز دفعتہً سطح زمین سے بلند ہو جاتا ہے۔ موجد نے اس جہاز کا ایک نمونہ پیش کر کے اس کو اڑایا تو ہلکی سی بھنبھناہٹ اس سے پیدا ہوئی۔ موجد کا خیال ہے کہ یہ جہاز فی گھنٹہ ۷۰۰ میل سے ۱۰۰۰ میل تک پرواز کر سکتا ہے۔

قدرت سے انسانی جنگ

ڈیلی میل کا نامہ نگار جنیوا لکھتا ہے کہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر ایک خطرناک طوفان گرج اور بجلی کا نمودار ہونے پر ایک نئی قسم کے نہایت قوی پھٹنے والے بان دو گھنٹہ تک استعمال کئے گئے تاکہ بادل نہ بننے پاویں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طوفان نکل گیا اور زراعت کو کوئی نقصان نہ ہوا لیکن قریب کے دوسرے ضلع میں جہاں یہ بان یا ہوائیاں استعمال نہیں کی گئی تھیں وہاں کاشت کو بہت نقصان پہونچا۔

سنیما اور لاسلکی

ریڈیو کے مظاہر ترقی میں سب سے زیادہ دلچسپ منظر تصاویر متحرک کا منتقل کرنا ہے، یعنی جس طرح آواز معمولی تصویر، نشان انگشت وغیرہ ریڈیو کے ذریعہ سے دور دراز مقامات تک منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ اسیطرح اب سنیما کی تصاویر متحرکہ کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ جس سرعت کے ساتھ فلم کی تصاویر سامنے آتی ہیں، اس تیزی کے ساتھ ان کو ایڈیو کا آلہ فضا کی قدرتی کہربائیت سے کام لیکر دوسری جگہ پہونچا دیتا ہے، اس ایجاد نے گویا اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ ہر وہ شخص جسکے پاس ریڈیو کا آلہ ہو اپنے گھر میں نہایت آسانی سے سنیما دیکھ سکتا ہے۔ الغرض ریڈیو کی ترقیاں برابر جاری ہیں اور اس کی قبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں یہ عام نہ ہو رہا ہو اس وقت سویڈن میں سب سے زیادہ اس کا استعمال ہو رہا ہے۔ یعنی وہاں ہر فی ہزار آدمی تقریباً ۵۴ سٹ ریڈیو کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُسکے بعد انگلستان، آسٹریا اور جرمنی کا نمبر ہے۔ بلجیم میں اندھوں کے لئے ریڈیو کے رسایل بھی شایع ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ بغیر دیکھے ہوئے اپنا سٹ ریڈیو کا درست کر کے کام لے سکتے ہیں۔

مطبوعات موصولہ

طبقات الامم

یہ کتاب ترجمہ ہے قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی کی مشہور تصنیف طبقات الامم کا جسے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے کیا ہے اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوا ہے

ابوالقاسم صاعد، پانچویں صدی ہجری میں اندلس کا مشہور فاضل شخص تھا جو تمام نقلی و عقلی علوم پر کامل عبور رکھتا تھا طبقات الامم اسی کی مشہور تصنیف ہے جس میں اس نے قرون وسطے کی علمی تاریخ سے بحث کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مختصر تصنیف میں بہت کچھ قابل قدر معلومات اس نے فراہم کر دئے ہیں۔

ترجمہ نہایت صاف و شگفتہ ہے اور جناب اختر جوناگڈھی کے ذوق علم کا پورا ثبوت کتابت طباعت بہت صاف و روشن ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قسطنطنیہ میں ترکوں کی واپسی

امریکہ کے مشہور مصنف الکزنڈر پاول نے ایک کتاب ( ) لکھی ہے اس میں ایک باب اس موضوع پر بھی ہے کہ "ترک کیونکر واپس آئے" جناب محمد نجم الغنی قریشی نے اسی ایک باب کا ترجمہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے اور کتابت و طباعت بھی پاکیزہ ہے مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے ۶ر میں مل سکتی ہے۔

اولی الالباب سے خطاب

یہ ایک رسالہ ہے جسے جناب سید سعید الدین صاحب ام اے ال ال بی سب جج الہ آباد نے مذہبیات کی موجودہ سقیم حالت سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا موجودہ ترتیب قرآنی فہم و تلاوت کے لئے موزوں ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو اس میں کیا تبدیلی ہونی چاہئے اسی کے ساتھ اس مسئلہ سے بھی بحث کی ہے کہ اصل مقصود تلاوت قرآن سے الفاظ کی تکرار ہے یا اس کے معانی پر غور کرنا۔

یہ رسالہ اس مذہبی جذبۂ انقلاب کے ماتحت لکھا گیا ہے جو اس وقت ساری دنیا میں کم و بیش نظر آرہا ہے اور جس کا روکنا نہ اب علما قدیم کے اختیار میں ہے نہ کسی حکومت کے اقتدار میں۔ جس طرح ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زمانہ کے لحاظ سے مذہب کے فروغ میں تبدیلی ہونی ضروری ہے۔ اگر اس سے قبل قرآن پاک کا بغیر سوچے سمجھے پڑھ لینا کافی تھا تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ یہی حالت رہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ اسی طرح اگر سورتوں کی موجودہ ترتیب سے بہتر کوئی ترتیب تعلیم و تفہیم کے لئے موزوں ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے اختیار نہ کیا جائے قرآن کی موجودہ ترتیب بھی وہ نہیں ہے جس ترتیب سے قرآن پاک نازل ہوا تھا۔ اس لئے جب ایک مرتبہ اس کی ترتیب "نہج نزول" کے خلاف ہو چکی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوبارہ اس میں تبدیلی کفر و الحاد سمجھی جائے

یقیناً کلام مجید معہ اپنے الفاظ کے الہام ربانی ہے یعنی اس کا مفہوم اور الفاظ سب منزل من اللہ ہے۔ لیکن اس کے نزول کا جو مقصود ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا اگر اس کو بے سمجھے پڑھا جائے۔ پھر اس کے سمجھنے کے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو پڑھنے والا خود عربی زبان کا ماہر ہو یا ترجموں سے مدد لے۔ چونکہ اول صورت بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے لامحالہ دوسری صورت پر عمل کرنا ہوگا قابل مصنف نے انھیں دو مسئلوں سے اس رسالہ میں بحث کی ہے اور پورے خلوص کے ساتھ۔ یہ رسالہ غالباً بلاقیمت رفاہ سوسائٹی دریاباد الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

سیرۃ النبی جلد ثالث پر تنقیدی نظر

یہ رسالہ تقریباً پانچ جزو کا جسے ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے سیرت النبی کی جلد ثالث کو دیکھ کر تحریر فرمایا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف جیسا کہ احمدی جماعت کے تمام افراد کی خصوصیت ہے مذہبی تحقیق و مناظرہ کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں

سیرت النبی کی تیسری جلد میں سب سے زیادہ اہم دو مسئلے ہیں معجزہ اور معراج اور اگر کوئی شخص انھیں کی بابت کوئی ایسی تحقیق چھوڑ جائے جو اسلام کے فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے شایان ہے تو میں کہونگا کہ اس نے بڑا کام کیا، لیکن چونکہ طبائع انسانی مختلف ہیں، دماغی راہیں علحدہ علحدہ ہوتی ہیں اور ایک ہی امر ایک کے نزدیک ناقابل یقین اور دوسرے کے نزدیک بالکل ممکن الوقوع ہوتا ہے اس لئے یہ تو ناممکن ہے کہ کسی مختلف فیہ مسئلہ کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اگر کسی مصنف یا نقاد نے کسی مسئلہ کو کسی ایک ہی جماعت کے مقررہ اصول کے لحاظ سے ثابت کر دیا، تو بھی یہ بات معمولی نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے سیرۃ النبی پر تنقید کرتے ہوئے اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ ان کا رسالہ دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی "احمدیت" کو ضرورت سے زیادہ نمایاں کیا ہے اور اس لئے رسالہ نے بجائے بے لاگ تنقید کے "احمدی تبلیغ" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی کے ساتھ کہیں کہیں اپنی طبعی ظرافت سے کام لیکر وہ سنجیدگی کے حدود سے متجاوز ہو گئے ہیں۔ صرف یہ ہے ناقص پہلو اس کتاب کا جس کو نظر انداز کر دینے کے بعد ہم بہت سی تنقیدی خصوصیات بھی اس میں پاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعض اعتراضات اس قدر اہم ہیں کہ مشکل سے انکا جواب دیا جا سکتا ہے

یقیناً نہ صرف سیرت النبی جلد ثالث بلکہ اس وقت تک جتنی جلدیں اس کی شائع ہو چکی ہیں ان سب میں یہ نقص موجود ہے کہ جہاں "منقول و معقول" کا تصادم ہو جاتا ہے وہاں اس قدر غیر ذمہ دارانہ زبان اور ایسا ہلکا اسلوب بیان اختیار کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا کہ قایل کا اصل مقصود کیا ہے۔ خود مولانا شبلی نے جلد اول میں ان روایات کو جن میں ولادت نبوی کے وقت قیصر کسریٰ کے کنگرہ ہلجانے اور حرم میں بتوں کے منہ کے بل گرجانے کا ذکر ہے ادب و انشا کے طوفان میں گم کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ اُن کی رائے انکی صحت و عدم صحت کے متعلق کیا ہے

ہمارے یہاں کے علماء کی یہ کمزوری بہت قدیم ہے، چنانچہ متقدمین میں رازی اور غزالی اور متاخرین میں مولانا شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں جابجا یہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ رازی کی استدلالات عقلی مشہور ہیں، غزالی کی اجتہادات مذہبی کسی سے مخفی نہیں

اسیطرح شاہ ولی اللہ کی روشن خیالیاں بھی سب کو معلوم ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرتے ہوئے پس وپیش کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ ان کا شمار طبقۂ علماء اشعریہ یا مقلدین سے علحدہ نہ ہوجائے۔ مولانا شبلی بے انتہا روشن خیال انسان تھے اور اسیطرح میں مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی سمجھتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جوان کے دل میں ہے وہ خوف سے زبان تک نہیں آتا۔ اور ایسے مسائل میں انداز بیان ایسا اختیار کرتے ہیں، جو انھیں طبقۂ علماء سے بھی نہ نکالے اور معقولات پسند جماعت سے بھی داد حاصل کرلے۔ میں اس کو زیادہ سے زیادہ ادب و انشار کا معجزہ کہہ سکتا ہوں لیکن خدمت مذہب کے نام سے تعبیر نہیں کرسکتا، جس میں حد درجہ اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے

علاوہ اس کے یوں بھی اس زمانہ میں جبکہ مولویوں کا گروہ کافی بدنام ہوچکا ہے، اس میں شامل رہنے کی کوشش کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اگر ایک شخص علم و فضیلت کا حامل ہے تو خواہ وہ کسی لباس و وضع میں ہو قابل احترام ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک ہونے سے عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے سیرت نبوی جلد ثالث کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے نہایت گہری نگاہ سے کیا ہے اور ان غلطیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو ہر چند نہایت معمولی ہیں لیکن ان کا باقی رہجانا دار المصنفین کی روایات کے لئے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں ان اعتراضات کی تفصیل یہاں نہیں دے سکتا جو اس رسالہ میں پیش کئے گئے ہیں، جو صاحب دیکھنا چاہیں اس کو خود ملاحظہ فرمائیں۔ لیکن عمومی طور پر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اعتراضات ایسے نہیں ہیں جن پر سیرۃ نبوی کے دوسری اڈیشن میں توجہ نہ کیا جائے

معراج کے واقعات کو ڈاکٹر صاحب نے عالم خواب سے متعلق کیا ہے، یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں کیونکہ بعض اکابر صحابہ نے بھی معراج کو روحانی یا فی الرویا تسلیم کیا ہے، لیکن ان واقعات کی تعبیر علم الرؤیا کے لحاظ سے ذرا گری ہوئی بات ہے۔ کیونکہ یہ علم ہنوز وہ سنجیدگی اختیار نہیں کرسکا ہے جس کا ذکر کسی مہتم بالشان گفتگو کے سلسلہ میں کیا جاسکے۔

یہ رسالہ ۸ر میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے بجنور اسپتال کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

فخر کائنات | رسول اللہ کے مختصر حالات ہیں جنھیں جناب مولوی مسعود الرحمٰن خاں صاحب ندوی نے عورتوں اور بچوں کے مطالعہ کے لئے مرتب کرکے اس نام سے شائع کیا ہے۔ صاحب موصوف نے یہ تو اچھا کیا کہ اس میں معجزات وغیرہ کا ذکر نہیں کیا لیکن اسی کے ساتھ افسوس یہ ہے کہ تعلیمات نبوی کے لئے صرف ایک صفحہ کافی سمجھا گیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ ضروری اور مہتم بالشان امر جس کی طرف توجہ کرنا چاہئے تعلیمات رسول ہی ہیں جن سے آپ کا اسوہ سمجھ میں آئے اور لوگوں کو صحیح اخلاق وانسانیت کا علم حاصل ہوسکے

یہ رسالہ تین جزو کا صاف لکھا چھپا ہوا رسالہ ہے اور چار آنے میں اسلامیہ دار الاشاعت دہلی سے مل سکتا ہے۔

اسلامی مساوات | جناب محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی نے اس رسالہ میں تاریخ اسلامی اور خصوصاً عہد سعادت کے

تاریخ سے متعدد واقعات درج کرکے بتایا ہے کہ اسلام نے مساوات کا درس کتنا زبردست دیا اور اسپر کس قدر اہتمام کے ساتھ عمل کیا، موضوع کی اہمیت و وسعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ غنیمت ہے اور قابل مطالعہ، کتابت طباعت بہت اچھی ہے اور مسلم بک ڈپو پھلواری شریف سے ۸ ؍ میں مل سکتی ہے۔

وکلاء مرافعہ | یہ فارسی کا ڈرامہ ہے جسے مرزا جعفر خواجہ داغی نے مرزا فتح علی خواجہ داغی کے ترکی ڈراما سے انیسویں صدی کے آخر میں ترجمہ کیا تھا۔ اب اس کو علٰحدہ رسالہ کی صورت میں محمد مسلم صاحب ایم اے پروفیسر سنٹ کولمباز کالج ہزاری باغ نے معہ ایک مختصر مقدمہ کے شائع کیا ہے۔

بہت عرصہ ہوا جب جبرس نے اس ڈرامہ کا ترجمہ معہ دو اور ڈراموں کے انگریزی میں شائع کیا تھا اور اسی کے ساتھ اصل ڈرامہ بھی نقل کردیا تھا اور تمام مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی تھی۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ ہرچند راجرس نے ترجمہ میں کہیں کہیں غلطیاں کی ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا یہ کارنامہ ضرور قابل داد ہے۔

ان ڈراموں کی فارسی زبان نہایت شیرین اور لطیف ہے اور جن کو فارسی زبان کے مطالعہ کا شوق ہے انھیں ضرور اس کو پڑھنا چاہئے۔ یہ ڈراما پروفیسر صاحب موصوف سے ۱۲؍ میں مل سکتا ہے۔

محبت | روسی حکیم ٹالسٹائی کے ایک نہایت ہی دلچسپ فسانہ کا اردو ترجمہ ہے جسے مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے کیا ہے ٹالسٹائی کے فسانوں کے متعلق لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ اول تو روسی فسانہ نگاری یونہی بے مثل ہے، چہ جائکہ ٹالسٹائی کی فسانہ نگاری۔

ترجمہ نہایت پاکیزہ کیا گیا ہے پانچ آنے قیمت مقرر ہے اور ہند بک ایجنسی کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

بلتازار | اناتول فرانس کے ایک مشہور فسانہ کا اردو ترجمہ از مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی۔ اناتول فرانس کے نام سے کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہو اور اس کی فسانہ نگاری کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ ترجمہ کی زبان بہت صاف ہے اسکی قیمت ۳؍ ہے اور ہند بک ایجنسی سے مل سکتا ہے۔

ابن سراج | یعنی ابوعبداللہ آخری شاہ غرناطہ کے پوتے کی داستان عشق و محبت جسے بدرالدین احمد صاحب نے شیتو بریان کی تصنیف سے ترجمہ کیا ہے۔

شیتو بریان، انقلاب فرانس کے عہد کے ایک نہایت ہی مقتدر ہستی تھی جس نے نظام حکومت کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ فسانہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کی قیمت ۸؍ ہے اور ملنے کا پتہ ہند بک ایجنسی کلکتہ۔

جواہر کلیات نظیر | انتخاب ہے کلام نظیر کا جسے حیدرآباد کے تین اصحاب سید مختار احمد صاحب، سید ہاشمی صاحب اور سید غلام مصطفٰے ذہین نے مشترک پسندیدگی کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ اس مجموعہ میں صرف انھیں نظموں کا انتخاب ہے۔ جن میں نظیر نے درس اخلاق دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ابھی تک اس کی ضرورت باقی ہے کہ میر و نظیر

کے منتخب کلام کو ہندوستان کے بچوں کے سامنے پیش کیا جائے اخیر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی ہے کتاب ۸۰ صفحات کی چھوٹی تقطیع پر شائع کی گئی ہے اور بہت صاف ستھرے طریقہ سے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے دستیاب ہوسکتی ہے قیمت درج نہیں ہے

مادرِ ہند مس کیتھرائن میو کی مشہور بدنام درسوا کتاب مدر انڈیا کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جسے جناب خالد نے کیا ہے مدر انڈیا جیسی کتاب ہے اس کے متعلق لکھنا بیکار ہے اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ نہایت اچھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس کا ترجمہ ہونا بھی چاہئے تھا یا نہیں۔ مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

ابن یمین یعنی فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین کے حالات کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر تبصرہ جسے مولوی عبدالسلام ندوی نے مرتب کیا ہے اور صوفی پرنٹنگ کمپنی نے پنڈی بہاؤالدین سے شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۱۸ صفحات کو محیط ہے۔

یہ کتاب ایرانی مصنف رشید یاشمی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے اور چونکہ ابن یمین کے حالات سے اردو داں پبلک بہت کم واقف ہے اس لئے اس کو یقیناً نہایت کار آمد خدمت سمجھا جائیگا۔

روح تنقید حصۂ دوم ابوالحسنات مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ام اے کی ان مقالات تنقیدی کی دوسری جلد ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

جناب زور حیدرآباد کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن سے خدمت زبان کے بہت توقعات وابستہ ہیں اور جنھوں نے بہت تھوڑے زمانہ اپنی کاوش و محنت سے ملک کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ جناب زور فطرت کی طرف سے نقاد دماغ لیکر آئے ہیں اور نہایت ہی دلنشین طریقہ سے اپنے موضوع کا تجزیہ کر کے فرض تنقید کو ادا کرتے ہیں اس کا پہلا حصہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، اور دوسرے حصہ میں ان کے گیارہ تنقیدی مقالات یکجا کر کے شائع کر دئے گئے ہیں جن کی فہرست یہ ہے:۔

ادبیات اردو۔ ٹامس گرے۔ میر کی مثنویاں۔ میر تقی میر۔ طبقات ناصری۔ غالب کی ذہنیت۔ حالی۔ میر انیس۔ میر حسن ابوعلی بلعمی۔ ہورس اسمتھ۔ کیفی حیدر ابادی۔

یہ مجموعہ ۲۶۸ صفحات کا ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے ہے میں مل سکتا ہے۔

لطیفیات یعنی لودھیانہ کے ایک نوجوان جناب لطیفی بی اے کے منظومات اور مضامین کا مجموعہ جو ۶۰ صفحات پر شائع ہوا ہے اور رفیق عام پریس لاہور سے ۱۲ میں مل سکتا ہے۔

اس رسالہ میں مختصر سا مقدمہ جناب نظیر لودھیانوی کا بھی شامل ہے جس میں انھوں نے جناب لطیفی کے شاعرانہ ذوق کے بہت تعریف کی ہے۔

میں نے بھی اس مجموعہ کو جا بجا دیکھا اور اکثر مقامات پر مجھے جناب لطیفی کی ذہانت اور پاکیزگی خیال کا اعتراف کرنا پڑا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس مجموعہ کی اشاعت میں بہت جلدی کی گئی۔

جناب لطیفی ابھی بالکل نوعمر ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ مشق کے بعد وہ اور کتنی ترقی کریں گے اس لئے ضرورت تھی کہ کم ازکم دس سال تو اور انتظار کیا جاتا اور پھر سن وقوف تک پہونچنے کے بعد جو نظمیں خود ان کی نگاہ میں قابل اشاعت قرار پاتیں انکو شائع کیا جاتا۔ اگر جناب لطیفی کی مشق جاری رہی تو ان کا موجودہ رنگ یقیناً بدل کر رہیگا اور ان کا موجودہ غیر معمولی جوش وخروش ایک معتدل صورت اختیار کریگا۔ میں تو کم ازکم خوش ہوں کیونکہ ممکن ہے "اس شراب کی رسا" ہونے سے پہلے ہی، میں چلدیتا، لیسکن ساقی کا اس قدر فیاض ہوجانا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا

تصویر افکار جناب سید ضیٰ الدین حسن کیفی حیدرآباد کے نہایت مشہور شاعر تھے جن کی غزلوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے کیفی داغ کے شاگرد تھے اور خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے رنگ کو انھوں نے نباہنے کی بہت کوشش کی یہ مجموعہ ۰۰ ، اصفحات پر "بزم ادب" کے سعی سے شائع ہوا ہے، اور کتب خانہ بزم ادب عقب مسجد چوک حیدرآباد سے ۸؍ میں مل سکتا ہے۔

پہاڑی مقامونکی ملکہ شملہ اس نام سے ایک رسالہ ان۔ ڈبلو۔ ریلوے نے شائع کیا ہے جس میں شملہ کی مختصر تاریخ، ریلوے قایم ہونے کی مشکلات اور وہاں کے دلچسپ وفرح بخش مناظر کا حال معہ چند تصاویر کے درج ہے۔ یہ رسالہ محکمۂ ریلوے کا تجارتی پروپگنڈا ہے اور اسی لئے اس قدر اچھے طریقہ سے اُسے پیش کیا ہے کہ ہر شخص کی توجہ مایل کر سکے نہایت نفیس آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے، اور غالباً ایجنٹ کے دفتر سے مفت مل سکتا ہے۔

حقیقۃ التناسخ یہ رسالہ جو ۱۲۸ اصفحات پر مشتمل ہے مولوی محمد عبدالوہاب ابن محمد العلی نائطی مدراسی نے شائع کیا ہے اور تناسخ کی حقیقت واصلیت سے اس میں بحث کی ہے

تناسخ کا مسئلہ نہایت قدیم مسئلہ ہے اور جس طرح مصری کلدانی، یونانی اور مصری لٹریچر سے اس عقیدہ کا قدیم الایام میں وہاں رایج ہونا پایا جاتا ہے، اسیطرح ہندؤں کے مذہبی لٹریچر سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ تناسخ کا عقیدہ صرف ہندؤں کے ہاں پایا جاتا ہے، اور اس سے قبل کہین نہیں پایا جاتا تھا۔ درست نہیں ہے مسلمانوں میں صوفیائے کرام کی تحریروں اور تقریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بڑی حدتک اسی کے قایل تھے۔

مولوی صاحب موصوف نے کلام مجید اور احادیث سے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عذاب وثواب اور دوزخ جنت کی حقیقت سمجھنے کا انحصار بہت کچھ مسئلہ تناسخ کی صحت پر ہے۔

میں نے بھی جولائی کے نگار میں مسئلہ معاد پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کو ظاہر کیا تھا کہ "حشر اجساد تسلیم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ تناسخ کو تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ نظام عالم پر غور کرنے کے بعد ایک انسان مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ خالق ومخلوق کے تعلق باہمی کو سمجھنے کے لئے تناسخ کو تسلیم کرے۔

ہرچند میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جو آیات واحادیث مولوی صاحب موصوف نے تناسخ کے ثبوت میں پیش کی ہیں، وہ

مفید یقین ہیں اور واقعی ان سے وہ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں اور اس لئے میری رائے میں زیادہ مناسب یہ تھا کہ پہلے صرف معقولات کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو سمجھنا چاہئے تھا اور پھر اکابر اسلام کے صرف ان اقوال کو نقل کر دینا چاہئے تھا جن سے اس کی تائید ہوتی۔

مولوی صاحب موصوف نے سلسلۂ گفتگو میں جنت دوزخ عذاب و ثواب حشر و نشر معاد و قیامت وغیرہ پر بھی عالمانہ بحث کی ہے، جو ناگزیر تھی - چونکہ اس زمانہ میں عقلی اصول پر مذہبی جستجو زیادہ پیدا ہو گئی ہے اس لئے اس رسالہ کا وجود میں آنا بالکل برمحل ہے اور ان حضرات کے لئے جو اس نوع کے مباحث سے دلچسپی لیتے ہیں اس میں کافی سامان مطالعہ موجود ہے
قیمت دو روپیہ ہے اور عاشہ مکان آرائش بلدہ باغ مسلم جنگ ملک پیٹھ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے

کلیات حسرت موہانی

اس سے قبل کلام حسرت دس مختلف اقساط میں علیحدہ علیحدہ شائع ہو چکا ہے، لیکن اب ان سب کو یکجا کر کے کلیات کی صورت دیدی گئی ہے حسرت کے رنگ تغزل کے متعلق لکھنا بیکار ہے، کیونکہ ملک کا ہر صاحب ذوق بلا استثنا اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ اس دور میں حسرت سے بہتر غزل گو شاعر کوئی نہیں ہوا۔ ان کا وہ صحیح عاشقانہ انداز گفتگو، وہ بلند جذبات کی ترجمانی، وہ کیفیت محبت میں ڈوبا ہوا طرز ادا اور وہ ہلکی ہلکی پیاری ترکیبیں فارسی کی - یہ سب ملکر ایک ایسا معیاری رنگ تغزل پیش کرتی ہیں کہ اس کی نظیر مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

میری رائے میں ہر اس شخص کو جسے کچھ بھی ذوق سخن ہے اس کلیات کا اپنے پاس رکھنا ضروری ہے - تین روپیہ میں منیجر اردوئے معلی کانپور سے مل سکتا ہے -

متروکات سخن

یہ بھی مولانا حسرت موہانی کا رسالہ ہے جو ان کے پیش نظر معرکۃ الآرا تصنیف نکات سخن کا ایک باب ہے اس میں انھوں نے متروکات قدیم، متروکات معروف، متروکات جائز و ناجائز سے بحث کی ہے اور متعدد مثالوں سے انھیں سمجھایا ہے فن شعر میں یہ رسالہ خاص اہمیت رکھتا ہے - اس کی قیمت ۲ر ہے اور منیجر اردوئے معلی کانپور سے مل سکتا ہے۔

انتخاب سخن

اس رسالہ میں دیوان جرات، دیوان حسرت (استاد جرات) اور جرات کے چند قابل ذکر شاگردوں کے کلام کا انتخاب ہے - مولانا حسرت اس سے قبل بہت سے گمنام اساتذہ کا نایاب کلام کا انتخاب شائع کر چکے ہیں اور اس طرح زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دے چکے ہیں اسی سلسلہ کا یہ رسالہ بھی ہے جو ۸ر میں منیجر اردوئے معلی کانپور سے مل سکتا ہے -

انشائے جدید

جناب محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری نے یہ رسالہ جدید فارسی کی تعلیم کے لئے لکھا ہے اور اس میں مختلف فصول قائم کر کے بتایا ہے کہ ایران میں آج کل کس طرح خط و کتابت کرتے ہیں نیز ان کی عبارت کیسی ہوتی ہے اور عدالتی کاغذات کی زبان کیا ہے - میں نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا اور بہت مفید پایا - یہ کتاب غالباً مسلم یونیورسٹی کے کسی درجہ کے نصاب میں داخل بھی ہو گئی ہے - اس کتاب میں ہندوستان کے فارسی کا بھی نمونہ ہر جگہ دیا گیا ہے جس کی ضرورت نہ تھی اور اس نے عبث طوالت

پیدا کردی ہے۔ کتاب کی قیمت عہ مقرر کی گئی ہے۔ اور جناب مولف سے خسرو باغ روڈ رام پور کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

ارباب نثر اردو | ایک صحیفۂ تنقیدی ہے جسے جناب سید محمد صاحب قادری ام اے حیدر آبادی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تذکرہ ہے اور تنقید کی گئی ہے کہ ان کی تصانیف کا کیا مرتبہ تھا اور وہ کس حد تک امہات کتب اردو کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

اس میں میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، مرزا جان طپش، خلیل علی خان اشک، میر عبداللہ مسکین وغیرہ تقریباً بیس ایسے مصنفین و شعراء کے حالات و تصنیفات پر تنقید کی گئی ہے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے کسی نہ کسی طرح پایا جاتا تھا۔

جناب قادری کے یہ تنقیدی مقالات اردو زبان کی نہایت گران قدر خدمات میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں کیونکہ اس نوع کی تصانیف وہ بنیادی و استعماری خدمات ہیں جن کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس تصنیف کے بعض مقالے نگار میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے

پارسی علوم اور اسلام | جناب محمد مسلم صاحب ام اے پروفیسر سندھ کولمباز کالج ہزاری باغ نے اس رسالہ میں تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ فارسی پر تمدن اسلامی نے کیا کیا احسانات کئے یقیناً یہ ۶۰ صفحات کا رسالہ ایک مضمون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن انھیں چند صفحات میں فاضل مصنف نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ فارسی پر عربی کے احسانات ایسے نہیں ہیں۔ جنھیں فراموش کیا جا سکے۔

کتاب کی قیمت ۱۲ر ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے

محاسن ورزش | پروفیسر شیخ نضل حق صاحب کوئٹہ بلوچستان کے ایک نہایت قوی الاعضا شخص ہیں اور انھوں نے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں اپنے تجربات و حالات کے ساتھ ساتھ ورزش کے منافع سے بحث کی ہے اور طریقِ ورزش بتایا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف کے کارنامے جو کتاب میں درج ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے غیر معمولی قوت کے شاہد ہیں، کتاب میں جابجا تصاویر بھی ہیں۔ اس کی قیمت عہ ہے اور صاحب موصوف سے کوئٹہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔